اردو کا کلاسیکی ادب
پدماوت اردو
(تصنیفِ دو شاعر)
از
میر ضیاء الدین عبرت
و
غلام علی عشرت
مرتبہ
ڈاکٹر گوہر نوشاہی
مجلسِ ترقیِ ادب - لاہور

بعونِ صناعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۱۶۹
اردو کا کلاسیکی ادب
پدماوت اردو
مرتبہ
ڈاکٹر گوہر نوشاہی
ناشر
مجلسِ ترقیِ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

طبع اول : جنوری ۱۹۸۶ع

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ - ریلوے روڈ ، لاہور

سرورق : عظیم پرنٹنگ کارپوریشن ، ٹمپل روڈ ، لاہور

فہرست

مقدمہ :

☆ ☆ ☆

مقدمہ

سوانح : از کلبِ علی خان فائق

تنقیدی جائزہ : از گوہر نوشاہی

سوانح عبرت و عشرت

ریاست رام پور کے رسالہ دار اور علم دوست مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں نے ۱۲۰۳ھ کے لگ بھگ حکیم میر ضیاءالدین عبرت سے فرمائش کی کہ "پدماوت" (تصنیف ملک محمد جائسی) کو اردو نظم میں منتقل کرنا چاہیے ۔ اُس وقت رام پور میں استاد الاساتذہ محمد قائم قائم شاگردِ سودا اور درد موجود تھے ۔ قائم کے تلامذہ میں ذہین اور کہنہ مشق شاگرد بھی تھے ۔ ان اساتذہ کی موجودگی میں عبرت نے "پدماوت" کو اردو کا جامہ پہنانے کی سعی کی ۔ عبرت نے چوتھائی داستان سے کچھ زائد حصہ نظم کیا تھا کہ پیامِ اجل آ گیا اور یہ قصہ ناتمام رہ گیا ۔ عبرت کا انتقال ۱۲۰۶ھ میں ہوا ۔ نجو خاں کی مصاحبت میں اب کوئی ایسا شاعر نہیں تھا جو اس ناتمام مثنوی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ۔ اس طرح یہ ناتمام مسودہ پڑا رہا ۔

۱۲۱۱ھ میں میر غلام علی عشرت (شاگردِ مرزا علی لطف تخلص) کا ورود رام پور میں ہوا اور عثمان خاں اور احمد خاں کی مصاحبت نصیب ہوئی ۔ عشرت نے ان دونوں کو نواب فیض اللہ خاں کا ہمشیر زادہ اور داماد ظاہر کیا ہے ۔ مولوی قدرت اللہ شوق کے یہاں ہر جمعہ کی نماز کے بعد بزمِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی ۔ عشرت بھی اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے ۔ ایک جمعے کو بزمِ مشاعرہ میں شوق نے عشرت سے کہا کہ آپ میری ایک بات مانیں تو کہوں ۔ عشرت نے جواب دیا کہ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ کی فرمائش پوری کرسکوں ، ضرور فرمائیے ۔ شوق نے

مثنوی ''پدماوت'' کی تکمیل و اتمام کی فرمائش کی[1] ۔

مولوی قدرت اللہ شوق کے علاوہ جن احباب نے عشرت کو آمادہ کیا اُن کے نام بہ قولِ عشرت حسبِ ذیل ہیں : (۱) حافظ بڈھن (اصلی نام عبدالحسیب عرف حافظ بدھا) شیفتہ ۔ (۲) حافظ شیخ الاسلام ادھم خلفِ شیفتہ ۔ (۳) شجاعت علی نسیم ۔ (۴) مولوی غلام جیلانی رفعت ۔ (۵) کبیر خاں تسلیم ۔ (۶) ہمت خاں ہمت ۔ (۷) مرزا کرامت علی اکرم ۔ (۸) عنبر شاہ خاں آشفتہ ۔ (۹) سید رفیع الدرجات نزہت (خلف میر ضیاء الدین) ۔

عشرت نے شوق وغیرہ کی التماس کو قبول کرکے ڈیڑھ ماہ کی محنتِ جاں کاہ کے بعد مثنوی مکمل کر لی اور اس کی تاریخ ''تصنیفِ دو شاعر'' کہی ۔ اس تاریخ کو سب نے سراہا ۔ عشرت کی یہ محنت اکارت نہ گئی ۔ بار بار اس کی مثنوی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اربابِ علم سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہی ہے ۔

عبرت

عبرت کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے ۔ علاؤ الدین برباد شدگانِ دہلی کے ہمراہ ہنگامۂ ابدالی (۱۱۷۳ - ۷۴ھ) میں اودھ آ کر مقیم ہوئے ۔ غالباً علاؤ الدین تحصیلِ علمی دہلی میں کر چکے تھے ۔ اس وقت اودھ کے حکمران نواب شجاع الدولہ تھے ۔ ان کا دارالحکومت ''لکھنؤ'' تھا ۔ یہیں ۱۱۷۵ھ کے لگ بھگ علاؤ الدین کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ضیاء الدین رکھا گیا ۔ باپ نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔ علم طب کی تکمیل کرائی ۔ جنگ بکسر کے بعد ۱۷۶۵ع میں شجاع الدولہ نے مصلحتاً

۱- پدماوت اردو ، مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں ۱۲۶۵ھ ، صفحات ۳-۴ ۔

دارالریاست لکھنؤ سے فیض آباد منتقل کر لیا۔ غالباً علاؤ الدین بھی فیض آباد منتقل ہو گئے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو نواب شجاع الدولہ نے انتقال کیا اور آصف الدولہ مسند نشینِ اودھ ہوئے۔ قدرت اللہ شوق نے متوطنِ لکھنؤ ظاہر کیا ہے لیکن ہماری رائے میں جنگِ بکسر کے بعد شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالریاست بنا لیا تھا۔ اس لیے ضیاء الدین نے فیض آباد میں نشوونما پائی ہوگی اور بعد میں ''لکھنؤ'' (جس کو نواب آصف الدولہ نے ۱۱۸۹ھ میں دارالریاست بنایا) آ کر تکمیلِ علومِ درسیہ کی ہوگی۔ امیر مینائی نے ''انتخاب یادگار'' (ص ۔ ۲۲) میں عبرت کا وطنِ آبائی دہلی لکھا ہے لیکن اس بیان کی تائید کسی اور حوالے سے نہیں ہوتی کہ انھوں نے پرورش اسی دارالریاست میں پائی ہے (اس لیے کہ شوق نے 'طبقات الشعرا' میں، جس کی تالیف ۱۱۸۸ھ میں ہو چکی تھی اور بعد میں اضافے کیے ہیں، واضح طور پر لکھا ہے: ''ضیاء الدین عبرت ابن علاؤ الدین تمکین، متوطن بلدۂ لکھنؤ، جوانے است قابل و خوش خلق، یار باش و در علم حکمت دست رس کامل دارد) (طبقات الشعرا، ص ۳۴۸)۔ اس بیان کی تکذیب میر غلام علی عشرت کے بیان سے ہو جاتی ہے۔ وہ پدماوت کے دیباچے میں شوق کے بیان کو ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

''میر ضیاء الدین نام متخلص بہ عبرت متوطن شاہ جہان آباد، خوش باش، قصبۂ رام پور میں ہمارے آشنا تھے۔ (پدماوت اردو، ص ۳، ممتاز المطابع دہلی)۔

ان اقوال کی تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ عبرت کا آبائی وطن دہلی مان لیں اور ہنگامۂ ابدالی میں اودھ آنا اور وہاں سے رام پور نقل مکانی کرنا تسلیم کر لیں۔ پھر بھی امیر مینائی کا یہ بیان

کہ رام پور میں پرورش پائی ، اختلاف پیدا کرتا ہے ۔

وسط ۱۱۸۸ھ سے نواب محبت خاں بھی اپنے والد حافظ رحمت خاں کی شہادت (۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ) کے بعد فیض آباد میں پناہ گزیں تھے ۔ جب آصف الدولہ نے فیض آباد سے آخر ۱۱۸۸ھ میں کوچ کیا تو یہ بھی لشکر کے ہمراہ تھے ۔ میر علاؤ الدین کے روابط نواب محبت خاں محبت تخلص سے ہو گئے تھے ۔ لکھنؤ پہنچ کر ان تعلقات میں استواری پیدا ہو گئی اور نواب محبت خاں کو ریاست اودھ سے وظیفہ ملنے لگا ۔ غالباً میر علاؤ الدین بھی دامن دولت سے وابستہ ہو گئے ۔ ضیاء الدین نے دیکھا کہ شرفا کی محفلوں میں شعرا کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور امرا شعر و سخن کے دلدادہ ہیں اس لیے ماحول کا اثر ان پر پڑا اور وہ بھی شعر کہنے لگے ۔ نواب محبت خاں سے وابستگی کی بنا پر انھوں نے نواب موصوف سے مشورۂ سخن کرنا شروع کیا ۔ نواب محبت خاں محبت پہلے مرزا جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے ۔ بعد میں شیخ قلندر بخش جرأت سے مشورہ لینے لگے ۔ ضیاء الدین کا تخلص عبرت غالباً محبت خاں کا تجویز کردہ ہے ۔ ایک مبتدی کے لیے جرأت سے نواب محبت خاں زیادہ بہتر تھے ۔ نواب کی شاگردی سودمند تھی ۔ لکھنؤ کے قیام کا سلسلہ کب منقطع ہوا ، اس کا پتا نہیں چلتا ۔ ہاں قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نواب فیض اللہ خاں نے جب اکتوبر ۱۷۷۴ع کے معاہدے کے مطابق رام پور کے علاقے پر دخل پایا تو انھوں نے اپنی توجہ دارالریاست کے آباد کرنے پر خصوصاً مبذول رکھی ، اس لیے اہلِ علم جوق در جوق مصطفیٰ آباد عرف رام پور میں بسنے لگے ۔ علاؤ الدین کا کب انتقال ہوا اور وہ کہاں کہاں رہے ، اس کا ذکر کسی دستاویز سے واضح نہیں ہوتا ۔ وہاں ''فصول فیض اللہ خانی'' (تالیف ۱۲۰۲ھ) میں پہلی بار

حکیم ضیاء الدین عبرت کا ذکر ملتا ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۹۰ھ کے کچھ بعد حکیم ضیاء الدین عبرت رام پور آ کر مصطفٰی خاں عرف نجو خاں سپہ سالار کے مصاحبین میں داخل ہو چکے تھے ۔ رام پور اگرچہ نو آباد بستی تھی لیکن مشاہیر علما اور فقرا، حکما اور اربابِ فن کے آ جانے سے اودھ کے بعد یہ بستی اہمیت حاصل کر گئی تھی ۔ حکیم ضیاء الدین عبرت کو مصطفٰی خاں عرف نجو خاں کی مصاحبت میں فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو گئی ۔

حکیم ضیاء الدین عبرت کی شادی غالباً زمانۂ قیامِ رام پور میں ۱۱۹۴ھ کے لگ بھگ ہوئی ۔ ۱۱۹۵ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام رفیع الدرجات رکھا ۔ اس سے عبرت کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے ۔ عبرت کی اور کسی اولاد کا پتا نہیں چلا ۔

قدرت اللہ شوق نے عشرت سے ان کی حذاقت کی تعریف کی ہے ۔ عبرت طبابت کے فن میں دسترس کے علاوہ فنِ شعر میں بھی مہارت رکھتے تھے ۔ ایک مشاعرہ قمری مہینے کی بارھویں تاریخ کو بالالتزام (سوائے ماہ محرم اور ماہ رمضان) ہوا کرتا تھا ۔ اس کی غزلیں عبرت کے اردو دیوان میں ملتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طرحی غزلیں کہتے اور مشاعرے میں شریک ہوتے تھے ۔ اس مشاعرے کے بانی کا پتا نہیں چلا ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مشاعرہ مصطفٰی خاں عرف نجو خاں کے مکان پر منعقد ہوتا ہو ۔ غنبر شاہ خاں آشفتہ تخلص نے قائم سے کسی ایسے ہی مشاعرے کی طرحی غزل پر اصلاح چاہی تھی تو قائم نے جواباً شعر و شاعری سے اپنی بیزاری ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ ہم نے کون سے آسمان کے تارے توڑے جو تم توڑو گے اور کون سے خزانے جوڑے جو تم جوڑو گے ۔ غالباً یہ مشاعرے حکیم صدر الدین وحشت دہلوی کے مکان پر منعقد ہوتے ہوں گے جو رام پور

میں مقیم ہوگئے تھے ۔

عبرت کو صنف غزل کے سوا دوسری اصنافِ سخن میں بھی دخل تھا ۔ ان کے دیوان میں ایک مثنوی افیون کی مذمت میں بھی ملتی ہے ۔ عبرت کی طرحی غزلیں شگفتہ ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم مشقی کے باوجود ان کے کلام میں پختگی ہے ۔

مؤلفِ ''تذکرۂ کاملانِ رام'' نے ایک فارسی کا دیوان بھی ان سے منسوب کیا ہے لیکن یہ ''دیوانِ عبرت'' محمد شاہی دور کے کسی شاعر کا ہے ۔ اس میں صفدر جنگ اور محمد شاہ کی مدح میں رباعیاں ملتی ہیں ۔ فاضل مؤلف سے تسامح ہوا ہے ۔

رضا لائبریری رام پور میں ان کا اردو دیوان (مکتوبہ ۱۲۹۵ھ) موجود ہے اور چوتھائی حصہ مثنوی پدماوت (اردو) کا ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ مصنف کی اور کوئی تالیف نہیں ملتی ۔

۱۲۰۶ھ میں عبرت نے علالت کے بعد جہانِ فانی کو وداع کیا اور رام پور ہی میں مدفن ہوا ۔[1]

رفیع الدرجات لزبہت انتقال کے وقت گیارہ بارہ سال کے تھے ۔ اس وقت تک وہ کتبِ درسیہ کی تکمیل نہ کر سکے تھے ۔ فن طبابت جو ان کا خاندانی تھا ، اس کی تحصیل کا وقت بھی نہ آیا تھا کہ ان کے والد عبرت چل بسے ۔ رفیع الدرجات نے اساتذۂ وقت سے تحصیلِ علم کیا اور فارسی میں خصوصاً نام پیدا کیا ۔

عبرت کے کلام سے پختگی ظاہر ہوتی ہے ۔ لکھنؤ کی ادبی فضا میں ابھی انشا اور مصحفی کے ادبی معرکے برپا نہیں ہوئے تھے اور جرأت اور مصحفی میں بھی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی تھی ۔ رام پور میں قائم

۱۔ فہرستِ کتبِ اردو ، رضا لائبریری رام پور (مخطوطہ) ۔

کی گوشہ گزینی سے شعرائے رام پور کو استفادے کا موقع نہیں ملا ۔ نجو خاں کی مصاحبت میں کوئی ایسا بلند پایہ شاعر نہ تھا جسے جرأت اور حسرت کا مدِ مقابل کہا جا سکے ۔ مولوی قدرت اللہ شوق ، نواب نظام علی خاں سے وابستہ تھے ۔ شوق کا علمی پایہ بہت بلند ہے لیکن شاعری میں وہ خود رو گلاب کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انھیں قائم کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے لیکن شوق نے طبقات الشعرا (تذکرۂ شعرائے اردو) اور تکملۃ الشعرا (تذکرۂ شعرائے فارسی) میں قائم سے تلمذ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے ۔ عبرت نے بھی قائم سے تلمذ اپنی آزادانہ روش کی وجہ سے گوارا نہ کیا ہوگا ، یا خود قائم نے اصلاح دینے سے انکار کر دیا ہوگا ۔ جیسا کہ عنبر شاہ خاں آشفتہ کے بیان سے قائم کی شاعری سے عام بیزاری کا پتا چلتا ہے ۔

عبرت کے دیوان میں ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۰۴ھ کے مشاعروں کی غزلیں موجود ہیں ۔ اس سے عبرت کا محافلِ مشاعرہ میں شرکت کا ذوق ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ مشاعرے غالباً حکیم صدر الدین خاں وحشت دہلوی کے یہاں منعقد ہوتے تھے ۔

عشرت

عشرت تخلص، نام غلام علی ، بریلی کے رہنے والے تھے ۔ ۱۲۱۱ھ سے قبل ان کا تعلق رام پور سے پیدا ہوا اور باقی عمر یہیں گزار دی ۔ ان کا ذکر سب سے پہلے قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے طبقات الشعرا میں کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"عشرت ۔ غلام علی ، متوطن شہر بریلی ، سعادت مند جوان ہے ، قابل ہے اور طبیعت رسا اور فکر درست رکھتا

ہے ۔ یہ چند شعر اسی کی زبان سے میں نے سنے ہیں ۔"

(ترجمہ طبقات الشعرا ، از شوق ، ص ۲۶۱)

مصحفی نے اس طرح تعارف کرایا ہے :

"میر غلام علی عشرت تخلص ، صوبۂ بریلی (شہر بریلی) کا رہنے والا ، پر گو جوان ہے ، متعدد مثنویوں اور دواوین کا مالک ہے ۔ اس کی عمر قریباً چالیس سال ہوگی ۔"

(ترجمہ ریاض الفصحا ، ص ۲۲۸)

قائم کہتے ہیں :

"عشرت تخلص ، سید زادہ میر غلام علی نام ۔ وہ قصبۂ بریلی کا رہنے والا ، فراغت سے زندگی بسر کر رہا ہے اور حسنِ خلق اور خوش اختلاطی سے ہر ایک کے دل میں جگہ پیدا کرتا ہے ۔"

(ترجمہ مجموعۂ نغز ، ج ۱ ، ص ۳۹۸)

سرور کا بیان ہے :

"عشرت ، میر غلام علی ، ساکن بریلی ، شاگرد مرزا علی لطف ، (جو مرزا رفیع السودا کا شاگرد ہے) ۔"

(ترجمہ تذکرہ سرور ، ص ۳۳۷)

شیفتہ کا کہنا ہے :

"عشرت تخلصِ میر غلام علی ، باشندگانِ بریلی سے ہے ۔ فنِ شعر مرزا علی لطف سے (جو مرزا رفیع سودا کے تلامذہ سے ہے) حاصل کیا ہے ۔ صاحبِ دیوان ہے ، نظر سے نہیں گزرا ۔ لیکن جو اشعار کہ دیکھے یا سنے ہیں ان سے پتا

چلتا ہے کہ پختگی کو نہیں پہنچا تھا ۔

(ترجمہ گلشن بے خار ، ص ۱۳۵)

ان سب سے زیادہ مفصل بیان امیر مینائی کا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''عشرت ۔ میر غلام علی ابن میر معظم علی ۔ نواب نصراللہ خاں بہادر[1] سلطان تخلص کے عہد میں یہاں نوکر تھے ۔ مرزا علی لطف شاگردِ مرزا رفیع سودا کے شاگردوں میں نامور تھے ۔ پدماوت مثنوی جو میر ضیاء الدین عبرت سے ناتمام رہ گئی تھی ، اس کی تکمیل انھوں نے کی ہے ، وہ چھپ گئی ہے ۔ گیارہ سو چھتیس ہجری میں انھوں نے انتقال کیا ۔ مولوی عبدالملک ممتاز نے ''ہائے میر عشرت'' مادۂ تاریخ کہا ۔'' (ص ۲۲۸ ، انتخابِ یادگار) ۔

عشرت نے مثنوی ''ریاض الحسین'' میں ساداتِ مشہد سے نسب ظاہر کیا ہے ۔

---

۱ ۔ نواب نصراللہ خاں سلطان تخلص ، نواب غلام محمد خاں کے معزول ہونے کے بعد بموجب عہد نامہ مابین نواب آصف الدولہ اور نواب احمد علی خاں بہ ضمانت کمپنی مورخہ ۵ ۔ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۷۹۴ع کو نواب احمد علی خاں کی بلوغت (۲۱ سال) تک متصرم اور مدار المہام ریاست رام پور مقرر ہوئے تھے ۔ ۲۶ شوال ۱۲۲۵ھ کو ان کا انتقال ہوا تو نواب احمد علی خاں کو اختیار ریاست کا ملا ۔ قطعۂ تاریخِ وفاتِ سلطان از عنبر شاہ صاحب عنبر :

یک ہزار و دو صد و بست و پنج
بود از ہجرت رسول گواہ
ماہِ شوال بود بست و ششم
کہ بہ جنت رسید نصراللہ

(دیکھیے اخبار الصنادید ، جلد اول ، صفحات ۹۷۹ تا ۲۰۹)

عشرت کی وفات ۱۲۳۶ھ کے پیش نظر اس کی ولادت ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی - ۱۲۲۳ھ میں عشرت نے مثنوی ''ریاض الحسین'' لکھی ہے - اس میں اس نے ''سعادت علی'' اپنے بیٹے کا حوالہ دیا ہے - امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں سعادت علی کے بارے میں لکھا کہ وہ نواب احمد علی خاں کے عہد (۱۲۲۵ھ تا ۱۲۲۶ھ) میں نوکر ہوئے اور نواب محمد سعید خاں کے عہدِ ریاست (۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۱ھ) میں شاہ محمد خاں کے پیش کار اور محکمۂ صدر کے ناظر رہے اور اب (۱۲۹۰ھ) ضعفِ پیری کی وجہ سے خانہ نشین ہیں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعادت علی کی ولادت ۱۲۰۱ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی - ۱۲۲۳ھ میں عشرت نے سعادت علی کا ذکر کیا ہے - اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عشرت کی شادی ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ ہو چکی تھی - اس کا ذکر طبقات الشعرا میں شوق نے (تالیف و نظرثانی ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۰۹ھ) جوان کی حیثیت سے کیا ہے اور مصحفی نے ریاض الفصحا (ص ۲۲۸) میں ان کی عمر قریباً چالیس سال ظاہر کی ہے - ریاض الفصحا کا سالِ آغازِ تالیف ۱۱۱۶ھ ہے اور سالِ اتمام ۱۲۳۶ھ - مصحفی کو عشرت کی وفات کا علم نہیں جو بارہ سو گیارہ ہجری میں پختہ مشق ہوا - اس کی عمر قدرت اللہ شوق کے یہاں ''جوان'' کے مدنظر ۱۲۱۱ھ میں تیس سال سے کم نہیں ہو سکتی - مصحفی نے اس کا حال ۱۲۱۶ھ میں لکھا ہوگا اور اس وقت وہ قریباً چالیس سالہ تھا - اس طرح اس کا سنہ ولادت ۱۱۷۶ھ کے قریب قرار پاتا ہے - لیکن یہ بھی نظر میں رہے کہ طبقات الشعرا کا اولین مسودہ ۱۱۸۸ھ میں مکمل ہوگیا تھا - اگر اس نے عشرت کا حال ۱۱۸۸ھ میں داخلِ تذکرہ کیا ہے اور اس کے لفظ ''جوان'' کا لحاظ رکھا جائے تو سالِ ولادت ۱۱۷۰ھ سے قبل قرار پائے گا -

ہاں اگر اس کا ذکر ۱۱۸۸ھ کے بعد داخلِ تذکرہ کیا گیا ہو، یعنی ۱۲۰۰ھ کے متصل، تب بھی تیس سالہ جوان کا سالِ ولادت ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ ٹھہرے گا۔ اس طرح مصحفی کے بیان سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصحفی کو عمر کے سلسلے میں روایت صحیح نہ پہنچی ہو اور اس کی تخمینی عمر چالیس سال، کمزور روایت پر مبنی ہو۔ اس طرح شوق کا بیان مقامی معاصر کی حیثیت سے زیادہ معتبر سمجھا جائے گا اور سال ولادت ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ ٹھہرانا درست ہوگا۔ اس کے علاوہ عشرت کے پوتے میر محمد حسین کے بارے میں امیر کا بیان ہے کہ وہ نواب محمد سعید خاں کے عہدِ ریاست میں (۲۰ اگست ۱۸۴۰ع تا یکم اپریل ۱۸۵۵ع) ریاست میں ملازم تھے۔ اب اپنے وطن بریلی میں رہتے ہیں (انتخاب یادگار، ص ۲۸۴)۔ اپنے والد کے بوڑھے ہونے پر عہدِ نواب محمد سعید خاں میں ملازم ہوا تھا۔ تالیفِ انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ-۱۸۷۳ع) کے وقت اس کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگی اور میر سعادت علی عیش ضعفِ پیری کی وجہ سے خانہ نشین تھے۔ یعنی ان کی عمر اسّی سال سے متجاوز ہوگی۔ ان دلائل کی روشنی میں عشرت کا سال ولادت ۱۱۷۰ھ ٹھہرانا قرین قیاس ہے۔

بریلی کو روہیل کھنڈ میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ وہاں صوبہ دار رہا کرتا تھا۔ جیسا کہ سیر المتاخرین کے مؤلف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۶۰ھ کے متصل اس کا باپ ہدایت علی خاں صوبہ دار تھا۔ صوبہ دار کے قیام کی وجہ سے بریلی کو دوسرے متصلہ علاقے پر فوقیت حاصل تھی۔ نواب علی محمد خاں (متوفی شوال ۱۱۶۲ھ) کے بعد حافظ رحمت خاں نے بھی اس کی عرصے تک مرکزی حیثیت قائم رکھی۔ عشرت، مشہدی سادات ہونے کے

باعث روہیلوں کی نظر میں عزت اور احترام رکھتے ہوں گے ۔ عشرت کی پرورش شرفا کے دستور کے مطابق ابتداءً گھر پر ہوئی ۔ پھر فضلائے عہد سے تکمیلِ کتبِ درسی بھی بریلی ہی میں ہوئی ۔ بحر العلوم مولانا عبدالعلی اور ملا حسن فرنگی محلی ، حافظ رحمت خاں کے متوسلین میں سے تھے اور بریلی ان کے عہد میں علما اور فضلا کا مرکز تھا ۔

جب ۱۱۸۸ھ میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور روہیل کھنڈ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں نواب شجاع الدولہ نے ضبط کر لیں تو مقامی آبادی کو معاشی مسائل کی کشمکش سے دو چار ہونا پڑا ۔ نواب فیض اللہ خاں کی ریاست (رام پور) بحال رہی تھی ۔ اس لحاظ سے قریبی شہروں کے اربابِ علم و فضل نے رام پور کا رخ کیا ۔

عشرت رام پور آنے سے پہلے سرولی (علاقۂ بریلی) میں بہ سلسلۂ معاش مقیم تھے ۔ اس کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں :

کیوں سرولی میں نہ ہو عیش منغص ہمدم
شہر عشرت سے ”بریلی“ سا جو ... چھوٹا

عشرت نے پدماوت کے دیباچے میں رام پور آنے کے واقعے کو ”چند روز“ کے اندر محدود کیا ہے ۔ اس کے الفاظ ہیں :

چند روز سے سنہ بارہ سو گیارہ میں درمیان شہر رام پور کے کہ نام خاص اس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا ”مصطفیٰ آباد“ ہے ، بہ جہتِ الفت بعضے یارانِ نکتہ پرداز اور دوستانِ محرم راز کے وارد تھا ۔ بلکہ بیچ سرکار ... خان صاحب مشفق فیض رساں، مظہر کرم والاحسان محمد عثمان خان و احمد خاں صاحب سلمہما الرحمٰن کہ خاندان عالی شان

نواب فیض اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کے (سے؟) سوائے رشتۂ خواہر زادگی کے نسبت فرزندگی کی بھی رکھتے ہیں، سررشتۂ روزگار کہ ہر دنیادار کے تئیں جستجو اس کی ضرور ہے اور ہر ایک باشندہ اس بازار کا لیل ونہار بہ فکر روزگار تکاپو میں مجبور ہے، رکھتا تھا۔ میرے تئیں بھی بیچ انیسانِ محفلِ مودت و جلیسانِ بزمِ رفاقت کے جائے استقامت کی دی ہے۔ شب و روز ان کی بندگی میں تھا اور واسطے حظ طبع ان کے غزلیات تازہ کہتا۔"
(پدماوت، ص ۲، ممتاز المطابع دہلی)

عشرت کے بقول اس کے مربی احمد خاں اور محمد عثمان خاں، نواب فیض اللہ خاں کے بھانجے اور داماد تھے۔ اخبار الصنادید کے مؤلف نے نواب علی محمد خاں کی لڑکیوں کی تعداد چار بتائی ہے۔ عنایت بیگم جو بہادر خاں قوم کمال زئی کو منسوب تھی اور بہادر خاں کی بہن گل زادی (کلاں) نواب فیض اللہ خاں سے منسوب تھی۔ بہادر خاں کے دو بیٹوں عثمان خاں اور غلام نبی خاں کو فیض اللہ خاں کی بیٹیاں امامی بیگم اور جانی بیگم علی الترتیب منسوب تھیں۔ احمد خاں نامی نواب فیض اللہ خاں کا کوئی داماد اخبار الصنادید میں نظر نہیں آیا۔ (دیکھیے اخبار الصنادید، جلد اول صفحات ۱۹۶ - ۱۹۷ طبع دوم ۶۰۳، ۶۰۴) لیکن عشرت کا بیان غلط نہیں معلوم ہوتا ہے۔ احمد خاں تخلص احمد، خلف بہادر خاں کمال زئی جو بہ قول امیرمینائی (انتخابِ یادگار ص ۱۰) عشرت کے شاگرد ہیں، ان کا انتقال ۱۲۲۱ھ میں ہوا۔ اس طرح احمد خاں، فیض اللہ خاں کے حقیقی بھانجے تھے، اور عثمان خاں اور غلام نبی خاں ان کے حقیقی بھائیوں کو نواب فیض اللہ خاں کی لڑکیاں امامی بیگم اور جانی بیگم منسوب

تھیں ۔ نواب فیض اللہ خاں کی اولاد کا سلسلہ اگر مؤلف اخبار الصنادید نے صحیح نقل کیا ہے تو اس اختلاف کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ احمد خاں کا بھائی غلام نبی خاں ١٢١١ھ سے پہلے فوت ہوگیا ہوگا اور غلام نبی خاں کی بیوہ (جو فیض اللہ خاں کی لڑکی امامی بیگم نامی تھی) سے دوسرے بھائی احمد خاں کی شادی ہوگئی ہوگی ۔ اس صورت میں عشرت کا بیان اور مؤلف اخبار الصنادید کے بیانات متفق ہو جائیں گے ۔ رام پور کا قیام ١٢١١ھ سے شروع ہوتا ہے اور وفات (١٢٣٦ھ) تک قائم رہتا ہے ۔ عشرت کا تعلق محمد عثمان اور احمد خاں (متوفی ١٢٢١ھ) سے کب تک رہا ، اس کا پتا نہیں چلتا ۔ امیر مینائی کا یہ کہنا کہ نواب نصراللہ خاں کے عہد (١٢٠٩ھ تا ١٢٢٥ھ) میں وہ رام‌پور میں نوکر تھے، معنی خیز ہے ۔ ان کا تقرر ریاست کے کسی محکمے میں ہوگیا ہوگا ۔ امیر مینائی نے سعادت علی ان کے بیٹے کی ابتدائی ملازمت نواب احمد علی خاں (١٢٢٥ھ تا ١٢٥٦ھ) کے عہد میں متعین کی ہے[1] ۔

ریاست کی ملازمت کا دستور قدیم سے یہ تھا کہ باپ کی جگہ

١۔ لیکن مؤلف تذکرۂ شعرائے رام پور نے واضح طور پر والی رام پور نواب احمد علی خاں سے عشرت کا توسل ظاہر کیا ہے اور نثری داستان سحر البیان کی تالیف پر نواب سے صلہ پانا ظاہر کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو:

''عشرت تخلص میر غلام علی مشہدی بریلوی ۔ از ابتدائے سن شعور در سرکار والا اقتدار والی ملک رام پور در زمرۂ حضوریانِ خاص عزت و آبرو حاصل نمود ۔ قصہ ''سحر البیان'' کہ در فصاحت عدیم المثال است ، تصنیف کردہ او از نظر بندگان نواب عالی جناب گزرانید ۔ صلۂ محنت خود حسب مراد یافت ۔''

(تذکرۂ شعرائے رام پور مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بیٹے کو بہ طور حق پہنچتی تھی ۔ اگر کسی کا بیٹا نابالغ ہوتا تو اس کے کسی قریبی رشتے دار کو مقرر دیا جاتا اور شرط یہ ہوتی کہ یہ تقرر عارضی رہے گا اور تنخواہ کا کچھ حصہ متوفی ملازم کی بیوہ کو ملتا رہے گا ۔ جب ملازمِ متوفی کا لڑکا بالغ ہو جاتا (ریاست میں پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کا تقرر ہو جاتا تھا) تو اسے باپ کی جگہ مل جاتی ۔ امیر مینائی کا عشرت کے بارے حوالہ دینا ظاہر کرتا ہے کہ اسے ۱۲۱۱ھ کے بعد ریاست میں کوئی ملازمت مل گئی تھی اور عشرت کی وفات (۱۲۳۶ھ) پر یا اس کی حیات میں یہ اسامی منتقل ہوگئی تھی اور سعادت علی عیش سے یہ اسامی منتقل ہو کر ان کے بیٹے محمد حسین فرحت کو پہنچی ، جن کے بارے میں امیر مینائی کہتے ہیں کہ جنت آرام گاہ کے عہد (۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۲ھ) میں یہاں نوکر رہے ۔ دربار ُدربار میں معزز و موقر رہے ۔ اب مدت سے وطن میں رہتے ہیں ۔ (انتخابِ یادگار ، ص ۲۸۴) ۔

پدماوت کی تالیف :

عشرت کو غزل گوئی کے علاوہ مثنوی گوئی کا بھی شوق تھا ۔ اسی بنا پر مولوی قدرت اللہ شوق نے (جو جملہ اصناف سخن پر قادر تھے) عشرت سے تکمیلِ مثنوی پدماوت کی فرمائش کی ۔ یہ فرمائش شوق نے اپنے مکان پر محفلِ مشاعرہ میں کی جہاں رام پور کے علما اور فضلا اور شعرا جمع ہوتے تھے ۔ عشرت کے بہ قول اُس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ نواب احمد علی خاں والی رام پور کے درباریوں اور مقربوں میں وہ شامل تھے ۔ اسی وجہ سے ان کے بیٹے سعادت علی عیش کو ریاست میں ملازمت ملی اور پھر عیش کے بیٹے محمد حسین فرحت تک یہ سلسلہ چلا ۔

احباب کی دل شکنی نہیں کی اور اس ذمہ داری کو قبول کرکے ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں مثنوی پدماوت تکمیل کو پہنچائی اور مادۂ تالیف "تصنیفِ دو شاعر" سے نکلا ۔ اس سے ان کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے ۔ جو مثنوی برسوں سے ناتمام رہ گئی تھی اور شعرا اس پر ہاتھ ڈالنے کو تیار نہ تھے ، اس کو اس عجلت سے پایۂ تکمیل کو پہنچانا عشرت کا اہم کارنامہ ہے ۔

عشرت کی پُر گوئی کا ذکر مصحفی نے بھی کیا ہے لیکن اس کی جملہ تصانیف محفوظ نہیں رہیں ۔ اس کی ایک مذہبی مثنوی "ریاض الحسین" رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے ۔ اس سے اس کے ذوقِ شاعری کا اندازہ ہوتا ہے ۔

رضا لائبریری رام پور میں اس مثنوی کے دو نسخے ہیں ۔ ایک نسخہ ۱۲۴۵ھ کا مکتوبہ ہے اور اس کے آخر میں عشرت کی تاریخِ انتقال رضی بلگرامی کی کہی ہوئی ہے :

پس از ماتم او رضی رو نہاد
سوئے فکرِ تاریخِ آں خوش نہاد
دریں حال از طبع نیکو سرشت
شنیدم کہ "شد جاے او در بہشت"

۱۲۳۶ھ

عشرت نے ایک نثری داستان بھی لکھی ہے جس کا نام اس نے میر حسن کی مشہور مثنوی "سحر البیان" پر رکھا ہے ۔ اس زمانے میں نثری داستانیں لکھنے کا رواج عام ہو چکا تھا ۔ فورٹ ولیم کالج کے ملازمین کی داستانوں کی شہرت جب ملک میں پھیلی تو اردو شعرا کو بھی اس طرف توجہ ہوئی ۔ جرأت کے شاگرد محمد بخش مہجور نے "نورتن" لکھ کر داد حاصل کی ۔ اسی سال ۱۲۳۰ ہجری

میں عشرت نے اردو میں نثری داستان سحر البیان لکھی ۔ عشرت نے ۱۲۱۱ھ میں "مثنوی پدماوت" کا دیباچہ اردو نثر میں لکھ کر "سودا" کا تتبع کیا تھا اور اس طرح اس کا یہ نثری نمونہ "فورٹ ولیم کالج" کی تالیفات سے قبل اردو کا ایک سلیس انداز بیان پیش کرتا ہے ۔ ۱۲۳۰ ہجری میں اس نے پھر قلم اٹھایا اور ایک رنگین داستان لکھ کر اپنی یادگار چھوڑی ۔ یہ داستان شائع نہ ہو سکی اس لیے اربابِ علم سے خراج تحسین حاصل نہ کر سکی ۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کا نسخہ محفوظ ہے ۔ اس کا سلجھا ہوا انداز تحریر اردو کی ارتقائی منزلوں کو ظاہر کرتا ہے ، اور ادبی مرکزوں سے ہٹ کر جو عوام کی بول چال تھی اس کو قلم بند کرکے عشرت نے دہلوی انداز نگارش کا حلقۂ اثر متعین کیا ہے ۔

عشرت کی شہرت مثنوی گو شاعر کی حیثیت سے ملک گیر ہو چکی تھی ۔ اسی بنا پر اردو تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ چند تذکرہ نویسوں کی موافق اور مخالف رائیں پیش کی جاتی ہیں جس سے اس کی شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

حکیم قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں :

"میر غلام علی عشرت ساکن قصبہ بریلی ، ایک سید زادہ ہے جو ہر شخص کے دل میں اپنی خوش اختلاطی اور خوش خلقی سے راہ پیدا کر لیتا ہے ۔"

(توجمہ مجموعۂ نغز ، ج ۱ ، ص ۳۹۸)

سرور کہتے ہیں :

"عشرت تخلص ، میر غلام علی نام ، بریلی کا رہنے والا ، مرزا علی لطف شاگردِ سودا کا شاگرد ہے ۔"

(ترجمہ تذکرہ سرور ، مطبوعہ بمبئی ، ص ۳۴)

مصحفی کا بیان ہے :

"عشرت تخلص میر غلام علی ساکن بریلی کا ہے ۔ متعدد دیوان اور مثنویاں اس کی تالیف سے ہیں ۔ عمر قریباً چالیس سال ہوگی ۔" (ترجمہ ریاض الفصحا ، ص ۲۲۸)

شیفتہ کی رائے ہے :

"عشرت . . . باشندگان بریلی سے ہے - فنِ شعر مرزا علی لطف سے (جو تلامذۂ مرزا رفیع سودا سے ہے) سیکھا ہے ۔ صاحبِ دیوان ہے ۔ نظر سے نہیں گزرا ۔ لیکن جو اشعار کہ دیکھے یا سنے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی مقام شاعری میں حاصل نہیں کیا ۔"

(ترجمہ گلشن بے خار، مطبع نول کشور ۱۸۷۴ع، ص ۱۳۵)

نساخ تحریر کرتے ہیں :

"عشرت تخلص ، شاگرد مرزا علی لطف ۔ انھوں نے پدماوت کی مثنوی کو ، جو "عبرت" سے رہ گئی تھی ، بارہ سو گیارہ ہجری میں بہ اتمام پہنچایا ۔ صاحبِ دیوان گزرے ہیں ۔"

(سخن شعرا ، ص ۳۳۰)

امیر مینائی ان الفاظ میں تعارف کراتے ہیں :

"عشرت ، میر غلام علی ابن میر معظم علی ۔ نواب نصراللہ خاں بہادر سلطان تخلص کے عہد میں یہاں نوکر تھے ۔ مرزا علی لطف شاگردِ مرزا رفیع سودا کے شاگردوں میں نامور تھے ۔ "پدماوت مثنوی" جو میر ضیاء الدین عبرت سے ناتمام رہ گئی تھی ، اس کی تکمیل انھوں نے کی ہے ۔ وہ چھپ گئی ہے ۔ گیارہ سو چھتیس ہجری میں انھوں نے

انتقال کیا - مولوی عبدالملک ممتاز نے ''ہائے میر عشرت''
مادۂ تاریخ کہا -'' (انتخاب یادگار ، ص ۲۲۸)

خوش معرکۂ زیبا کا مؤلف کہتا ہے :

''شاعرِ کثیر الہمت ، میر غلام علی تخلص عشرت ، ساکن بریلی ، بہ قول مصطفٰی خاں صاحب تذکرہ چار باغ (گلشن بے خار) شاگرد لطف علی بیگ لطف کا - قصہ پدماوت تصنیف کیا ہوا اس کا مؤلف کی نظر سے گزرا ہے - تلاش کم اور بے ربطی (لفظی) بہت سی اس میں ہے - چنانچہ دو شعر اس کے لکھے جاتے ہیں :

زنخ پر اس کے ہے یوں خوشنما تل
کسی عاشق کا جل کر رہ گیا دل

دوسرا شعر (جب رتن سین اپنی مادر سے رخصت ہوا ہے) یہ ہے :

رتن بولا کہ سن اے میری مائی
مجھے چھتیس دھاریں تیں پلائی

مِن کلام عشرت :

رگِ لیلٰی یہ جو فصّاد نے نشتر مارا
قیس کے خون نے بھی جوش برابر مارا

چل جائے اگر اس ستم ایجاد پہ جادو
تو جانیں کیا لاکھ پری زاد پہ جادو

(خوش معرکۂ زیبا ، مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان) -

مؤلفِ ''تذکرۂ کاملانِ رام پور'' نے بعض تفصیلات کلام کے

بارے میں مہیا کی ہیں جو یہ ہیں :

''میر غلام علی ، تخلص عشرت ابن میر معظم علی مشہدی ۔ نواب نصراللہ خاں بہادر کے زمانۂ نیابت میں (۱۲۰۹ھ لغایت ۱۲۲۵ھ) ریاست کے ملازم ہوئے ۔ بریلی میں محلہ گڑھیا میں مکان تھا ۔ مرزا علی لطف کے شاگرد تھے ۔ سنا ہے صاحبِ فضل و کمال تھے ۔ مثنوی پدماوت جو میر ضیاء الدین عبرت سے ناتمام رہ گئی تھی ، اس کی تکمیل آپ نے کی اور چند بار چھپ گئی ہے ۔ پدماوت کا اردو دیباچہ لکھا ہے ۔ بارہ سو چھبیس ہجری (۱۲۲۶ھ) میں (ص : ۱۲۳۶) بہ عہد نواب احمد علی خاں بہادر (۱۲۲۵ھ لغایت ۱۲۵۶ھ) انتقال ہوا ۔ مولوی عبدالملک ممتاز نے ''ہائے میر عشرت'' مادۂ تاریخ کہا ۔ آپ کا دیوان اردو مکمل نہایت بوسیدہ مجھے مل گیا ۔ ستمبر ۱۹۱۰ع میں ، میں نے ریاست کے کتب خانے کے لیے خرید لیا ۔ تقریباً تین سو صفحات ہیں ۔ نہایت اچھا کلام ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اصل مسودہ ہے ۔ کہیں کہیں شعروں کی جگہ خالی ہے ۔ دوسری تصنیف کا نام ''سحر البیان'' ہے ۔ اردو نثر میں قصہ دو سو صفحوں کا کتب خانۂ ریاست میں موجود ہے ۔ (تذکرۂ کاملانِ رام پور ، از احمد علی خاں شوق ، صفحہ ۳۰۱ - ۳۰۲)

انتخابِ کلام پیش کیا جاتا ہے :

جھٹک کر وہ دامن کو چلتا رہا
تاسف سے میں ہاتھ ملتا رہا

برابر سے دی مجھ کو یک ضرب دوش
وہ چلتا رہا ، میں سنبھلتا رہا
دمِ (نزع) تک بھی بجائے سرشک
مری چشم سے خوں نکلتا رہا
نہ کب دل مرا شمع و خورشید سان
شب و روز اس غم میں جلتا رہا
وہی طفل اب آستیں کا ہے سانپ
کہ عشرت جو آنکھوں میں پلتا رہا

نہ پوچھ اے ہم قفس میرے وطن کو
سنا ہو تو نے وہ اجڑا چمن تھا

اے ہم قفسو جو کہ مقدر ہے سو ہوتا
قصہ نہ کہو بہرِ خدا مجھ سے چمن کا

پاس جب سے نہیں اے یارو وہ دلبر اپنا
جی نہ گھر ہی میں بہلتا ہے نہ باہر اپنا
شہر و بازار میں ہوتا نہ ذلیل و رسوا
ہائے کہنے میں جو ہوتا دلِ ابتر اپنا

جو گھر کے جانے کا محفل میں ان نے نام لیا
ہر اہلِ بزم نے دل اپنا تھام تھام لیا

سیرِ چمن کو جاؤں کب ہے دماغ مجھ کو
ہے بوئے گل بھی اس بن دود چراغ مجھ کو

ہم ہوں یہ درد و غم ہو اور نالہ و فغاں ہو
آؤ نہ آؤ پیارے ، تم خوش رہو جہاں ہو

بخت اس کی چشم مست کو ہشیار کیا کرے
سوتا ہو جو وہ سوتے کو بیدار کیا کرے

آ جا کہ اے عمرِ جاودانی
تجھ بن ہے خراب زندگانی
کیا کوسوں تجھے اے بختِ خفتہ
نیند آنے کو تھی یہی کہانی
جیتا ہوں میں تجھ بغیر اب تک
اللہ رے میری سخت جانی

اولاد :

عشرت کے بیان سے اس کے ایک لڑکے سعادت علی نامی کا پتا چلتا ہے جس کا ذکر اس نے ''ریاض الحسین'' میں کیا ہے ۔ سعادت علی کی ولادت ۱۲۰۵ھ کے لگ بھگ ہونا چاہیے ، اس لیے کہ سعادت علی کے لڑکے میر محمد حسین فرحت نے نواب محمد سعید خاں کے عہد (۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۱ھ) میں رام پور کی ملازمت کر لی تھی ۔ ۱۲۹۰ھ میں امیر مینائی نے تذکرہ انتخاب یادگار میں سعادت علی کی خالہ نشینی بوجہِ ضعف ظاہر کی ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بوجہِ ضعف سعادت علی نے ملازمت اپنے لڑکے محمد حسین کے نام منتقل کرادی

تھی - اگر یہ واقعہ ۱۲۶۵ھ کے لگ بھگ پیش آیا ہو تو ساٹھ سال کی عمر میں اس کا ملازمت سے خود دست کش ہو کر اپنے لڑکے کے نام کرانا قیاس کیا جا سکتا ہے - سعادت علی نے رام پور میں ہوش سنبھالا اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کی - سرکاری دفاتر ریاست رام پور کے فارسی میں تھے اس لیے فارسی میں مہارت کے بعد ہی سرکاری ملازمت مل سکتی تھی - عربی سے تھوڑا بہت باخبر ہونا اس زمانے میں ضروری تھا - اس لیے بالعموم فارسی کے ساتھ ابتدائی عربی درسی کتابوں کی تحصیل طلبا کے لیے ضروری تھی - سعادت علی نے بھی زمانے کے رواج کے موافق عربی اور فارسی کی درسی کتابیں پڑھی ہوں گی ، اس لیے کہ وہ پیش کاری اور نظارت کے فرائض ریاست رام پور میں انجام دیا کرتے تھے - امیر مینائی نے ان کا ذکر انتخاب یادگار (صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰) میں کیا ہے اور اردو کے اشعار بھی نمونۃً پیش کیے ہیں - وفات ۱۲۹۰ھ کے بعد ہوئی -

عشرت کے نظم کے کارنامے سے زیادہ اہم ان کا نثری قصہ ''سحر البیان'' ہے جو تا ہنوز طباعت سے محروم ہے - امید ہے کہ جس وقت ان کی غیر مطبوعہ تصانیف اشاعت پذیر ہوں گی اس وقت ان کا صحیح مقام نظم اور نثر میں متعین ہو سکے گا -

• • •

تنقیدی جائزہ

عبرت اور عشرت کے تفصیلی حالات آپ نے کلب علی خاں فائق صاحب کے سوانحی مقدمے میں ملاحظہ فرمائے۔ میں ان کا اعادہ نہیں کروں گا۔ مجھے زیرِ نظر سطور میں محض "پدماوت اردو" یعنی "تصنیفِ دو شاعر" کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ میری معروضات کا زیادہ تر انحصار کتاب کی اندرونی شہادتوں پر ہوگا۔ اب میں باری باری عبرت اور عشرت کا ذکر کرتا ہوں اور ان کی کاوشوں پر مختصراً روشنی ڈالتا ہوں۔

میر ضیاء الدین عبرت نے فائق صاحب کے بقول ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء یا ۱۷۹۰ء کے قریب ملک محمد جائسی کی بیان کردہ مشہور داستان پدماوت کو اردو نظم میں منتقل کرنا شروع کیا۔ ماخذ کے طور پر جس کتاب کو سامنے رکھا گیا، وہ عاقل خاں رازی کی تصنیف "شمع و پروانہ" تھی۔ رازی نے فارسی نظم میں "شمع و پروانہ" ۱۶۵۸ء میں لکھی تھی۔[1] عبرت نے اقرار کیا ہے کہ انھوں نے عاقل خاں رازی کی مثنوی سے محض قصے کے مطالب اخذ کیے ہیں، اسلوب اور پیرایۂ اظہار نہیں لیا، کیونکہ اس چیز کو عبرت سرقہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ اپنی مثنوی کے آغاز میں رازی کا ذکر کرتے ہوئے

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کتاب کا ۱۱۵۲ھ کا مکتوبہ نسخہ موجود ہے۔

لکھتے ہیں :

نہ سرقہ ہے نہ کوئی مبتذل ہے
توارد لیکن اس کا محتمل ہے
مگر مضمونِ عاقل خانِ رازی
کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی

تیسّن کے طریق اس میں ہے داخل
کہ میں اس کے مقولے کا ہوں ناقل
سو اس کی نظم کو تو دیکھ لا تو
بندھا ہووے گا مضموں ایک یا دو

رازی کی مثنوی ''شمع و پروانہ'' اور عبرت کی نظم کا تقابلی مطالعہ ایک بات واضح کر دیتا ہے کہ رازی ، عبرت کے مقابلے میں بے حد اختصار پسند ہیں ۔ رازی نے پیدائشِ پدم کے بعد جو عنوان قائم کیا ہے اس میں طوطا ملک سراندیپ یعنی پدماوت کے دیس سے اڑ چکا ہے ۔ اس کے برعکس عبرت نے اس وقفے کو چار عنوانوں کے درمیان رکھا ہے ۔ رازی نے تمام جزئیات ایک ہی عنوان میں درج کر دی ہیں ، لیکن عبرت نے پدماوت کی تعلیم اور طوطے کی رفاقت اور محبت ، پھر سہیلیوں کے ہمراہ پدماوت کی سیرِ چمن ، پھر طوطے پر گھر والوں کی سختی اور پھر اس کا اڑ کر صیاد کے دام میں گرفتار ہو جانا ، سب واقعات الگ الگ عنوانات کے تحت درج کیے ہیں ۔ رازی اور عبرت کے درمیان نہ صرف پیرایۂ اظہار کا فرق ہے بلکہ شعری تجربے کی فطرت اور اس سے بڑھ کر شاعری کے پورے رویے کا بھی اختلاف ہے ۔ رازی کی شاعری میں ساری فضا ایرانی ہے اور عبرت کے ہاں ساری فضا ہندوستانی ہے ۔ رازی کی تصویریں غیر محسوس ، تصوراتی اور مجرد ہیں ، لیکن عبرت کے ہاں ٹھوس

اور مجسم Images کی فراوانی ہے ۔ شاید یہی سبب تھا کہ عبرت نے رازی سے کسبِ فیض کا اعتراف کرنے کے فوراً بعد بڑے زور شور سے اس دعوے کا اعلان کیا کہ :

سن اے حاسد ارے بے فضل و احمق
تو کیوں بکتا پھرے ہے ایسا ناحق

نہیں ہیگا یہ غیرت کا تقاضا
کہ مضموں لا کے میں باندھوں پرایا

میں غیروں کو ادب کرتا ہوں ارشاد
میں اپنے عصر کا ہوں آپ استاد

جو کوئی آپ کرتا ہووے شاہی
اسے غیرت ہے دریوزہ گدائی

عبرت کے استادِ وقت ہونے کا ذکر آیا ہے تو اس جگہ ان کے فنِ شعر کے بارے میں بھی چند نظریات ملاحظہ فرما لیجیے ، تا کہ آئندہ سطور میں ان کی شعری صناعت (Poetic Craft) کے بارے میں کچھ باتیں کہنا آسان ہو جائیں ۔ لکھتے ہیں :

کہ میں نے جانکنی جوں کوہ کن کی
بنائی شکل تب شیریں سخن کی

نکالی دل سے ہے آہِ جگر گوں
کیا ہے مصرعِ رنگیں کو موزوں

ہر اک مصرع مرا لوہو میں ہے غرق
برنگِ مصرعِ برجستۂ برق

مرے ہر حرف میں خوں کا اثر ہے
زبانِ خامہ شاید نیشتر ہے

ان اشعار سے عبرت کے فن کے بارے میں چند معلومات اخذ ہوتی ہیں جن کی وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی :

(۱) عبرت تخلیقی عمل کو کوہ کنی کے برابر سمجھتے ہیں ۔

(۲) اُس مصرعے کو موزوں سمجھتے ہیں جو خوش نما بھی ہو اور برجستہ بھی ۔

(۳) پر اثر شعر وہ ہے جس میں خونِ دل شامل ہو ۔

ان تینوں باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ عبرت شعر میں آمد اور لاشعوری قوتوں سے زیادہ آورد اور شعوری کاوشوں کو اہمیت دیتے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب میں عبرت والا حصہ پڑھنے سے ان باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ رازی کے ہاں بھی لفظوں کی تراش خراش کا عمل ، تخلیقی اتفاقات سے زیادہ ہے ۔ میں تخلیقی اتفاقات آمد کو اور تراش خراش کا عمل شعوری کوشش یا آورد کو کہتا ہوں ۔ رازی کے علاوہ عبرت نے دو اور شاعروں کے اسلوب سے بھی فائدہ اٹھایا ہے ؛ ان میں سے ایک مولانا جامی ہیں ، جن کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے اشعار انھوں نے مقولے کے طور پر پیش کیے ہیں ، مثلاً :

کروں کیا عشق کا میں وصف ارقام
کہ فرماتے ہیں حضرت مولوی جام
''نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد''

اور دوسرے مثنوی ''نیرنگِ عشق'' کے مصنف غنیمت کنجاہی ہیں ۔ مثنوی ''نیرنگ عشق'' زلیخائے جامی کی تقلید میں پنجاب کے ایک گاؤں میں لکھی گئی ، ۱۰۹۶ھ میں مکمل ہوئی اور فارسی ادب میں مالک گیر شہرت حاصل کی ۔ اس کی بحر بھی وہی ہے جو پدماوت

کی ہے۔ عبرت نے ہرچند کہ اس مثنوی کا نام نہیں لیا، لیکن اشعار کی مطابقت ظاہر کر رہی ہے کہ انھوں نے اس کو پڑھا ہے، اور اس سے کسبِ فیض کیا ہے۔ چند اشعار کی مثالیں اس جگہ بے موقع نہ ہوں گی:

غنیمت

مرا از ذکر ایشاں مطلب آن است
کہ این جا یوسفے در کاروان است

نہ من این گوہرِ سیراب سفتم
شنیدن را مبارک باد گفتم

نگاریں دخترے بردہ ز سر ہوش
چہ دختر با قیامت دوش بر دوش

شد اول از سرِ بیتابیِ دل
بہ یک بسم اللہ اش استاد بسمل

بتِ نادیدہ مکتب غارتِ ہوش
برنگِ غنچۂ گل مالند خاموش

شدند اطفال زاں غارت گرِ تاب
چوں طفل اشک ما خونیں دلاں آب

عبرت

مجھے اس پر جو تائیدِ سخن ہے
جنوں سرمایۂ عشقِ وطن ہے

کہ من بہرِ تو ایں گوہر نہ سفتم
برائے خاطرِ احباب گفتم

جنی اس گل رخِ زیبا نے دختر
نہ دختر ، بلکہ اک تابندہ اختر

لگی پڑھنے وہ بسم اللہ جس دم
برہمن ہو گیا مجموعۂ غم
سبق کو بھول کر وہ غارتِ ہوش
تبسم کرکے ہو جاتی تھی خاموش

محبت کی ہوا گرمی سے بیتاب
برنگِ اشکِ خونی ہو گیا آب

یہ چند اشعار میں نے نمونۃً لکھے ہیں ۔ ایسی مثالوں کی جو دونوں طرف نہ صرف لفظی بلکہ مضامین کی مطابقت بھی دکھاتی ہیں ، بدماوت میں کمی نہیں ۔ غنیمت کا لفظی تمثیل کاری اور تلازمات اور مراعات کا التزام بھی عبرت کے ہاں نمایاں ہے ۔ عبرت کسی منظر یا واقعے کا جذباتی ابلاغ نہیں کرتے بلکہ سلسلہ در سلسلہ تلازمات مرتب کر دیتے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ کام شعوری سطح کا ہے اور اس کے لیے جذباتی ابلاغ کی بہ نسبت زیادہ جگر کاوی کی ضرورت ہے ۔

عبرت اسلوب کے شاعر ہیں اور ان کے یہاں صناعت (Craft) ہی اصل فن ہے ۔ سیرِ باغ کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیے اور تلازمات کا لطف لیجیے :

برنگِ سرو اس کا سبز داماں
یکایک ہوگیا زیبِ خیاباں

عصا فوارہ لے کر اہتمامی
ہوا جوں چوبدار اس کا سلامی

اٹھی تعظیم کو نرگس بھی ناچار
سہارے سے عصا کے مثلِ بیمار

چمن میں دیکھ کر اس کا تجمل
بہم ہنستا تھا گل پر دوسرا گل

جدھر کو شعلہ رو وہ گرم جاتی
اک آتش خرمنِ گل میں لگاتی

چمن میں دھوم اس گل نے مچائی
کہ گل کی سیر کو ہے برق آئی

مثنوی ''گلزار نسیم'' کا اختصار اور الفاظ کا چناؤ اُردو ادب میں مثال کا درجہ رکھتا ہے لیکن عبرت کے یہ شعر تو اس مثنوی سے کم و بیش ربع صدی پہلے کی تخلیق ہیں ۔ پدماوت کی پیدائش پر چند تاثرات دیکھیے :

وہیں اک سبز گہوارا منگایا
اسے غنچے کی شکل اس میں سلایا

وہیں اک دائی ستھری سی منگائی
یہ آتش اس کے سینے کو لگائی

جو پایا دائی نے عالم نرالا
بغل میں اس کو دل کی طرح پالا

اسے بادِ مخالف سے بچاتی
چراغ آسا تہہِ دامن چھپاتی

نظر سے چشمِ بد کی بس کہ ڈرتی
جدا آنکھوں سے جوں پتلی نہ کرتی

لیے رہتی تھی ہر ساعت مشوش
اسے گودی میں جوں جاڑے کی آتش

قیامت فتنہ اس قد میں جو پاتی
تھپک کر اس کو بھی اکثر سلاتی

عبرت کے ہاں رعایتوں کا یہ اہتمام انہیں شعری فنون سے آگاہ قادر الکلام شاعر تو ثابت کرتا ہے ، لیکن ان کے ہاں کسی بہت بڑے استعارے یا تخلیقی بصیرت (Creative Vission) کا پتہ نہیں دیتا ۔

عبرت قصے کا آغاز خود کلامیے کے طور پر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں قاری کا شعور آخر تک موجود نہیں ، اس سے قصے کا اسلوب بھی متعین کیا جا سکتا ہے ۔ عبرت کا اپنا اعتراف ملاحظہ فرمائیے :

میں غمخواری میں تیری اے دلِ زار
تڑپتا ہوں سدا جیوں نبضِ بیمار
نہ مجھ کو چین ہے نے تجھ کو ہے خواب
پتنگ و شمع ساں دونوں ہیں بیتاب
کہوں اک قصہ تا یہ درد بٹ جائے
کہیں باتوں میں غم کی رات کٹ جائے

عبرت نے داستان کو خود کلامیے کا رنگ شاید اس لیے دیا ہے کہ وہ قاری یا سامع کی موجودگی سے خوف زدہ ہوتے ہیں ۔ چنانچہ آغازِ داستان میں انھوں نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے کہ ممکن ہے قارئین اس بات پر اعتراض کریں کہ مسلمان ہونے کے باوجود میں نے ہندوؤں کے عشق کو کیوں مثنوی کا موضوع بنایا ہے ، جس کا جواب وہ خود ہی دیتے ہیں کہ :

نہیں کچھ مانتا عشقِ ستم گار
کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار

اس جگہ بھی سوال کرنے والا قاری نہیں بلکہ عبرت خود ہیں اور جواب دینے والا ان کا قلم ہے ۔ گویا خود کلامیے میں شاعر کی ایک ذات اس کی دوسری ذات سے سوال کرتی ہے اور شبہے اور اطمینان کے درمیان کوئی دوسرا کردار نہیں آتا ۔ چنانچہ عبرت نے اپنے قصے کے آخر تک جہاں بھی خطاب کیا ہے ، اپنے دل سے یا قلم سے ہی کیا ہے ۔ مثلاً :

برنگ صبح اے دل واہ شاباش
جراحت پر تو اپنی ہے نمک پاش
نہایت مضطرب دل کو جو پایا
یہ قصہ میں نے اس کو کہہ سنایا
کتابِ حسن کا جو نکتہ داں ہے
پدم کے حال سے یوں قصہ خواں ہے

ذرا تو بھی چل اے دل اب گلستاں کے تماشے کو
کہ گلگشتِ چمن کو آج تیرا یار آتا ہے

عبرت اور عشرت کے انداز میں یہی ایک بنیادی فرق ہے کہ وہاں قصہ گو کے یہاں قاری یا سامع کا شعور ہے اور یہاں یہ شعور نہیں ہے۔ فائق صاحب نے نجو خاں کی فرمائش کا حوالہ دیا ہے، جو درست ہوگا۔ لیکن عبرت کے اسلوب میں اس فرمائش کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر مزید بحث عشرت کے ضمن میں بھی آئے گی۔ عبرت کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے، اور وہ ہے ''زمینی شعور''۔ عبرت کو خاکِ وطن سے عقیدے کی حد تک پیار ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

سوادِ ہند کو اے مونسِ جاں
بناؤں سرمۂ خاکِ صفاہاں
کروں ہندوستاں کا عشق مرقوم
مچے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
کہ شورِ عشقِ ہندی تیز تر ہے
عرب کے عشق سے خونریز تر ہے

عبرت کے ہاں تشبیہیں مجرد اور غیر محسوس نہیں ہیں بلکہ اکثر ٹھوس، اور زمینی حوالوں سے پیدا ہوتی ہیں، جن میں قارئین کے لیے احساسِ قربت بھی ہے اور قطعیت بھی۔

عبرت کے بارے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک واسطے سے جرأت کے شاگرد ہیں ؛ یعنی عبرت شاگرد نواب محبت خاں محبت کے اور محبت شاگرد جرأت کے۔ لہذا لکھنوی شاعری کے چند اہم خصائص، جن سے جرأت اور ان کا عہد شناخت کیا جاتا ہے، ان کے ہاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی چیز، جنسی لذت پرستی ہے۔ مختلف جسمانی اعضا کی تفصیل سے اور

نسوانی حسن کے بعض آرائشی متعلقات ، مثلاً لباس وغیرہ ، سے جنسی لذت حاصل کرنا یا پیدا کرنا ، لکھنوی شاعری کا خاص رجحان رہا ہے ۔ عبرت کے ہاں بھی ان چیزوں کی کمی نہیں ۔ پدماوت کے حسن کی تفصیل میں ان کی نظر بار بار اس کی چھاتیوں پر پڑتی ہے اور قاری کے اندر مختلف حسیں بیدار کرکے وہ ان اعضا کو لذت کا ذریعہ بناتے ہیں ۔ اسی طرح لباس میں انگیا ان کی توجہ کا مرکز ہے ۔ پدماوت کو طوطے کی حفاظت مقصود ہے ۔ اس موقع پر بھی عبرت کا کہنا ہے کہ وہ اسے انگیا کی چڑیا کی طرح سینے سے لگائے رکھتی تھی ۔ اس جگہ ایک بات اور بھی مدنظر رکھنے کی ہے کہ عبرت طبیب ہیں اور رئیس کے مقرب ہیں ۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ عورت رئیسوں کی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے ، لہذا لذتیت کے مواقع مہیا کرکے وہ انھیں خوش کرنا چاہتے ہوں گے ۔ اس جگہ ایک طرف اگر نجو خاں کی فرمائش سامنے آتی ہے تو دوسری طرف خود عبرت کی افتادِ طبع کا بھی پتہ چلتا ہے ۔

عبرت تلازمات اور لفظی رعایتوں کے جادو جگاتے ہوئے داستان کو آگے بڑھا رہے تھے کہ عمر نے بے وفائی کی اور انھیں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر رخصت ہونا پڑا ۔ اس طرح ان کا یہ ارمان دل ہی میں رہا کہ :

کروں خورشید ساں طبع آزمائی
سیاہی کی بناؤں روشنائی

لکھوں خطِ شعاعی مثلِ گردوں
بیاض روئے کاغذ صبح کردوں

بدل شنگرف کی رنگِ شفق ہو
گلستاں کا نمونہ ہر ورق ہو

خموش الفاظ ہوں جوں غنچۂ گل
معانی میں چھپا ہو شورِ بلبل
لکھی صفحے پہ ہو ہر فرد دلجو
صحیح و خوشنما جوں بیت ابرو
کشش ہر حرف کی دلچسپ تر ہو
جو مد اس پر ہو سو مدِ نظر ہو
کہیں زیر و زبر جو پیش آ جائے
مژہ کے موے بھی زیبا وہ دکھلائے

(۲)

۱۲۰۶ھ میں عبرت نے انتقال کیا ۔ اس وقت پدماوت کا صرف ایک چوتھائی حصہ مکمل ہوا تھا اور عبرت نے اس کا نام ''شمع و پروانہ'' تجویز کیا تھا کہ عاقل خاں رازی کی مثنوی ، جس کے تتبع میں یہ مثنوی لکھی گئی ، اس کا بھی یہی نام تھا ۔ عبرت نے خود کہا :

سو ان کا میں نے لکھ کر قصۂ تام
مدلل شمع و پروانہ رکھا نام

عبرت کا نامکمل کام ان کی وفات کے پانچ سال بعد یعنی ۱۲۱۱ھ میں ایک دوسرے شاعر غلام علی عشرت نے انجام تک پہنچایا ۔ وہ بریلی کے رہنے والے تھے اور قریباً ۱۴ برس کی عمر میں بغرضِ ملازمت رام پور میں آئے تھے۔ انھوں نے احباب کی فرمائش پر اس کام میں ہاتھ ڈالا ۔ بقولِ مصحفی پُرگو شاعر تھے ۔ نثر کے اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے ۔ ڈیڑھ مہینے میں مثنوی مکمل کر دی ۔ پوری مثنوی پڑھ جائیے ، یوں محسوس ہوتا

ہے جیسے ایک طوفان اٹھا ہے ، جس کا دھارا کسی جگہ سست یا منقطع ہوئے بغیر بہتا چلا گیا ہے ۔ عشرت کے کام کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے سے پہلے ، میں ان کی بعض حدود (Limitations) واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ ان کو مدنظر رکھے بغیر ہم عشرت کو عبرت سے امتیازی طور پر الگ نہیں کر سکیں گے اور انھی سے عبرت اور عشرت کا تقابلی مطالعہ بھی بآسانی ہو سکے گا :

۱۔ عبرت کے سامنے قاری یا سامع کا تصور نہ تھا ۔ وہ خود ہی قصہ گو ہیں اور خود ہی سامع یا قاری ہیں ۔ اس کے برعکس عشرت کا کام فرمائشی ہے اور ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ادبی تجربے میں دوسروں کو بھی شریک کریں ۔ عبرت اور عشرت کے اسلوب میں وہی فرق ہے جو اپنے آپ سے بات کرنے میں اور دوسروں سے بات کرنے میں ہوتا ہے ۔

۲۔ عبرت ، رازی کی مثنوی "شمع و پروانہ" کو بنیاد بنا کر کام کر رہے ہیں اور عشرت مجبور ہیں کہ عبرت کا تتبع کریں اور ان کے نامکمل قصے کو انجام تک پہنچائیں ۔ فرمائشی قصہ اور فرمائشی اسلوب ۔ گویا عشرت سٹیج کے ایکٹر ہیں جو مسودے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ۔ پھر عبرت کا اسلوب محض صناعت ہونے کے سبب سے ناقابلِ تقلید بھی ہے ۔

۳۔ عشرت نہ صرف شاعر ہیں بلکہ صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں ۔ علاوہ ازیں مختلف علوم میں دسترس بھی ان کے کلام سے واضح ہے اور داستان کے فن سے بھی عبرت سے کہیں زیادہ آگاہ ہیں ۔

۴۔ عشرت بریلی کے رہنے والے ہیں ۔ اس علاقے کے بارے میں ہنٹر کہتا ہے :

"Havier storms. Rainy season begins earlier and continues later than in the south. And cold season lasts longer." (Impirial Gazzeteer of India 1908.)

آندھیوں ، یخ بستہ موسموں اور طوفانی بارشوں میں رہنے والے لوگ جفا کش ، بردبار اور کھردرے مزاج کے ہوتے ہیں ۔ مشکلات کا مقابلہ کرکے چیزوں کی تہہ تک پہنچنا اور ان کی حقیقتیں دریافت کرنا ان کے مزاج کا خاصہ ہوتا ہے ۔ عشرت کے فن کو سمجھنے کے لیے ان حقائق کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے ۔

۵۔ عشرت کا کام طویل ہے اور فرمائش کرنے والے بیتاب ہیں ۔ ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصے میں ایک پورے عہد کی کہانی صرف اسی صورت میں بیان کی جا سکتی ہے کہ جزئیات کا خوبصورت انتخاب کیا جائے اور ان کو بیان کرنے میں جذباتی سادگی (Emotional Simplicity) سے کام لیا جائے تا کہ قاری یا سامع کی توجہ ایک غیر منقطع وحدت میں رہے ۔

۶۔ عشرت کے ذہن میں فارسی اور آردو مثنویوں کے بے شمار اعلیٰ درجے کے نمونے تھے اور وہ ہر ایک کے اسلوب سے استفادہ کرنا چاہتے تھے ۔

ان تمام باتوں کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی ۔ اس وقت ہم اپنے مطالعے کا آغاز 'پدماوت' کے اس حصے سے کرتے ہیں جہاں

سے عشرت کے اشعار شروع ہوتے ہیں ۔ عشرت کہتے ہیں :

کہا یاں تک یہ قصہ بس ضیاء الدین عبرت نے
اب اس کا شوق ہر دم مجھ کو یوں رغبت دلاتا ہے

کہ عشرت پی کے تو الفت کا اک جام
مری خاطر سے کردے اس کو اتمام

کہ اس میں روح بھی عبرت کی ہو شاد
دعائے خیر سے تجھ کو کرے یاد

غرض قصہ ادھورا رہ نہ جائے
جو ہیں مشتاق ان کے کام آئے

سو میں نے شوق کی خاطر یہاں سے
کہ ہیں مشفق مرے اعلیٰ جہاں سے

اٹھا کر اپنی کلکِ درخشاں کو
کیا تحریر یوں اس داستاں کو

ان اشعار سے عشرت کے فن کے دو پہلو نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ پہلا یہ کہ عشرت احباب کی خاطر یہ مثنوی کہہ رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ عبرت کی روح کو خوش کرنا چاہتے ہیں جو یقیناً اسی صورت میں خوش ہوگی جبکہ مثنوی کا باقی حصہ عبرت والے حصے سے کم تر نہ رہے ۔ عشرت نے مثنوی لکھتے ہوئے جن کئی ایک شاعروں کا اسلوب سامنے رکھا ہے ، ان میں پہلا نام عبرت کا ہے ۔ اعتراف کسی جگہ نہیں لیکن اشعار کے تیور نمایاں طور پر غمازی کر رہے ہیں ۔ مثال کے طور پر :

عشرت

بسانِ چوبداراں اہتامی
ہوئی نرگس عصا لے کر سلامی

عبرت

عصا فوارہ لے کر اہتامی
ہوا جوں چوبدار اس کا سلامی

دونوں شاعروں کے ہاں محض اشیا کے ناموں کا فرق ہے ورنہ شعر ایک ہی ہے ۔ ایسے اشعار تلاش کیے جائیں تو عشرت کے ہاں اور بھی بے شمار نکلتے ہیں ۔

عشرت نے فارسی شاعروں میں سب سے زیادہ جن سے اثر قبول کیا ہے ، وہ مولانا جامی ہیں ۔ ان کی مثنوی یوسف زلیخا کے اشعار عبرت نے بھی اپنے حصے میں تمثیلاً درج کیے ہیں ، لیکن عشرت نے اس مثنوی کے بکثرت اشعار اپنے یہاں استعمال کیے ہیں ۔ اتفاق سے ''پدماوت اردو'' کی بحر بھی ''یوسف زلیخا'' والی ہی تھی ۔ جامی کے اشعار سے جابجا واقعات کا تاثر بڑھانے میں مدد لی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر عشرت کے حصے میں جامی کے مندرجہ ذیل اشعار ، اردو اشعار میں فارسی کا پیوند لگا کر بیان کی زیب و زینت کو دوبالا کرتے ہیں :

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

در آید جلوۂ حسن از رہِ گوش
ز جاں آرام برباید ز دل ہوش

فلک در خیلش از جوزا کمربند
ظفر پابند تیغش سخت پیوند

ہمہ اسبابِ شاہی حاصلِ او
نماندہ آرزوئے در دلِ او

اور جامی کی شخصیت کا اعتراف بھی نمایاں الفاظ میں کیا گیا ہے :

اسے سن کر یہ اپنی جان کھووے
تو بس یاں قولِ جامی راست ہووے
کروں کیا شان و شوکت اس کی تقریر
بجا ہے مولوی جامی کی تحریر

جامی کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایک مصرعے میں بعض اوقات کئی کئی اضافتیں استعمال کرکے اسے ایک مرکب وحدت میں تعمیر کرتے ہیں ۔ اس طرح شعر بلند آہنگ بھی ہو جاتا ہے اور معانی کی کئی کئی سطحیں بھی اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اس خصوصیت کو مدنظر رکھیے اور عشرت کے مندرجہ ذیل اشعار کی صناعت دیکھیے :

پس از ادائے شوقِ صد ملاقات
یہ ظاہر ہو برائے الفت آیات

کہ اے گلدستۂ باغِ محبت
برنگِ لالہ با داغِ محبت

اسیرِ الفتِ گل ، مثلِ بلبل
بدل خارِ وصالِ حسرتِ گل

وہ تیرا نامہ اے سروِ خراماں
ہر اک جملہ تھا جس کا جیوں گلستاں

کیا تھا جو رقم تو نے سو اے گل
ہوا جیوں سرمہ زیبِ چشمِ بلبل

اسلوب کی بحث جاری ہے تو اس جگہ یہ بات بھی واضح کر دوں کہ عشرت کے سامنے اردو کے ایک معرکۃ الآرا شاہکار یعنی میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا اسلوب بھی موجود تھا۔ یہ مثنوی ۱۱۹۶ھ میں یعنی عشرت کی مثنوی سے تقریباً ۱۵ سال پہلے لکھی گئی اور تصنیف کے فوری بعد اپنے عہد کی مقبول ترین تصانیف میں شمار ہونے لگی۔ عشرت کی اس مثنوی سے دلچسپی ان کی نثری تصنیف سے بھی ظاہر ہے جس کا نام ہی ''سحر البیان'' ہے اور بقول ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جس کے کردار میر حسن کے کرداروں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ میر حسن بھی اسلوب میں فنی ابلاغ سے زیادہ جذباتی ابلاغ کے قائل ہیں۔ جزئیات کی کثرت کے باوجود بیان میں جذباتی اختصار مثنوی ''سحر البیان'' کی نمایاں خصوصیت ہے۔ عشرت کے اسلوب میں بھی یہی خوبیاں ہیں۔ اور پھر چونکہ عشرت، ملک محمد جائسی سے براہ راست مضامین لے رہے ہیں اور جائسی قدم قدم پر جزئیات کا ایک جہان پیدا کر دیتے ہیں، اس لیے عشرت کا کام بعض مقامات پر میر حسن سے زیادہ دلکش اور زیادہ زوردار دکھائی دیتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشرت نے مثنوی لکھتے وقت رازی کی مثنوی شمع پروانہ کو (جسے عبرت نے بنیاد بنایا تھا) نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت وہ نمایاں اختلافات ہیں جو رازی اور عشرت کے ہاں پلاٹ کی ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ رازی کے بارے میں ایک بات کی صراحت اسی جگہ کرتا ہوں کہ انھوں نے غالباً قصے کے ہندوانہ مزاج کو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اپنی

تصنیف میں تبدیل کر دیا تھا ۔ ممکن ہے عبرت نے بھی رازی کو اسی سبب سے پسند کیا ہو ۔ رازی کے قصے کو مشرف بہ اسلام کرنے کی مثالیں دو تین جگہوں پر بے حد نمایاں ہیں ۔ یہی رازی اور عشرت کے درمیان اختلافی مقامات ہیں ۔

پہلا اختلاف وہاں ہے جہاں سنگلدیپ (یا سنہل دیپ) میں رتن سین ، پدماوت کی ہدایت کے مطابق شہر میں گھس جاتا ہے اور چوری کے الزام میں پکڑا جاتا ہے ۔ قریب ہے کہ قتل کر دیا جائے کہ بقول ملک محمد جائسی ، دیوتا ، گندھرب سین کے سامنے آ کر رتن سین کی سفارش کرتا ہے اور رتن سین کی اصل شخصیت سے گندھرب کو آگاہ کرتا ہے ۔ رازی شاید دیوتا کے لباس بشر میں آنے کو خلافِ عقیدہ سمجھتے ہوں گے کہ انھوں نے اس جگہ ایک شاعر کا ، جو رتن کا ساتھی ہے ، ذکر کیا ہے اور یہ نہیں کہا کہ دیوتا شاعر کے لباس میں آئے :

گفتہ راوی کہ عاشق بے ہوش
داشت با خویش فرد باد فروش
زد نفس در خطاب گندھرب سین
کاے ز عدل تو ملک یافتہ زین

دوسرا اختلاف اس جگہ پر ہے جہاں رتن سین اور پدماوت کا جہاز سندر دیوتا کے ناراض ہو جانے کے سبب سے غرق ہو جاتا ہے ۔ رتن اکیلا رہ جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس حال تباہ میں خود کشی کا ارتکاب کرے کہ اتنے میں سمندر دیوتا دوبارہ راضی ہو کر رتن کے پاس آتا ہے ۔ اسے خود کشی سے منع کرتا ہے اور اس کو کنارے تک پہنچا دیتا ہے ۔ پھر سمندر دیوتا کی لڑکی اسے

پدماوت تک لے جاتی ہے۔ عشرت اور ملک محمد جائسی دونوں کے ہاں یہ واقعہ اسی صورت میں ہے۔ چنانچہ جائسی کے الفاظ ہیں :

باورؔ اندھہ پیم کرٗ سنت لبدھہ بھا باٹ
نمکھہ ایک مہنہ لیئی کا پدماوت جیہ گھاٹ

[محبت کا دیوانہ اور اندھا وہ راجا سمندر کی بات سن کر للچا گیا اور راستہ پکڑا۔ سمندر ایک لمحہ بھر میں جہاں پدماوت تھی، وہاں راجا کو لے گیا]۔

رازی نے لکھا ہے کہ اتفاقاً رتن سین اور پدماوت کے تختے بہتے بہتے ایک ساحل پر آ لگے اور دونوں کا ملاپ ہو گیا۔[1]

رازی کی مثنوی پدماوت کے ستی ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور وہ علاؤالدین کو قلعے کے اندر داخل ہوتے ہوئے نہیں دکھاتے۔ رتن سین کی موت پر رازی کا یہ شعر، رتن کو حیاتِ جاوداں بخشنے کے لیے کافی ہے :

کرد نظارۂ پدم، جاں داد
جانِ شیریں برائے جاناں داد

غلام علی عشرت نے اپنی مثنوی کی بنیاد ملک محمد جائسی کی

۱۔ عبدالشکور بزمی کے ہاں بھی عشرت سے ملتا جلتا بیان ہے۔ بزمی نے پدماوت کے قصے کو ہندو دیومالائی فضا سے نکال کر اسے مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے رتن سین اور پدماوت کے ملاپ کا وسیلہ غیبی امداد کو قرار دیا ہے :

آں گہ بگفت ایزد پاک
برداشت سر فتادہ از خاک
فرمود بہ بند چشم، چوں بست
بنشاند بدوش بر یک دست

پدماوت پر رکھی ہے جو ۱۵۴۰ء میں بعہدِ شیر شاہ سوری تصنیف ہوئی ۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ نہ صرف اس کی کثیر التعداد اشاعتوں سے بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار تراجم سے بھی لگایا جا سکتا ہے ۔ ان سب کی تفصیل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب "ہندوستانی قصوں پر مشتمل اردو مثنویاں" میں درج کی ہے ۔ پدماوت سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی تصنیف کے اقتباس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کر دیے گئے ہیں ۔ اس جگہ میں ان مماثلتوں کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو جائسی کی پدماوت اور عشرت کی پدماوت میں موجود ہیں ۔

عشرت نے قصے کا پلاٹ اور واقعات کی دروبست بیشتر ملک محمد جائسی سے لی ہے ۔ کہیں کہیں تبدیلیاں بھی ہیں ۔ البتہ جائسی کے ہاں کینوس عشرت کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے ۔ علاوہ ازیں جائسی کے ہاں تہذیبی شعور پختہ اور وسیع تر مشاہدے پر مبنی ہے ۔ اس کے برعکس عشرت چیزوں کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں ۔ جزئیات بھی اس قدر واجبی ہیں کہ کسی واقعے یا منظر کا ایک خاکہ سا ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے ۔ لیکن جائسی اور عشرت کا مقابلہ بے معنی بات ہے کیونکہ دونوں نے الگ الگ زمانے اور الگ الگ تہذیبی ورثے پائے تھے ۔ اور پھر ہر عہد کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ۔ عشرت کے لیے جو کچھ ممکن تھا ، اس نے کیا ۔

عبرت اور عشرت کے کام میں یہ فرق ہے کہ عبرت نے رازی سے جو مضامین لیے ہیں انھیں جوں کا توں اپنے یہاں نہیں رکھا ، بلکہ رازی کو پڑھ کر وہی بات اپنے لفظوں میں کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن عشرت کے ہاں یہ بات نہیں ، عشرت نے جائسی سے

جو مضامین لیے ہیں انھیں بغیر کسی تبدیلی کے بھاکھا سے اردو میں منتقل کر دیا ہے ۔ اور یوں ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے عشرت ، جائسی سے ترجمہ کر رہے ہیں ۔ ایسے مقامات کتاب میں لا تعداد ہیں ۔ اس جگہ بطور نمونہ چند ایک کا حوالہ دیتا ہوں ۔

(۱) رتن سین ، سنگلدیپ یعنی پدماوت کے دیس میں پہنچ چکا ہے ۔ مندر میں عاشق اور معشوق کا آمنا سامنا ہو چکا ہے ، لیکن وصال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی ۔ تنگ آ کر رتن سین ایک دردناک خط پدماوت کو لکھتا ہے اور طوطے کے ذریعے روانہ کر دیتا ہے ۔ پدماوت جواب بھیجتی ہے ۔ عشرت کا بیان ملاحظہ فرمائیے :

کرے تیری ہی قسمت جب کہ تاخیر
تو پھر میری بھلا کیا اس میں تقصیر

کہ میں آئی وہاں پر اے پری وش
سو تو بس دیکھتے ہی ہو گیا غش

بہانے سے میں صندل بھی لگایا
پہ تجھ کو ہوش ذرہ بھی نہ آیا

جو تو اے کاش اس دم ہوتا ہشیار
گلے کا اپنے میں دیتی تجھے ہار

نہ غفلت میں ہوا مطلب کسی کا
مثل مشہور ہے سویا سو چوکا

لحاظ و شرم سے صد حیف ہیہات
اور اب میں کہہ نہیں سکتی ہوں کچھ بات

اب یہی بیان ملک محمد جائسی کی زبان سے سنیے ۔ آخر میں ترجمہ بھگوتی پرساد پانڈے کا درج کر رہا ہوں :

ہوں جولٹی سومنلپ بھوری
تھواں کس نہ گانٹھ تیں جوری

بھابسنبھار دیکھ کے نینا
سکھن لاج کا بولوں بینا

کھیلھہ مس میں چندن گھالا
مک جاگس تو دیوں جے مالا

تبہنہ نجاگا کا تو سوئی
جاگے بھینٹ نہ سوئے ہوئی

(میں نادان جب مہادیو کے مندر میں گئی تھی ، تبھی تم نے عقد گانٹھ کیوں نہیں بندھا لیا تھا ۔ نگاہیں ملتے ہی تم بے ہوش ہو گئے ۔ اس وقت سہیلیوں سے شرمائی ہوئی میں کیا بولتی ؟ کھیل کے بہانے میں نے صندل کے حروف لکھے کہ شاید تم بیدار ہو جاؤ تو میں جے مالا (ہار) ڈال دوں ۔ تب بھی بیدار نہ ہوئے بلکہ اور سو گئے ۔ بیداری میں ہی ملاقات ممکن ہے نہ کہ سوتے میں) ۔

(۲) رتن سین معہ جوگیوں کے گندھرب سین کے شہر میں گھس گیا ہے اور راجہ کے ملازمین انہیں چوری کے الزام میں گرفتار کر لیتے ہیں ۔ گندھرب سین برہمنوں سے جوگیوں کی سزا کے بارے میں مشورہ کرتا ہے :

عشرت

خبر جس وقت یہ راجہ نے پائی
غضب سے سن کے اس کو تپ چڑھ آئی

برہمن تھے کئی وہ جو مصاحب
تو یہ کہنے لگا ان سے کہ صاحب

کریں جوگی جو دزدی کا ارادہ
سزا ان تیرہ بختوں کی ہے پھر کیا

کہو اس کی جو کچھ ان کو سزا دوں
خیالِ دزدی کا ان کو سزا دوں

انھوں نے دیکھ دیکھ اپنی وہ تقویم
کہا یہ مسئلہ راجہ کو تعلیم

گدا سے ہو جو ایسا کام اظہار
تو پھر اس کی سزا ہیگی سزاوار

سو ان کو لے کے سولی پر چڑھا دو
سوا اس کے انھیں مت کچھ سزا دو

ملک محمد جائسی

راجیں سنا جوک گڑھ چڑھے
پونچھی پاس پنڈت جو پڑھے

جوگی گنڈھ جو سیندھ دے آوہنہ
کہہ سو سبد سدھ جس پاو ہنہ

کہن بید پڑھ پنڈت بیدی
جوگ بھنور جس حالت بھیدی

جیسے چور سیندھ سر میلہنہ
تس میں دوؤ جیو پر کھیلہنہ

پنتھ نہ چلہنہ بید جس لکھے
سرگ جائے سولی چڑھ سکھے

چور ہوئے سولی پرمو کھو
دیئی جو سولی تیہ نہنہ دو کھو

[راجہ گندھرب سین نے جو سنا کہ قلعے پر جوگیوں نے حملہ کیا ہے تو عالموں پنڈتوں سے فتویٰ طلب کیا کہ اگر جوگی لوگ قلعے میں نقب لگا کر گھس آئیں تو ان کو کیا سزا ملنی چاہیے ؟ اس کا مشورہ دو ۔ بید کے عالم پنڈتوں نے بید پڑھ کر کہا کہ جوگی سراغ لگانے میں کل مالتی کے بھنورے کی طرح ہوتے ہیں ۔ جس طرح چور نقب میں سر ڈالتے ہیں اسی طرح یہ دونوں جان پر کھیل جاتے ہیں ۔ بید میں لکھا ہے کہ وے راہِ راست پر نہیں چلتے ۔ سولی پر چڑھ کر آسمان جانا سیکھتے ہیں ۔ سولی پر ہی چور کی نجات ہے ۔ اسے جو سولی دے اسے گناہ نہیں]۔

مضامین کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جائسی اور عشرت کے ہاں بعض نمایاں اختلافات بھی نظر آتے ہیں ۔ عشرت نے جائسی کے قصے کی دیومالائی فضا کو کافی حد تک عام فہم بنا دیا ہے ۔ اس کے علاوہ بعض واقعات کا اضافہ اور بعض واقعات کی تبدیلی بھی دکھائی دیتی ہے ۔ مثال کے طور پر رتن سین اور پدماوت کی شادی پر کھانا کھانے سے پہلے رتن سین موسیقی کی طلب ظاہر کرتا ہے ، جسے وہاں کے پنڈت ایک فلسفیانہ تاویل سے ٹال دیتے ہیں ۔ پدماوت کے فارسی نسخوں میں مثلاً عاقل خاں رازی اور بزمی وغیرہ کے ہاں بھی یہ واقعہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے ، لیکن عشرت نے اس واقعے میں مزید اضافہ کیا ہے اور وہ یہ کہ رتن سین کو تو محل میں رسومات شادی ادا کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھیوں اور دوستوں کے لیے محفل موسیقی کا انتظام کر دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس موقع پر عشرت کی منظر نگاری دیدنی ہے اور موسیقی کی اصطلاحات پر ان کی غیر معمولی قدرت اور اس فن سے آگاہی قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے ۔ یہ عشرت کا قصے میں اپنی طرف سے ایک خوبصورت

اضافہ ہے -

قصے میں تبدیلی کی ایک اہم مثال راگھو کی رتن سین کے دربار سے روانگی کا موقع ہے - راگھو دربار سے جانے لگتا ہے تو پدماوت اس خوف سے کہ کہیں راگھو جیسا جہاں دیدہ آدمی ان پر کوئی مصیبت نازل نہ کردے، اسے خیرات کے بہانے سے دولت دے کر خوش کرنا چاہتی ہے اور اسے جھروکے کے پاس بلا کر ہاتھ کا "کنگن" دیتی ہے جس میں بیش بہا جواہر جڑے ہوئے ہیں - یاد رہے کہ دان دیتے ہوئے ہاتھ کا کنگن دینا راجاؤں کی روایت اور وضع داری کی دلیل ہے - ملک محمد جائسی کے علاوہ رازی اور بزمی بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن عشرت اس سے مختلف بیان دیتے ہیں - ان کے ہاں پدماوت کنگن کی بجائے پاؤں کی پازیب دیتی ہے - الفاظ ملاحظہ ہوں :

ملک محمد جائسی : کنگن ایک کر کاڑھ پوارا

(کلائی سے ایک کنگن نکالا اور پھینک دیا) -

رازی :

پرتو جلوۂ بر او انداخت
پارہ از دست خود فرو انداخت

عبدالشکور بزمی :

دستی سوی جیب خویش آورد
دستانہ کہ داشت پیش آورد

عشرت :

غرض کی اس پہ دل سے مہربانی
لگی کہنے بہ اشفاق نہانی !

یہ جو پازیب میری بے بہا ہے
جواہر اس میں لاکھوں کا لگا ہے
جہاں تیرے تئیں کچھ بے زری ہو
بہ قیمت اس کو دیجو جوہری کو

(۳)

عبرت اور عشرت کے سارے کام میں ایک خاص ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ کتاب کے تمام عنوانات میں سے ہر ایک کا پہلا شعر الگ کر لیجیے۔ یہ سب اکٹھے ہو کر ایک غزل بن جائیں گے جو پوری مثنوی کا خاکہ بھی ہوگا اور کلید بھی۔ اس طرح یہ غزل ایک ایسا رشتہ بن جاتی ہے جو عشرت اور عبرت کے دو مختلف شعری کارناموں کو ایک ہی تخلیقی وحدت بنا دیتا ہے اور پدماوت اردو کو ''تصنیفِ دو شاعر'' ہونے کے باوجود ''وحدتِ تاثر'' سے ہم کنار رکھتا ہے۔

(۴)

پدماوت کے بارے میں ایک مشہور بحث عرصے سے چلی آتی ہے۔ بعض مورخ اس داستان کو تاریخی دستاویز کے طور پر قبول کرتے ہیں اور بعض اسے محض افسانہ سمجھتے ہیں اور تاریخی ناموں کو ملک محمد جائسی کی تخلیقی شرارت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مجھے ملک محمد جائسی کے فن پر بحث نہیں کرنا، ویسے ذاتی طور پر میں دوسرے گروہ کے ساتھ ہوں۔ جو صاحبان اس بحث میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ مندرجہ ذیل دو کتابوں سے رجوع فرمائیں۔

(۱) ملک محمد جائسی : تصنیف سید کلب مصطفیٰ (بی۔ اے)
مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی ۱۹۳۱ء۔

(۲) افسانۂ پدمنی : تصنیف محمد احتشام الدین دہلوی ایم - اے (علیگ) مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۹ع -

(۵)

متن کی ترتیب اور تصحیح جن مختلف ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے ، ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) نسخۂ مطبع مصطفائی : مطبوعہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ع - سائز ۲۰ × ۲۶/۴ - تاریخ طباعت ۶ جمادی الاول ۱۲۶۵ع مطابق ۳۰ جنوری ۱۸۴۹ع - کل صفحات ۷۷ - کاغذ سفید - چار کالم - فی صفحہ اشعار قریباً ۶۲ - (عنوانات والے صفحوں پر اشعار کم ہیں) کل اشعار : ۴۳۷۱ - ان اشعار کی تعداد جو دوسرے نسخوں میں پائے جاتے ہیں اور اس میں نہیں ہیں ، بتیس ہے -

مطبع مصطفائی محلہ محمود نگر لکھنو میں بہ اہتمام محمد مصطفیٰ خاں ولد حاجی محمد روشن خاں مالک مطبع شائع ہوا - طباعت کی تاریخیں میر ناصر علی نصیر ، اشرف علی اشرف اور عبدالرحمن شاکر نے موزوں، کیں -

اس نسخے کا ناشر بھی اور طابع بھی مطبع مصطفائی ہے - مہتمم نے نسخے کی صحت کا دعویٰ ان الفاظ میں کیا ہے :

''جس جگہ کاتبوں سے کچھ رہ گیا تھا ، صحیح کیا اور ترکیب و بندش قدیم میں تصرف مناسب نہ جانا - اسے ویسا ہی رہنے دیا تاکہ اس زمانے کی زبان لوگوں کو معلوم رہے - کوئی روزمرۂ جدید نہ کہے -''

اس نسخے میں دوسرے نسخوں کی نسبت اشعار زیادہ ہیں اور متن کی صحت کے بارے میں بھی سوائے اس نسخے کے کسی پر اس قسم کی کوئی سند نظر نہیں آتی ۔ علاوہ ازیں تاریخِ طباعت کے اعتبار سے یہ نسخہ دستیاب نسخوں میں سب سے قدیم ہے ۔ لہٰذا اس بنا پر اس نسخے کو کتابہ کا بنیادی متن قرار دیا گیا ہے ۔ باقی نسخوں کے اختلافات حواشی میں واضح کیے گئے ہیں ۔

(۲) نسخۂ مطبع مصطفائی : مطبوعہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ع ۔

یہ نسخہ مطبع مصطفائی واقعہ محلہ پٹکاپور ، شہر کانپور میں طبع ہوا ۔ مطبع کے مالک مطبع مصطفائی لکھنو کے مہتمم محمد مصطفیٰ خاں کے بیٹے محمد عبدالواحد تھے ۔ اس نسخے کی طباعت تو مطبع مصطفائی میں ہی ہوئی لیکن ناشر اور تاجر ایک دوسرے شخص تھے جن کا نام خاتمۃ الطبع میں سید امداد علی بریلوی لکھا ہے ۔ اس نسخے کے کاتب اردو کے مشہور کلاسیکی شاعر امیر اللہ تسلیم ہیں جو اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے ۔ سائز ۱۲۶۵ھ والے ایڈیشن کے مطابق ہے ، متن بھی وہی ہے ، کہیں اختلاف نہیں اور صحت کتابہ کے بارے میں بھی ۱۲۶۵ھ کے ایڈیشن والے الفاظ ہی آخر میں دہرا دیے گئے ہیں ۔

(۳) نسخۂ مطبع لکھنو : سنہ ندارد ۔

سائز ۲۰ × ۲۶/ ۸ ۔ کاغذ سفید ۔ پیشانی کی عبارت ہے ۔

"بمنہ و کرمہ

پدماوت اردو

در مطبع لکھنو طبع شد"

نسخے پر سالِ طباعت درج نہیں - نہ ہی مطبع کی طرف سے خاتمتہ الطبع لکھا گیا ہے - ہر صفحے پر چار کالم ہیں - متن میں قریباً ۴۲ اشعار اور حاشیے پر ۱۷ اشعار ہیں - اس نسخے کے ساتھ نثری دیباچہ شامل نہیں -

یہ نسخہ باقی سارے نسخوں سے مختلف ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے شاید اپنی زندگی میں پدماوت کے دو مخطوطے چھوڑے ہوں گے ، جن میں سے ایک پر دوسرے تمام نسخے منحصر ہیں اور ایک پر یہ نسخہ انحصار کرتا ہے - اور غالباً یہ بات یوں بھی ممکن ہو سکتی ہے کہ مصنف نے تصنیفِ کتاب کے کچھ عرصے بعد اس پر نظرثانی کی ہوگی اور نظر ثانی شدہ نسخہ الگ مرتب کر دیا ہوگا - اس طرح دو نسخے مختلف Versions کے ساتھ موجود رہے - زیر نظر نسخے کے بارے میں وثوق کے ساتھ تو یہ بات نہیں کہی جا سکتی ، لیکن قرائن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ نظرثانی شدہ صورت پر مبنی ہے - اس خیال کو تقویت بعض الفاظ کی شکلوں سے بھی ملتی ہے جو نسخۂ مطبع لکھنو میں باقی تمام نسخوں کے مقابلے میں مختلف ہے - ان الفاظ میں متروک اور مروج کا فرق بھی نمایاں ہے - مثال کے طور پر :

نسخۂ مصطفائی ، نول کشور ، شیرانی ، ممتاز المطابع وغیرہ		نسخۂ مطبع لکھنو
آوے	=	آئے
لجام	=	لگام
طیار	=	تیار
وہاں یہ جانا	=	وہاں کا جانا
خاصہ	=	کھانا
بسا	=	بہت
ہوا سو اب تمھارا آخر انجام	=	ہوا یہ آپ کا آخر کو انجام
مخمل کے تئیں	=	مخمل کو بھی
سبوچہ	=	گھڑا
کچھ	=	ٹک
علاؤ الدین	=	علی الدین ۔
زبس	=	بہت

یہ چند ایک مثالیں ہیں ۔ اس قسم کے الفاظ بکثرت موجود ہیں ۔ نسخۂ مطبع لکھنو میں امالے کا التزام بھی نظر آتا ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ملتا ۔

عنوانات کی نثری عبارتیں اس نسخے میں نہیں ہیں ۔ زیبِ عنوان اشعار ، جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے ، اس نسخے میں بھی موجود ہیں ۔ کل صفحات ۲۷ ہیں ، آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

ہر اک صورت میں آ کر وہ لیا جلوہ دکھاتا ہے
کبھی یوسف ، کبھی لیلیٰ ، کبھی عذرا کہاتا ہے

اور خاتمہ اس پر ہے :

کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر
بلا شک جانے تصنیفِ دو شاعر

(۴) نسخہ ٔ ممتاز المطابع : سنہ ندارد

پیشانی کی لوح پر لکھا ہے : ''ممتاز المطابع دہلی میں بہ طبع مزین مقبول جہاں ہوا'' ۔ نثری دیباچہ موجود ہے ۔ سائز ۲۰ × ۲۶/۴ ۔ صفحات : ۸۸ ۔ چار کالم ہے ۔ با تصویر ہے اور سات دستی تصویریں مختلف عنوانات کے ساتھ شامل ہیں ۔

یہ نسخہ ناقص الآخر ہے ۔ آخری عنوان ہے :

''بھیجنا بادشاہ کا ایک عورت طرار کو چتوڑ کی طرف...''
اور آخری شعر ہے :

نہ سمجھو آشنا ، بیگانہ کی بات
نہ دل پر آنے دو باطل خیالات

نسخہ ٔ مصطفائی کے مطابق آخر میں تکمیل تک ۴۲۴ اشعار کم ہیں ۔ متن مطبع مصطفائی کے مطابق ہے ۔ کوئی نمایاں فرق نہیں ۔

(۵) نسخہ ٔ شیرانی : قلمی ۔ سنہ ندارد ۔

۲۵ اشعار فی صفحہ ۔ تین کالم ۔ خط شکستہ ناقص ۔ کاغذ سفید ۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں ۔ کل ورق ۸۵ ہیں ۔ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور مجموعہ ٔ شیرانی نمبر ۴۴۵ ۔ نثری دیباچہ بھی شامل ہے ۔

(٦) نسخۂ مطبع نول کشور : طباعت فروری ۱۸۸۵ع : مطبع منشی نول کشور واقع کانپور - کاتب محمد حسین عرف ممن - باتصویر ہے - تمام اشعار نسخۂ مطبع مصطفائی اور ممتاز المطابع کے مطابق ہیں - شروع میں نثری دیباچہ بھی موجود ہے -

یہ نسخے وہ ہیں جنھیں میں نے ترتیب کے دوران میں استعمال کیا ہے - ان کے علاوہ اس کتاب کے جن مختلف نسخوں کا مجھے علم ہو سکا ہے ، درج ذیل ہیں :

(۱) قلمی : سنہ کتابت ۱۲۳۵ھ کاتب نامعلوم
(۲) قلمی : سنہ کتابت ۱۲٦۳ھ کاتب جوگل کشور
(۳) قلمی : سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ کاتب ولی الدین
(۴) قلمی : سنہ کتابت ۱۲٦۴ھ کاتب محمد خان
(۵) قلمی : سنہ کتابت نام معلوم نا معلوم

(مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی بحوالہ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اول ، مرتبہ افسر امروہوی ، سرفراز علی دہلوی کراچی ۱۹٦۵ع) -

(٦) قلمی : سنہ کتابت ندارد کاتب نامعلوم
(مخزونہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ نشان نمبر ۷۵/۹۳۰) -
(۷) قلمی : سنہ کتابت ندارد کاتب نا معلوم
(مخزونہ لٹن لائبریری ، ذخیرۂ سر شاہ سلیمان) -
(۸) مطبوعہ ۱۹۴۰ع مطبع بھارت الیکٹرک پریس سہارن پور -
(بحوالہ دیباچہ طبقات الشعراء ، مرتبہ نثار احمد فاروقی ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور)

تنقیدی حصہ لکھنے کے دوران میں جو کتابیں میرے پیش نظر رہیں ، ان میں سے اہم کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہوں ۔ ممکن ہے اس موضوع پر مزید مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ فہرست سودمند ثابت ہو ۔

۱- شمع و پروانہ : تصنف عاقل خان رازی (۱۰۶۹ھ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (قلمی) ۔ مکتوبہ ۱۱۵۴ھ ۔

۲- قصہ رتن و پدم : تصنیف عبدالشکور بزمی (۱۰۲۸ھ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، قلمی ۔ مکتوبہ کاتک بکرماجیت ۱۸۸۲ ۔ بمطابق ۱۸۲۵ع ۔

۳- پدماوت بھاکھا : تصنیف جائسی ۔ مترجم بھگوتی پرساد پانڈے انوخ ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۔

۴- ملک محمد جائسی : تصنیف سید کلب مصطفیٰ ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ع ۔

۵- افسانہ پدمنی : تصنیف محمد احتشام الدین دہلوی ۔ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۹ع ۔

۶- یوسف زلیخا : تصنیف مولانا عبد الرحمن جامی ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۔

۷- نیرنگ عشق : تصنیف غنیمت کنجاہی ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۔

۸- میر حسن اور ان کا عہد : تصنیف ڈاکٹر وحید قریشی ، استقلال پریس لاہور -

۹- اخبار الصنادید : تصنیف نجم الغنی رام پوری ، نول کشور لکھنو ۱۹۱۸ء -

۱۰- Imperial Gazetteer of India, Vol. XXI
By Hunter,

۱۱- ہندوستانی قصوں پر مشتمل اردو مثنویاں : گوپی چند نارنگ -

مجلس ترقی ادب لاہور ،
۱۷- اپریل ۱۹٦۷ء

کوثر نوشاہی

نسخۂ پدماوت اردو

دیباچہ کتاب حمد و سپاس بے قیاس کا خاص بنام[1] اُس ناظم دیوانِ ایجاد و تکوین کے سزاوار ہے کہ قلم صنائع نگار بدائع طراز قدرتِ کاملۂ صنعتِ بالغہ جس کی سے، بند مسدسِ شش جہتِ عالم کا اوپر صفحۂ ظہور کے کس کس رنگینی سے نمودار ہے ۔ سبحان اللہ! ہر فرد انسان کے تئیں ارکانِ رباعی عناصر سے مرکب کر کے مطلع الانوار اپنا کیا، اور خلعت اشرف المخلوقات کا اوپر قامت ایک مشتِ خاک کے قطع کر کے، مقطع مخزنِ اسرارِ حقیقت کا بنایا ۔ اور درود نا محدود اوپر نام مقدس و مطہر و منور بادشاہِ کون و مکان، خلیفة الرحمن، سید سرور عالم یعنی احمد مجتبٰی محمد مصطفے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کہ براعت استہلال نسخۂ لولاک لما خلقت الافلاک کے واسطے ذات پاک والا صفات واجب التعظیم و التکریم ان کی ہے اور تحفہ سلام اور صلواۃ کا اوپر آل اطہار و اصحاب کبار کے کہ دوستی اور محبت ان کی معنی حدیث کسفینة نوح و اصحابی کالنجوم کی مانند خورشید جہان تاب کے افق دل ہائے مجنوں سے ساطع و لامع ہے، ہوجیو ۔

بعد اس کے سبب تالیف اور موجب تصنیف نسخۂ پدماوت کا اوپر فصیحانِ محفلِ سخن دانی اور بلیغانِ شیریں بزم معانی کے مخفی نہ رہے کہ بندہ ہیچمدان علم سخن سنجی اور سرگردانِ سرائے

۱- نسخۂ شیرانی : بنام خاص ۔

سہ پنجی خاکسارِ بے مقدار سید غلام علی مشہدی متخلص بہ عشرت ساکن بریلی ابجد خوانِ دبستانِ مرزا علی لطف صاحب سلمہ اللہ تعالی کہ ذات با برکات ان کی ذوق یاب شعر و شاعری کے کلام کرامت نظام مرزا رفیع السودا مرحوم و مغفور سے ہے ، بلکہ شاگردِ رشید ان کے ہیں - چند روز سے سن بارہ سو گیارہ میں درمیان شہر رام پور کے کہ نام خاص اس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا مصطفے آباد ہے ، بجہت الفت بعضے یاران نکتہ پرداز اور دوستان محرم راز کے وارد تھا ، بلکہ بیچ سرکار فیض آثار ، گوہر درج فتوت ، اختر برج مروت ، شوکت و شہامت پناہ ، حشمت و جلالت دستگاہ ، خانصاحب مشفق فیض رسان ، مظہر کرم والاحسان محمد عثمان خان[1] و احمد خان صاحب سلمہما الرحمن کہ خاندان عالی شان نواب معلیٰ القاب فیض اللہ خاں مرحوم مغفور کے سوائے رشتہ خواہر زادگی کے ، نسبت فرزندی کی بھی رکھتے ہیں ، سررشتہ روزگار کہ ہر دنیا دار کے تئیں جستجو اس کی ضرور ہے ، اور ہر باشندہ اس بازار کا لیل و نہار بفکر روزگار تکاپو میں مجبور ہے ، رکھتا تھا - اور ان کی بھی جیسے کہ سرداران عالی شان کو چاہیے شعر فہمی و معنی رسی ، جود وسخا و حلم و حیا اور قدردانی صاحب فن اہل شہر و غریب الوطن کے تھی ، چنانچہ بمقتضائے اشفاق بسیار و اخلاق بے شمار اپنے کے کہ خلق و کرم میں شہرۂ آفاق ہیں ، میرے تئیں بھی بیچ انیسانِ محفل مودت اور جلیسان بزم رفاقت کے جائے استقامت کی دی ہے - شب و روز ان کی بندگی میں تھا اور واسطے حظِ طبع ان کی کے غزلیات تازہ کہتا اور علاوہ سب دوستان انیس بزم موافقت اور محبان جلیس

۱- نسخۂ شیرانی : خان صاحب -

محفل مودت کے رابطہ الفت کا بیچ خدمت فیض درجت مولوی صاحب مشفق فیض رساں مظہر کرم و احسان مولوی قدرت اللہ صاحب کے زیادہ رکھتا تھا ۔ اور اکثر اوقات بیچ خدمت شریف اس مطرح تجلیات ایزد بیہمال اور مسند نشین فضل و کمال دینی و دنیوی کے، کہ ان کو بھی ذوق شعر و شاعری سے کمال ہے بلکہ تخلص بھی اپنا شوق فرماتے ہیں ، حاضر ہوتا ۔ اور خاص بعد نماز جمعہ متبرکہ کے ان کے مکانِ جنت نشان پر مشاعرے میں داخل ہو کر گلہائے غزلیات تازہ و شعر ہائے بلند آوازہ شعرائے شہر وغیرہ سے دامن گوش ہوش اپنے کو بھرتا اور خذف پارسائی فکر ناقص اپنے کو بھی مقابل جواہرِ زواہر آن جوہریانِ بازار سخن دانی کے کرتا ۔

چنانچہ ایک مجلس شاعری میں کہ شعرائے کہین و مہین بعد آئین رنگیں مشغول غزل خوانی کے تھے اور سامعینِ صغیر و کبیر سراپا گوش ، مصروف دریافت مضامین و معانی کے ، ہر ایک جوہری سخن ، درجِ دہان[1] اپنے سے گوہر آبدار و لولوئے شاہوارِ مضامین منسلک سلک اپنے کو ظاہر کرتا ۔ اور اس سے گوش معانی نیوش اہل سماعت کے تئیں دُررِ محرر صنائع بدائع لفظی اور معنوی سے بھرتا ۔

القصہ اس روز بعد غزل خوانی کے مولوی صاحب فیض رساں سلمہ الرحمن بکمالِ اشفاقِ مشفقانہ و بسیار اخلاق استاداللہ طرف اس غریب کے کہ شاگردی ان کے تلمیذانِ کرامت بیان کی فخر اپنا جانتا ہے ، متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ ایک فرمائش ہماری ہے ۔ اگر تم خوشی خاطر ہماری کو تکلیف اپنی پر مقدم رکھ کر اقبال اس کا کرو تو عین سلوک و احسان ہے ۔

۱۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : درجِ دہن ۔

میں نے عرض کیا ہر چند یہ ہیچمدان اس لائق تو[1] نہیں کہ کچھ کام آپ کا اس پر موقوف ہو، لیکن فرمائیے کہ فدوی فرمائش عالی کو[2] موجب سعادت دارین جان کر بجان و دل مصروف ہو۔

بارے مولوی صاحب موصوف نے طوطئ زبانِ شکر فشاں کو بیچ گلستان بیان کے یوں مترنم کیا اور شاہد صاف الضمیر محبت پذیر اپنے کو حجلۂ سینۂ گنجینہ سے نکال کر با صد زیور تقریر فصاحت آمیز و با ہزاراں لباس تحریر بلاغت انگیز، اوپر تخت مرصع کلام عشق التیام کے اس طور پر جلوہ نمائش کا دیا۔

"ایک عزیز پر تمیز جوان رعنا، یوسف مصر فصاحت و بلاغت ماہ کنعانِ رزانت و متانت بازیور علوم دینی آراستہ و با لباس قابلیت فنون دنیوی پیراستہ، نخلبند گلستانِ مضامین رنگین، چاشنی افزائے شکرستان لفظ و معنی شیریں، اختر برج سیادت، گوہر درج سعادت میر ضیاء الدین نام متخلص بہ عبرت متوطن شاہجہان آباد، خوش باش قصبۂ رام پور، ہمارے آشنا تھے۔ ازبسکہ علم تازہ اور طبع بلند آوازہ، زود رس، معانی فہم رکھتے تھے، گاہ گاہ مشق شعر کی بھی فرماتے تھے اور علم طبابت میں بھی گوئے سبقت از روئے تشخیص و معالجۂ برجستہ کے، میدان فیض شناسی اطبائے زمانہ سے لے گئے تھے اور مریضان مایوس زندگی کو نسخۂ حب الشفا اپنے سے بخوبی تمام حالتِ اصلی پر لاتے۔ چنانچہ وہ در یکتائے بحر سیادت و آشنائے دریائے نجابت، بیچ سلک رفقائے نجو خاں مرحوم کے ہم سلک ہو کر ہر خلوت و جلوت میں انیس و جلیس رہتے۔ بسکہ اس خانِ والا شان کو بھی شوق شعر خوانی و معنی رسی،

۱- نسخہ ممتاز المطابع و نسخہ نول کشور : 'تو' ندارد۔

۲- نسخہ ممتاز المطابع و نسخہ نول کشور : 'کو' ندارد۔

و زبان دانی کا زیادہ تھا ، یہ اکثر بپاس خاطر عاطر اس کی اشعار فارسی و ہندی کے کہتے ۔ علیٰ ہذا القیاس بفرمائش اس خلاصۂ دودمان حشمت و اجلال و مسند نشین چاربالش فضل و کمال کے انہوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی علیہ الرحمہ کا ہے ، زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا ۔ اور بمقدور اپنے کوئی دقیقہ شعر و شاعری کا فوت و فروگزاشت نہ کیا ۔

القصہ چہارم حصہ اس قصۂ غریب کا بہ نکات عجیب و لطیف و مضامین رنگین و دلفریب قلم معنی رقم اپنے سے یہاں تلک[1] تحریر و تسطیر کیا کہ راجہ رتن سین مالک چتوڑ کا شور انگیز عشق پدم اور شرر ریزی آتش محبت اس صنم کی سے بموجب اس شعر کے :

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حسن از درِ گوش
ز جاں آرام برباید ز دل ہوش

جوگی ہؤا ، اور صبحِ عیش شامِ غریب سے مبدل کرکے شہر اپنے سے ساتھ سولہ ہزار رفیق ہم پیالہ ، ہم نوالہ بعد قطع منازل بسیار وطے مراحل بے شمار ، وساطت اسی طوطئی شیریں مقال کی سے کہ موجب اس خانہ ویرانی اور باعث حیرانی و سرگردانی کی تھی ، مدت مدید و عرصۂ بعید میں بہرحال افتاں و خیزاں ، نواح شہر سنگلدیپ میں داخل ہو کر ایک پرستش گاہ میں کہ قریب باغ پدم کے تھی ، ڈیرہ کیا اور طوطی نے خبر راجہ رتن کی کہ جس جس رنج سے مع لشکر

۱۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور و نسخۂ شیرانی : تک ۔

سولہ ہزار جوگی کے آیا تھا ، ہدم کو پہنچائی اور کل گلستان زیبائی کو طرف اس بلبل شیدا بے وطن بطور معشوقوں کے کہ عاشق کو اپنے جمال سے خوش کرتے ہیں ، رغبت جانے کی دلوائی ۔ پس یہ حکایت نہایت کو پہنچی کہ میر ضیاء الدین عبرت کو مرض الموت ہوا اور ساتھ حسرت و غم ناتمامی اس داستان ندرت بیان کے دارالفنا سے دارالبقا کے قدم رنجہ فرمایا ۔ اب عرصہ سات آٹھ برس کا گزرا کہ کوئی موزوں طبع کچھ کچھ اپنے جی میں سمجھ کر واسطے تمام کرنے اس کلام درد التیام کے دست انداز نہ ہوا ۔ اور وہ صاحب فرمائش زبدۂ خوانین روزگار یعنی مجو خاں سپہ سالار بھی بیچ کارزار فرنگیان آتشبار کی رفاقت نواب غلام محمد خاں پسر نواب فیض اللہ خاں مرحوم مغفور میں کہ یہ جنگ سب پر اظہر من الشمس ہے ، بنام آوری تمام کام آیا ۔ مہربان من ! اب استدعا اور آرزو ہم مشتاقوں کی یہ ہے کہ بسبب فکر تمھارے کے یہ قصۂ عجیب و غریب باقی ماندہ بیچ سلک نظم آبدار کے آب و تاب انتظام کی پاوے اور ہر ایک مشتاق سیر اس گلستان مضامین اور معانی سے حظ وافر اٹھاوے ۔ نام تمھارا اور میر ضیاء الدین عبرت کا اوپر صفحۂ روزگار کے یادگار خرد و کلاں کا رہے ۔ اور روح ُپر فتوح اس غریق لجۂ معرفت یعنی میر ضیاء الدین عبرت کی بھی پیوند ہونے اس شاخ کلام کے سے کہ ایک مدت سے بے سر انجام ہے ، ثمرہ نہال خرمی کا پاوے ۔ اور واسطے سرسبزی اور شادابی شاخسار سخن تمھارے کے بیچ جناب نخل بند گلستان جہاں کے ہاتھ دعا کا اٹھاوے ۔"

الغرض ترغیب دینے مولوی صاحب سے اور بھی کرم فرما میرے چنانچہ مشفق و شفیق حافظ بڈھن صاحب متخلص بہ شیفتہ کہ سرآمد شعرائے ہندی و فارسی کے ہیں ، اور خلف الرشید ان کے معنی رقم

شیخ الاسلام ادہم و آشنائے بحر شریعت و طریقت مولوی غلام جیلانی رفعت ، و ہمت خاں ہمت و مرزا کرامت علی اکرم و عنبر شاہ رقم و معنی شگفتہ آشفتہ و یابندہ راز خفی و جلی شجاعت علی نسیم ، و کبیر خاں تسلیم ، و سید رفیع الدرجات عالی مرتبت ، نور چشم ضیاء الدین عبرت اور کئی آشنا مجوز اس کے ہوئے کہ نظم کرنا قصۂ باقی ماندہ کا عین صلاح ہے - اور انتظام اس کا تمھی سے خوب ہوگا - خوشی خاطر یاروں کو اوپر سب کاروبار کے مقدم رکھیے اور اس داستان نا تمام کو پورا جلد کیجیے -

اے یارانِ محرم راز و اے مشفقانِ بندہ نواز ! میں نے پاس خاطر مولوی قدرت اللہ شوق وغیرہ سے ، باقی ماندہ یہ قصۂ عجیب و غریب بکاوش بسیار و فکر بے شمار عرصۂ یک و نیم ماہ میں ساتھ اس جلدی کے کہ انصرام پانا اس کلام کا محال تھا ، تمام کیا اور منظور خاص و عام و جمہور انام کا ہوا - اور مادہ تاریخ اتمام یعنی خاتمۂ کلام کا سوائے الفاظ ''تصنیفِ دو شاعر'' کے بہتر نہ پایا - بلکہ یہ تاریخ ایسی مناسب اور انسب ہوئی کہ شعرائے شہر وغیرہ صغیر و کبیر کو رشک آیا اور سب نے متفق ہو کر فرمایا کہ یہ مادۂ تاریخ الہامِ غیبی ہے :

نظم

یہ کہہ کر مثنوی ، میں نے جو کی غور
کوئی تاریخ اس کی کہیے خوش طور
کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر
بلا شک جانے ''تصنیفِ دو شاعر''

۱۲۱۱ھ

سن بارہ سو گیارہ ہجری بے کم و کاست بر آئے ۔ اب تمھاری خدمت عالی میں یہ التماس ہے ، اگر بموجب اس کے کہ انسان خطا و نسیان سے ہے ، سہو یا خطا اس کلام درد التیام میں ہووے ، قلم عفو رقم اپنی سے اصلاح واجبی فرماؤ اور اگر ہمت بلند و طبع ارجمند تمھاری بمقتضائے نازک مزاج کے متقاضی اصلاح بخشی نہ ہو تو اوپر خطا اس خرد کے خردہ گیر نہ ہو کر از راہ بزرگ ہمتی اپنی کے دامن عفو سے چھپاؤ ۔

بیت

بقدر وسع در اصلاح کوشند
اگر اصلاح نتوانند ، پوشند

• • •

بیان وحدت الوجود اور حمد نامعدود رب المعبود کا

ہر اک صورت میں وہ آ کر نیا جلوہ دکھاتا ہے
کبھی یوسف ، کبھی لیلی ، کبھی عذرا کہاتا ہے

بتاؤں عشق کے کیا اب میں نیرنگ
جو دیکھا میں اسی نیرنگ کے رنگ

ز دریا موجِ گونا گوں برآمد
ز بیچونی برنگ چوں برآمد
گہے در کسوتِ لیلی فروکش
گہے بر صورتِ مجنوں برآمد
ازیں دریا بدیں امواج ہردم
ہزاراں گوہرِ مکنوں برآمد

کیا بے رنگی سے جب رنگ پیدا
ہوا نورِ محمدؐ تب ہویدا
ہوئی جب شکلِ احمدؐ آشکارا
ہوا آپ ہی خود اپنے پر پیارا
ہر اک عالم کو گوناگوں بنایا
وہ بیچون چگوں چوں میں در آیا

ہزاروں شان میں ہو کر وہ گذرا
کبھی وامق بنا وہ، گاہ عذرا[1]

کبھی بن شکل بلبل کی وہ نالاں
کبھی گل کو دیا چاکِ گریباں

کبھی شمعِ شبستاں وہ کہایا
کبھی پروانہ ہو دل کو جلایا

کوئی معشوق، کوئی عاشق بنایا
کوئی مطلوب، کوئی طالب کہایا

کوئی شبنم نمط ہے اشک افشاں
کوئی ہر صبح مثلِ گل ہے خنداں

کوئی ہے کشتۂ غم ہائے ہجراں
سراپا داغ، جوں سروِ چراغاں

کسی کے تئیں سکھایا غمزہ و ناز
کسی دل پر درِ غم کردیا باز

کوئی ہے وصل سے جاناں کے مسرور
کوئی دردِ جدائی سے ہے رنجور

کوئی چندر بدن کی طرح رنجور
کوئی مہیارہ[2] ساں جیتا ہے در گور

زلیخا کی طرح کوئی ہے نالاں
کوئی یوسف نمط قیدِ بزنداں

۱- نسخۂ لکھنؤ (سنہ ندارد) : ''کبھیں وامق کبھیں ہو مثل عذرا''
نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور میں یہ شعر نہیں ہے -

۲- نسخۂ لکھنؤ (س - ن) : ''کوئی مہیار ساں'' - چندربدن کی مناسبت سے 'مہیار' زیادہ قرین صحت ہے کہ مشہور عشقیہ داستان کے ہیرو اور ہیروئن ہیں - (مرتب)

کوئی مے سے جوانی کی ہے سرشار
کوئی ہے نشہ' الفت سے غمخوار
کسی کو مثل یوسف دیوے شاہی
کسی کو جوں زلیخا دے تباہی
کبھیں مثل ہدم کہلایا بھوگی
رتن بن کر ہوا کا ہے وہ جوگی
نہیں اس عشق سے بھی[1] پھر اسے کام
نہیں مطلوب اور طالب سے کچھ کام
نہ کعبے سے غرض نے[2] طالب دیر
ہے مقصد اس کو اپنے جلوے کی سیر
سبھی میں ہے پہ ہے سب سے جدا وہ
کہاتا ہے خدا ، کہ ناخدا وہ
خم وحدت کی مے کے ہیں یہ سب جوش
کہ کوئی ہوش میں ہے کوئی مدہوش
کبھیں فرحت ، کبھیں دل تنگیاں ہیں
اسی کی ساری یہ نیرنگیاں ہیں
وہی ہے سب میں جتنا ہے جز و کل
اسی کے عشق کا ہے ہر طرف غل
ہے ہر شکلوں میں اس کا ہی یہ مظہر
پر ان سب صورتوں سے ہے وہ باہر

۱- نسخہ' ممتاز المطابع و نسخہ' نول کشور : ہی -
۲- اصل : 'نہ' -

ہے سب کے پاس وہ اور سب سے ہے دور
ہے سب رنگوں میں دید اپنا ہی منظور[1]
وہ گاہے یار ہے اور گاہے[2] اغیار
وہی سمجھے جو ہو دانائے اسرار
وہ کس کس شان میں ہو کر ہویدا
وہ آپ ہی اپنے اوپر ہوئے شیدا
اسی اک ذات کی ہیں سینکڑوں شان
ہے جن کا مظہرِ کامل یہ انسان
ہر اک جا میں ہے گو اس کی جدا آن
ولے ہر آن میں ہے وہ 'کما کان'[3]
نہ کر اے طائرِ شوق آگے پرواز
نہیں ہے خوب کچھ افشائے ایں راز
یہ سب ظاہر ہیں اس کے عشق کے رنگ
پر اس جاگہ میں عقل و ہوش ہیں دنگ
ظہورِ عشق ہے سب جائے حسرت
ہے دال اس بات پر اب قولِ 'عبرت'

وہ بحرِ عشق کے طوفان میں ٹک جس کو بہاتا ہے[4]
حباب آسا اسے دم مارنا مشکل ہو جاتا ہے

۱۔ نسخہ لکھنؤ : "ہے سب آنکھوں میں دیدن ہائے مسطور"۔ نسخہ ممتاز المطابع و نسخہ نول کشور : سب رنگوں میں دیدن اپنا۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : وہ گاہے یار ہے گاہے وہ اغیار۔ نسخہ نول کشور : وہ گاہے یار اور گاہے ہے اغیار۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ میں یہ شعر نہیں ہے۔
۴۔ نسخہ لکھنؤ : جیسے وہ عشق کے دریائے پر طوفاں میں لاتا ہے۔

کشش سے دل کی یاں جو[1] آہ نکلے
بشکلِ مدِ بسم اللہ نکلے
کرے ہے آہ جس دم جانِ آگاہ
معاً[2] نکلے ہے اس کے منہ سے اللہ
رگِ بسمل تلک تو دیکھ جا کر
نکلتی ہے صدا اللہ اکبر
جہاں میں جو کوئی ہے ہوش پرداز
شکستِ[3] شیشہ کی سمجھے ہے آواز
وہی ہر فرد میں ہیگا نمایاں
برنگِ ذرۂ مہرِ درخشاں
وہی دیر و حرم میں جلوہ گر ہے
کہ ہر اک سنگ میں ایکی[4] شرر ہے
ہے اک شعلے سے اے شیخ و برہمن
چراغِ کعبہ و بت خانہ روشن
وہی اول ہے اور آخر وہی ہے
وہی باطن ہے اور ظاہر وہی ہے
بقولِ راسخِ آں شعلہ پرداز
نکلتی ہے کبابِ دل سے آواز

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : جویاں ۔
۲۔ نسخۂ مختار المطابع و نسخۂ نول کشور : صفا نکلے ہے ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ نول کشور : شکستہ شیشہ — موجودہ صورت زیادہ صحیح ہے ۔
۴۔ ''ایکی'' غالباً ''ایک ہی'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ نسخۂ لکھنؤ : کہ ہر یک سنگ کا وہ یک شرر ہے ۔

نمی دانم کہ دل با دوست گویاست
صدائے قلقل از مے یا ز میناست

ہر اک سالک ہے اس کی رہ میں خاموش
برنگِ آئینہ حیرت[1] ہم آغوش
ہیں اس کے عشق میں ارض و سما گم
ہوئے حیرت سے اس کے دست و پا گم
جنوں اس کا ہے ہر اک کا گلوگیر
رگِ گردن ہے دانا شکلِ زنجیر
اسی نے گل کے چہرے کو بتایا[2]
تماشے کے لیے بلبل بنایا
بظاہر چشم احول کی دوبیں ہے
مبصر کو تو فرق اس میں نہیں ہے
کہ اک عالم ہی وحدت دیکھتا ہے
تو اک عالم ہی[3] کثرت دیکھتا ہے
اسے کس طرح دیکھے چشمِ حیراں
ہے مثلِ جوہرِ آئینہ پنہاں
نظر میں راستاں کی دل بتاں کا
ہے سنگِ سرخ اس کے آستاں کا
دلِ عاشق جو ہے دن رات جلتا
یہ ہے روشن چراغ اس کے ہی گھر کا

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہر اک آئینۂ حیرت -
۲- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ نول کشور : بنایا -
۳- نسخۂ لکھنؤ : وہ اک عالم کی -

نہ کوئی فارق نہ کوئی مفروق ہیگا
وہی عاشق ، وہی معشوق ہیگا
خیال اس کا طرف کثرت کی آیا
بسانِ درد ہر دل میں سمایا
ہے وحدت پر دلیل اس کی یہ کثرت[1]
ہر اک سبزہ ہے انگشتِ شہادت
ہے اس کی بے مثالی پر یہی دال
کہ ہیں بے مثل اس کے جملہ افعال
توہّم سے ترے 'عبرت' وہ ہے پاک[2]
پیمبر نے کہا ہے "ما عرفناک"
الا اے شعلۂ عشقِ ستم گار
جلا دے شمع ساں اس دل کا زنّار
مسلماں ہو کے دل سے بہرِ حاجات[3]
پڑھوں سوزِ جگر سے اک مناجات

مناجات بیچ درگاہ مجیب الدعوات کے

جو کوئی طالبِ رفعت ہے نت[4] خورشید کے مانند
جنابِ کبریا میں عجز سے سر کو جھکاتا ہے

۱- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : بکثرت -
۲- نسخۂ لکھنؤ : عبرت کے - نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : ہے وہ پاک -
۳- نسخۂ لکھنؤ : بہر مناجات -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اب -

الٰہی شہرِ دل کو رکھ تو آباد
ہر اک میں ہو اسی کی شور و فریاد
دلِ سوزندہ دے داغوں سے مانوس
برنگِ جلوۂ پر ہائے طاؤس
لگادے صحنِ دل میں باغِ دلکش
کہ جیوں گلریز ہو ہر گل میں آتش
نسیم اس باغ کی ہو آہ سوزاں
بجائے سرو ہو سروِ چراغاں
نہایت سخت دل ہوں میں الٰہا!
نکال اب سنگ سے میرے تو[1] مینا
نگہ کی تیغ کا ہاتھ اک لگادے
شہید آسا اسے[2] خوں میں ڈبا دے
طپش سے عشق کی کر دل مرا نرم
رکھ[3] اشک خوں فشاں سے چہرے کو گرم
پنہا دل کو لباسِ اضطرابی
و لیکن ہووے رنگ[4] اس کا شہابی
نہ ہو محتاج چاک اس کا رفو کا
برنگِ گل نکلتا ہو بھبھوکا

۱- نسخۂ لکھنؤ : میرے تمنا ـ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : تو میرے ـ
۲- نسخۂ لکھنؤ : مجھے ـ
۳- نسخۂ لکھنؤ : کر ـ
۴- نسخۂ لکھنؤ : رنگ ہو اس کا ـ

عطا کر اشکِ دل کو بے قراری
برنگِ برقِ بارانِ بہاری

مرا دل عشق کے تپ سے جلا دے
برنگِ لعل انگارے بنا دے

وہ دل دے جو کہ را کب ہو فغاں کا
ہوائی سا[1] کرے سیر آسماں کا

وہ دل دے جو کہ پردیسی ہو بیزار
انار آسا ہو، فوّارہ شرربار[2]

وہ دل دے جو کہ ہو غارت گرِ ہوش
خمِ صہبا کی صورت سربسر جوش

وہ دل دے جو کہ ہر صورت سے گھبرائے
ذرا گرمی میں جیوں کافور اڑ جائے

وہ دل جو تاب و طاقت سے ہو آزاد
ستم پروردۂ چشمِ بلازاد

وہ دل جو رہنمائے کارواں ہو
جرس کی طرح لبریزِ فغاں ہو

وہ دل جس میں ہو علم شور تحصیل
قیامت ساز چوں صورِ سرافیل

وہ دل جس میں ہو اک غوغائے محشر
بلا انگیز جوں صحرائے محشر

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہوا آسا۔
۲۔ یہ اور اس سے اگلے دو اشعار نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہیں۔

کہوں کیا یہ مجھے تو یا کہ وہ دے
مرے صاحب! رضا تیری ہو سو دے[1]

کرم اور لطف سے اے صاحبِ داد
مجھے قیدِ تعیّن سے کر آزاد

تہی جیوں نے تو کر دل سب سے میرا[2]
بھرا ہو ایک اس میں شور تیرا

کہ تا سب یہ[3] خیالِ چشم و ابرو
ہو جاویں لا[4] برنگِ شاخِ آہو

جو ہووے بندِ پا زلفِ گرہ گیر
نکل جاؤں میں جوں آوازِ زنجیر

الا اے رنگ ریزِ عارضِ گل
اثر بخشِ دلِ پُر شورِ بلبل

محبت اپنی تو مجھ کو عطا کر
مرا حامی محمدؐ مصطفٰی کر

نعت سرور کائنات علیہ التسلیمات کی

وہ ہے جوں بیضۂ خورشید زیبِ گنبدِ گردوں
نبیؐ کے کفشِ پا کی خاک سے جس سر کو ناتا ہے

محمدؐ کا زباں پر نام آیا
قلم نے سر کو سجدے میں جھکایا

۱- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : (دوسرے مصرعے میں) رضا تیری ہو جو دے۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : تہی ہر چیز سے کر دل تو میرا۔
۳- نسخۂ نول کشور : یہ سب۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : وہ ہو جاویں۔

محمدؐ کا جو شیریں نام لکھا
مٹھائی سے قلم کا ہونٹ چپکا
یہ جو کچھ سامنے ارض و سما ہے
سب اس کی ذات سے پیدا ہوا ہے
نمک اس کا نہ ہوتا آب و گل میں
تو کب ایسا یہ ہوتا شور دل میں
ہوا قبلِ ولادت کل[1] میں غوغا
برنگِ مہر قربِ صبح اس کا
جہاں سے کفر کی ظلمت ہوئی دور
زمین و آسماں پر چھا گیا نور
سرِ لات و منات آپس میں ٹوٹے
زمیں پر گر پڑے جوں قفل جھوٹے
محمدؐ سرورِ دنیا و دیں ہے
محمدؐ رحمۃ للعالمیں ہے
شعاعی خط ہے خورشید آسماں کا
ہوا جاروب کش اس آستاں کا
شفاعت کو جو لب اپنے وہ کھولے
تو رحمت دوڑ کر لبیک[2] بولے
ہے عصیاں سے یہ امت گو سیہ مست
نہیں کچھ خوف، شافع ہے زبردست[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : جگ میں ۔
۲- نسخۂ لکھنو و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : حاضر ہو بولے ۔
۳- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے ۔

کہوں معراج کے کیا راز کی بات
ہے جیوں شق القمر اعجاز کی بات

یقیں پہنچا پیمبر بارگہ میں
نہ تھی حائل کوئی شے اس کی رہ میں

یہ نزدِ مذہبِ حکمائے ناپاک
نہیں ہے التیام و خرقِ افلاک[1]

تحیّر ہے، ہر اک ہے شبہہ کرتا
کہ کیونکر گنبدِ بے در سے گزرا[2]

نہ تھا اس مہر کا سایہ زمیں پر
سراپا نور تھا جسمِ مطہّر[3]

لطیف و پاک وہ جانِ جہاں تھا
برنگِ شیشہ شفّاف آسماں تھا[4]

اسی تن سے ہوا وہ عرش پیما
نظر جس طرح عینک سے نکل جائے

صفت اس کی کہے، مقدور کس کا
خدا مداح 'عبرت' ہووے جس کا

کہاں اس کی صفت ہووے کما ھی
جو کوئی ہووے معشوقِ الٰہی

۱- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے -
۲- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے -
۳- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے -
۴- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے -

تو کہہ کر اس پر صلی اللہ و سلم
سب اس کی آل اصحابوں پہ پیہم[۱]
یہ حالِ راز تو اپنا دکھا کر
جناب اس کی میں عرضِ مدّعا کر
کہ اے مقبولِ درگاہِ الٰہی
ہے تیرے نام سب عالم کی شاہی
بسانِ ذاتِ پاکِ حق تعالیٰ
ترا ثانی بھی عالم میں نہ پایا
کیا حق نے تجھے ختمِ رسالت
سند پر ہے تری مُہرِ نبوت
تو آیا اور دیں سب کے گئے دور[۲]
خطِ بے مہر کب ہوتا ہے منظور
ترے تابع ہیں سب پیغمبرِ پاک
ترے سر پر ہے زیبا چترِ لولاک
مدینے کو مرا دل نت ہے چلتا
برنگِ مہر ہے مغرب کو ڈھلتا[۳]
کہ یثرب کی ہوا سے ہو کے دمساز
کروں بے بال و پر جوں شعلہ پرواز
رسائی میں ولیکن منفعل ہوں
تعلق سے میں شاہا ! پا بگل ہوں

۱۔ یہ شعر اور اس سے اگلے تین اشعار نسخہ لکھنؤ میں نہیں ہیں ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : تو آیا ، دین اور سب ہوگئے دور ۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ میں یہ شعر اور اس سے آگلے چھ اشعار نہیں ہیں ۔
نسخہ نول کشور : ہے مغرب کو ۔

توجہ سے بنا اسباب میرا
کہ دیکھوں آستانِ پاک تیرا
کروں آنکھوں کا سرمہ گرد واں کی
کروں مژگاں سے جاروب اس مکاں کی
اسی قدموں تلے باچشمِ نم‌ناک
بسانِ آب ہو جاؤں تہِ خاک
قیامت کی کہوں آگے ہے کیا بات
اٹھوں گا عاقبت نعلین کے ساتھ
الا اے واقفِ اسرارِ مخفی
عطا کر عشق کی دل کو تجلّی
جو شوقِ ذوق ہو تحصیلِ حاصل
کروں مدح و ثنائے پیرِ کامل[1]

تعریف پیر طریقت مآب ، حقیقت انتساب کی[2]

کروں تعریف میں پیر طریقت کی کہ اے عبرت
جہاں میں فیض جس کی ذات سے ہر ایک پاتا ہے

سر و سرخیلِ مقبولانِ درگاہ
ہے اپنے عصر کا سیّد حسن شاہ
جہاں پر نام وہ مذکور ہووے
زباں جیوں برگِ نخلِ طور ہووے
شریعت کی طریقت پر رواں ہے
حقیقت کا دم اس کا نردباں ہے

۱- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہے -
۲- یہ تمام شعر نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہیں -

کمال اس ذات سے یوں ہے آبلتا
کہ جیسے جوش مارے خم میں صہبا
جو کوئی دل سے اس کے سامنے آئے
وہیں وہ مشتِ خاک اکسیر ہو جائے
بدل جاوے خواصِ زہرِ ناپاک
نظر اس کی کرے افیوں کو تریاک
ہجوم اس آستاں پر مردمک کا
نہ ہو کیونکر کہ ہے وہ خرد مکا
سیادت نام سے اس کے مبین
جلادت شان سے اس کی مزین
وہاں ہر مردہ دل ہے زندہ ہوتا
عیاں اس دم سے ہے شانِ مسیحا
غرض اک آیتِ حق الیقیں ہے
پیمبر کی طرف سے یاں امیں ہے
یہ سب ارض و سما ہے فرش اس کا
کہ پایہ اس کا پایہ عرش ہیگا

بیان اوصاف حمیدہ استاد معنی ایجاد مجمع فضیلت و ارشاد کا[1]

لکھوں اب وصف میں استاد عالی ذات اپنے کا
کہ شعر و شاعری کے فن میں جو یکتا کہاتا ہے
مضامیں کس طرح کرتا میں ایجاد
نہ ہوتا گر 'محبت خاں' سا استاد

۱- نسخۂ لکھنؤ میں یہ اشعار بھی نہیں ہیں۔

کہوں کیسا وہ نوابِ زماں ہے
قلم آسا سراسر نکتہ داں ہے
اصول و منطق اس کی ہیں زباں پر
ہے فنِ شعر اس کا ادنیٰ جوہر
سخن کے سقم کا ہے وہ فلاطوں
کہ اس کے ہاتھ میں ہے نبضِ مضموں
فلک نے اس کو یاں آتے جو دیکھا
فلاطوں کو وہیں خم میں چھپایا
دلی استادوں کے ہوں ہرچند عالی[1]
ہے اس کے آگے جیوں مینائے خالی
ہر لنگِ نغمہ جو مضموں رسا ہے
وہ اس کے تار مسطر میں چھپا ہے
ہر اک مضمون رنگیں بیش و کم سے
وہ لکھتا ہے رگِ گل کے قلم سے
کرے اصلاح یاں تک وہ سخن کو
کہ معنی آپ ہوویں آفریں کو
کرے ہے شانہ ساں با ذہن واقی
سدا زلفِ سخن کی موشگافی
غزل کے اس کی مطلع کو نظر کر
خجل ہے مطلعِ خورشیدِ انور
وہ بھر کر لفظ میں مضمون رنگیں
کرے ہے منتظم جیوں عقدِ پرویں

۱- نسخۂ نول کشور : حالی -

رباعی کے مصارع سب برابر
بٹھاتا ہے برنگِ چار عنصر
یہاں تک قطعہ کو دیتا ہے تزئیں
کہ[1] ہو جاتا ہے رشکِ قطعہ٭ چیں
سراپا نثر اس عالی بیاں کی
ہے گویا نسرِ طائر آسماں کی
دکھائی دے ہے جو دنیا میں صہبا
عیاں الفاظ سے مضموں ہے اس کا
دلِ باز و دو چشم اس کی ہیں 'عبرت'
سخاوت اور شجاعت اور مروّت
خدا اس کو رکھے دل شاد دائم
بحقِ پنج تن پاکِ معظّم[2]

مشک بیزی خامہ٭ بلدرت بیان کی، بیچ مدح نواب فیض اللہ خاں کے[3]

مجھے لازم ہے وصفِ صاحبِ دوراں لکھوں اس دم
کہ جس کی ذات سے آج ایک عالم فیض پاتا ہے

لکھوں اب مدح فیّاضِ زماں کی
خدیوِ عصر فیض اللہ خاں کی

۱- نسخہ٭ نول کشور : ہو جاتا ہے۔
۲- تمام نسخوں میں 'پاکِ معظم' ہے۔ شاید اصل میں 'پاک و معظم' ہو کہ زیادہ قرینِ صحت ہے۔
۳- یہ مدح نسخہ٭ لکھنؤ میں نہیں ہے۔

کہاں ایسا جواں ہوتا ہے پیدا
کہ لو کر ہینگے جس کے زہد و تقویٰ

بہ تدبیر و بخُلق و قدردانی
زمانے کا ہے عالمگیر ثانی

نہیں کوئی عمل میں اس کے قزاک[1]
بغیر از غمزۂ چشمِ ستم ناک

نہیں ہے عہد میں اس کے کوئی یاں
دلِ عاشق سوا زنہار نالاں

تواضع عہد میں اس کے ہے ہر جا
قدح پر منہ جھکاتا ہیگا مینا

نسق سے اس کے کیا مقدور ہیگا
جو ماہی کو گلا دے جوشِ دریا

جو ہووے باز خونِ بط کے درپے
بط اس کا ہوش اڑاوے جوں بطِ مے

عوض لے باز سے روئے ہوا پر
لگایا[2] تیر میں سرخاب کا پر

طبیبِ اس کے عمل میں ہیں جو ہر سو
بضد کرتے ہیں بیماری کی دارو

جسے بیماریِ داء الاسد ہو
کرے روباہ تربک نفع اس کو

۱۔ غالباً 'ستم ناک' کی رعایت سے قزاق کو قزاک لکھا ہے ۔ عمل بمعنی عملداری ۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عملداری یعنی حکومت میں کوئی لٹیرا یا رہزن نہیں ۔

۲۔ نسخۂ نول کشور : لگا دے ۔

ہے بندوبست سے اس کے نمایاں
کہ واں ہوتا ہے کمتر پھوٹ دہقاں
کیا ہے متفق ہر ایک شے کو
لگاتے بٹے ہیں پھوٹے روپے کو
کسی کا بھی عمل دیکھا ہے ایسا ؟
کہ نت بے دست و پا چلتا ہے پیسا
میں اس کی خوبیاں کیا کیا بتاؤں
غزل اک فارسی کی پڑھ سناؤں

غزل فارسی[1]

چوں در ہیجا کفِ خنجر گرفتہ
عدو دستِ امان بر سر گرفتہ
چسان خیزد صدا از زخمیٔ او
کہ آبِ تیغِ حلقش در گرفتہ
ہمای شوکتِ او آسمان را
بسانِ بیضہ زیرِ پر گرفتہ
گدا از فیضِ او در کاسۂ خود
صدف آسا ہمہ گوہر گرفتہ
توان گفتن چون گردوں سایۂ او
کہ بر فرقِ کہ و مہتر گرفتہ
برنگِ آئینہ طبعِ صفایش
نہاں در پردۂ جوہر گرفتہ

۱۔ نسخۂ لکھنؤ میں یہ غزل نہیں ہے ۔

بسانِ آفتابِ عالم افروز
دلش 'عبرت' بکف ساغر گرفتہ

بیانِ سخاوت و شجاعت نواب ممدوح کا[1]

سخاوت اور شجاعت کا بیاں اس کی کروں کیا میں
کہ حاتم وقت اور رستم زمانے کا کہاتا ہے

زہے نوباوۂ باغِ جوانی
چمن آرائے سروِ زندگانی
نہایت دور ہے دانا و ہشیار
سراپا نکتہ داں جوں چشم دلدار
برنگِ قدِ مہ رویانِ طنّاز
ہر جا راستی میں ہے وہ ممتاز
عیاں تمکیں سے اس کے ہوش ہیکا[2]
کہ حرف آسا ہے وہ خاموش گویا
چھپا ہے اس کے دل میں جوشِ معنی
وہ مثلِ لفظ ہے سرہوشِ معنی
کمال اس ذات سے ہے یوں مبین
تہِ فانوس جیسے شمعِ روشن
رہے کیونکر نہ اس کا ہاتھ خالی
کہ ہے رسم اس کی بخشش کی نرالی
صدف مانگو تو موتی جھیل بخشے
جو بکری مانگے اس کو فیل بخشے

۱۔ یہ اشعار نسخۂ لکھنؤ میں نہیں ہیں ۔
۲۔ نسخۂ نول کشور : سب کا ۔

نہ ہووے خرچ تو بھی خانِ ساماں
نہیں ممکن کہ بولے "کچھ نہیں ہاں"
روپے کے کیسے کو پہلے کیا عام
کوئی توڑے وہاں لیتا نہیں نام
اگر تلوار کو اس کی کہوں برق
نہیں زنہار اس تشبیہ میں فرق
کہ جس رن میں وہ شکل اپنی دکھاوے
ہزاروں دل کو بادل سا رولاوے
جو بھر ضرب ہاتھ اس کا بلند آئے
نظر میں سب کی بجلی سی چمک جائے
عدو کے سر پہ بیٹھے اس کا جب وار
تو کاٹ اس کو زمیں کے نکلے اس پار
عدو کے دل میں لوہو کیوں نہ ہو خشک
کہ سکڑا ڈر سے ہے جوں نافۂ مشک
چڑھے کیا چرخ پر وہ تیغ جوں برق
کہ نت رہتی ہے وہ خود کاٹ میں غرق
ہوا کیا خاک کھاوے اس کا بسمل
کہ جیوں آتش ہے پانی اس کا قاتل
عدو کی فوج کو کر ہووے غوغا
وہ نکلے غول سے جب یکہ تنہا
وہیں ہیبت سے اس کی بھاگیں سارے
کہ جیوں خورشیدِ تاباں سے ستارے
نہیں بھاگے عدو کے پیچھے جاتا
وہ عاجز کو نہیں ہرگز ستاتا

کرے گا قتل کا اس کو اشارہ
خدا نے جس کسی کو ہووے مارا
بہادر کا نہیں ہے نام تلوار
عدو کیوں سن کے کٹ جاتا ہے ہر بار
کسی نے ایسا دیکھا ہے اولو العزم ؟
کہ جانے رزم کو سمجھے ہے لت بزم
بڑا کیونکر نہ ہو اس کا ارادہ
کبیر الشیخ ہووے جس کا دادا
نبی کی حب بہ نام اس کا ہے برہان
کہ کہتے ہیں غلامِ مصطفیٰ خاں
علی کا اسم ہے ازبسکہ اوراد
ہے اس کا کشورِ دل حیدر آباد
حسن کا عشق یوں اس دل میں چمکا
کہ جیسے لعل پر خورشید جھمکا
بحقِ حضرتِ خاتونِ عالم
نہ ہووے اس کو جز شبیر کا[1] غم
رہیں فضلِ خدا سے اس کے یاور
علیؓ و فاطمہؓ ، شبیرؓ و شبرؓ

تعریف قلم سحر کار عجوبہ نگار کی

لکھوں کیونکر نہ وصف اپنے قلم کا میں کہ زوروں سے[2]
تہمتن کی طرح مضمونِ سرکش باندھ لاتا ہے

۱- نسخہ نول کشور : شبیرؓ کے -
۲- نسخہ لکھنؤ : اوروں سے -

جو کوئی معنی کی صورت بتاوے[1]
وہ میرے اس قلم کے پاس آوے
کہ علم سیمیا ہے اس کا ایجاد
وہ فن شعر میں ہے سب کا استاد
جو آوے موج میں وہ سحر پیوند
کرے کاغذ پہ بحر شعر پربند
صریر اس کے میں مجنوں کی نوا ہے
کہ وہ صحرائے دل سے آشنا ہے
کرے مجنوں کا گر احوال تحریر
بنے ہر سطر کاغذ شکل زنجیر
بناوے کوہ کے بھی دل میں رستہ
ہے وہ فرہاد کے تیشے کا دستہ
جو کالی پیکی[2] صورت لہر مارے
سر شک زلف کا نقشہ اتارے
اگر باموں کا باندھے نقش باہم
ہر اک الفاظ میں ہو رعب ضیغم
غرض عالی طبیعت کا عصا ہے
ہر اک ذی ہوش کا وہ رہنما ہے

سوال کرنا قلم نزاکت رقم سے واسطے تالیف اس قصۂ لطیف کے

خطاب[3] اپنے قلم سے اب میں کرتا ہوں کہ دل مجھ کو
طراز داستان عشق کی رغبت دلاتا ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ : نہ پاوے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کالی نے کی صورت - نسخۂ شیرانی : کالی تہہ کی صورت -
۳- نسخۂ نول کشور : جواب -

جو دیکھی میں نے اس کی رائے صائب
کہا اپنے قلم سے ہو مخاطب
کہ اے مسند نشینِ نکتہ دانی
ترے محکوم ہیں اہلِ معانی
جہاں میں تجھ سے ہے اشراق ایجاد
فلاطوں کا تو حکمت میں ہے استاد
نہایت تجھ میں ہے عقل و کرامات
عجب ہوتے ہیں تجھ سے خرقِ عادات
ہے سب احوال دل کا تجھ پہ معلوم
تو بن پوچھے کرے ہے بات مفہوم
ہے دل میں، تاکہ میں ہو کر نواساز
نکالوں پردۂ دل سے اک آواز
برائے[1] خاطرِ یارانِ بے کیں
لکھوں اک داستانِ شوخ و رنگیں
کروں خورشید ساں طبع آزمائی
سیاہی کی بناؤں روشنائی
لکھوں خطِ شعاعی مثلِ گردوں
بیاضِ روئے کاغذ صبحِ گردوں
بدل شنگرف کی رنگِ شفق ہو
گلستاں کا نمونہ ہر ورق ہو
خموش الفاظ ہوں چوں غنچۂ گل
معانی میں چھپا ہو شورِ بلبل

۱۔ نسخۂ اول کشور و نسخۂ شیرانی: ہوائے۔

لکھی صفحے پہ ہو[1] ہر فردِ دلجو
صحیح و خوشنما جوں بیت ابرو
کشش ہر حرف کی دلچسپ تر ہو
جو مد اس پر ہو، سو مدِّ نظر ہو
کہیں زیر و زبر جو پیش آ جائے
مژہ کے مو سے بھی زیبا وہ دکھلائے
جو ہو تشدید سطروں کی نمودار
خجل ہو شانۂ گیسوئے دلدار
ہو نقطہ اس کا ہر جانب کشاں دل[2]
بیاضِ چشم میں سرمے کا جوں تل
غرض مثلِ خطِ خوبانِ رعنا
بناؤں میں رخِ کاغذ کا انشا
کرے وہ چہچہے جوں بلبلِ زار
نظر آوے جسے یہ خطِ گلزار
صلاحاً لیک میں پوچھوں ہوں تجھ کو
کہ کرتا ہوں بیانِ عشقِ ہندو
کہے کوئی کہ 'عبرت' سا مسلماں
ہوا ہے عشقِ کافر سے سخن راں
جوابِ معترض مجھ کو بتا دے
مرے دل سے یہ شبہہ تو مٹا دے

۱- نسخۂ لکھنؤ : لکھی صفحہ پر ہو ــ نسخۂ نول کشور : لکھی ہو صفحہ پر ۔

۲- نسخۂ لکھنؤ : ہوں لفظ اس کے بہر جانب کشاں دل ۔

جواب تشفی مآب قلم کا

جواب ِ پختہ و معقول دے کر اب مرا خامہ
سخن کی طی ِ منزل میں مجھے ڈھارس بندھاتا ہے

قلم بولا کہ اے سرمایۂ عقل
تو جس قصے کو چاہے کر وہی نقل
کہ عشق آزاد ہیگا کفر و دیں سے
نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
وہ ان دونوں ہی عالم سے ہے آزاد
کرے ہے کفر و دیں دونوں کو برباد
جو پیش آوے اسے مردود و مقبول
اڑا دیتا ہے ظالم دونوں کی دھول
نہیں کچھ مانتا عشق ِ ستم کار
کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنّار
مسلماں ، کافر اس سے سب ہیں مجبور
حقیقت شیخ صنعاں کی ہے مشہور
نہیں خاطر میں لاتا عشق سر کش
کہ ہیں کیا خاک و آب و باد و آتش
جسے لیرنگ اپنا وہ دکھاوے
وہیں رنگ اس کے چہرے کا اڑاوے[1]
گدا و شہ نہیں گنتا وہ موجود
وہ دونوں کے نکالے مغز سے دود

---

۱ - نسخۂ لکھنؤ میں اس کے بعد آٹھ اشعار نہیں ہیں ۔

اسے معشوق و عاشق کا نہیں غم
وہ دونوں کو کرے رسوائے عالم
نہ اک بلبل ہی کو رکھتا ہے غمناک
کرے ہے گل کے بھی سینے کو صدچاک
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جس دم
جلا دے شمع پروانے کو باہم
نہایت وہ کرے جس شخص کو پیار
اُسے دم لینا ہو جاتا ہے دشوار
بھلے ساولت سے وہ منہ نہ موڑے
نہ مارے جب تلک اس کو نہ چھوڑے
حقیقی عشق ہو وے یا مجازی
کریں ہیں دونوں سر کے ساتھ بازی
'سنی اے قبلہ' امید 'عبرت' !
جنابِ عشق کی تو نے حقیقت ؟
جہانِ عشق میں جو رسم و دیں ہے
معافِ حضرتِ شاہِ مبیں ہے
کرے گا اعتراض اس میں جو بے جا
جنابِ عشق کا مردود ہو گا
جو کچھ آتا ہے تیرے جی میں اے یار !
شتابی کہہ، میں ہوں لکھنے کو تیار
قلم نے جب مجھے ڈھارس بندھایا
سخن کے گھر فراغت سے میں آیا
سخن لیکن دلوں میں تب کرے گھر
معاون ہوں جو اللہ و پیمبر

وصفِ ہندوستان جنت نشان اور عذر مصنف اس داستانِ ندرت بیان کا

سخن کی بزم میں عبرت مخاطب دل سے اپنا ہو کر حکایت شمع و پروانے کی سامع کو سناتا ہے[1]

برنگ صبح اے دل واہ شاباش!
جراحت پر تو اپنی ہے نمک پاش
نہیں دیکھا میانِ شہر و بازار
متاعِ درد کا تجھ سا خریدار
جہاں تک پائی جنسِ بے قراری
فلک نے آکے تیرے سر سے ماری
سدا رکھتا ہے تو راحت فراموش
پریشانی کو مثلِ زلف بر دوش
سمندر تیرا ہمسر ہووے کیونکر
تو ہیگا آتشِ غم کا سمندر
عجب صورت ہے تیری چشم بددور
ہزاروں آبلے جیوں نخلِ انگور
میں غم خواری تری میں اے دلِ زار
تڑپتا ہوں سدا جیوں نبضِ بیمار
میں اور تو دونوں ڈوبے خوں میں صد حیف
گل و غنچہ کی صورت بے کم و کیف
مرض میں تیرے بھی ہو جو گرفتار
کہ ہو بیمار دار آخر کو بیمار

۱- نسخۂ شیرانی : مصرعہ ندارد -

نہ مجھ کو چین ہے نے تجھ کو ہے خواب
پتنگ و شمع ساں ہیں دونوں بیتاب
کہوں اک قصہ تا یہ درد بٹ جائے
کہیں باتوں میں غم کی رات کٹ جائے
و لیکن قصہ کہتا ہوں وطن کا
کہ ہوں میں عندلیب اپنے چمن کا
سوادِ ہند کو اے مونسِ جاں
بناؤں سرمۂ چشمِ صفاہاں
کروں ہندوستاں کا عشق مرقوم
مچے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
کہ شورِ عشق ہندی تیز تر ہے
عرب کے عشق سے خونریز تر ہے
عجم میں ہند کا ہے عشق خونخوار
قیامت ہند کی کاٹے ہے تلوار
ہے شعلہ عشق ہندی کا شرر ریز
کہ پھیکا آفتاب اس جا نپٹ تیز
لکھوں ہندوستاں کی گر میں تعریف
تو دفتر ہو جدا اک اور تصنیف
نہایت طول یہ مذکور ہو جائے
ہزاروں کوس مطلب دور ہو جائے
غرض آتش ہے اس کی آتشِ دل
ہوا اس کی ہے روحِ مرغِ بسمل

بتاؤں اس کا بانی آہ کیا ہے
مگر طوفاں کا بانی رہ گیا[1] ہے

جلے پروانے کی ہے خاک واں کی
کہ عشق افزا ہے خاک ہندوستاں کی

جو کوئی عاشق و معشوق یاں ہے
دوئی ہرگز نہ ان کے درمیاں ہے[2]

برنگ شعلہ و خس کرتے ہیں ساتھ
جو مرتے ہیں تو دونوں مرتے ہیں ساتھ

مجھے اس پر جو تائیدِ سخن ہے[3]
جنوں سرمایۂ عشق رتن ہے

محبت کی جو ہوتی ہیں نگاہیں
چھپی رکھتی ہیں دل کے بیچ راہیں

رتن کے عشق کا شعلہ تھا[4] سرکش
پدم کے بھی لگا دی دل کو آتش

لگا دل کو پدم کے شعلہ اُڑ کر
جلے اک گھر سے جیسے دوسرا گھر

وہ دونوں عاشق و معشوق ہو جمع
جلے اک بار جوں پروانہ و شمع

۱- نسخۂ لکھنو : بانی رکھا ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ میں یہ شعر بعد میں اور اس کے بعد کا شعر پہلے ہے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : 'مرا سینہ جو پابند سخن ہے' -
۴- نسخۂ لکھنؤ : شعلہ ہے -

سو ان کا میں نے[1] لکھ کر قصہ تمام
مدلل ''شمع و پروانہ'' رکھا نام

ہو جوں ابرِ سیہ میں مہر پُر[2] نور
مرے ہر شعر میں مضموں ہے مستور

جو ذرہ آب و تاب اس کی[3] نظر آئے
وہیں خجلت سے حاسد غرق[4] ہو جائے

برائے دوستاں ہے مہرِ سرما
عدو کے حق میں ہے خورشیدِ گرما[5]

رقم جو ہے یہ مضموں شعلہ بنیاد
مری روشن طبیعت کا ہے ایجاد

نہ سرقہ ہے، نہ کوئی مبتذل ہے
توارد لیکن اس کا محتمل ہے

مگر مضمونِ عاقل خانِ رازی
کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی

تیمن کے طریق اس میں ہے داخل
کہ میں اس کے مقولے کا ہوں ناقل

سو اس کی نظم کو تو دیکھ لا[6] تو
بندھا ہوویگا مضموں ایک یا دو

۱- نسخہ لکھنؤ : سو میں نے ان کا۔
۲- نسخہ لکھنؤ : مہر کا نور۔
۳- نسخہ لکھنؤ : اس کا۔
۴- نسخہ لکھنؤ : حاسد غرق خجلت سے۔
۵- نسخہ لکھنؤ : برائے دوستاں ہے یہ گلستان
عدو کے حق میں ہے برق درخشاں
۶- نسخہ لکھنؤ : دیکھ آ تو۔

سن اے حاسد! ارے بے فضل و احمق
تو کیوں بکتا پھرے ہے ایسا ناحق[1]
نہیں ہیگا یہ غیرت کا تقاضا
کہ مضموں لا کے میں باندھوں پرایا
میں غیروں کو ادب کرتا ہوں ارشاد
میں اپنے عصر کا ہوں آپ استاد
جو کوئی آپ کرتا ہووے شاہی
اسے غیرت ہے دریوزہ گدائی
نہ کر بے رحم اتنی خود پسندی
ذرا تو دیکھ میری دردمندی
کبھی تو بول مثلِ مرغِ حق کو
خدا کے ڈر سے ظالم لفظ حق، کو
کہ میں نے جاں کنی جوں کوہ کن کی
بنائی شکل تب شیریں سخن کی
نکالی دل سے ہے آہِ جگر گوں[2]
کیا ہے مصرعۂ رنگیں کو موزوں
ہر اک مصرع مرا لوہو میں ہے غرق[3]
برنگِ مصرعِ برجستۂ برق
مرے ہر حرف میں خوں کا اثر ہے
زبانِ خامہ شاید نیشتر ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ میں یہ شعر نہیں ہے۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : آہِ جگر بود۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہر اک مصرع ہے میرا خون میں غرق۔

نہ رہ اتنا بھی اب انصاف سے دور
کہ تبخالے کو تو کہتا ہے انگور
زبوں مت دیکھ آنکھوں کا زیاں ہے
مرے ہر حرف میں دل کا دھواں ہے
نہ رکھ انگلی مرے حرفوں پہ زنہار
دھوئیں میں شعلہ ہے لپٹا، خبردار
مرا شیریں سخن تجھ کو نہیں خوب
طبیعت ہے تری حنظل سے مرغوب
خدا سے ڈر مجھے تو نام مت رکھ
مرے اشعار سے تو کام مت رکھ
"کہ من بہر تو ایں گوہر نہ سفتم
برائے خاطرِ احباب گفتم"
کہ میں احباب سے رکھتا ہوں تاپاک
عدو کی ڈالتا ہوں چشم میں خاک
جہاں سے جو کوئی ہے صاحبِ ہوش
جو ہیں مثلِ قلم سرتا بہ پا گوش
انھوں کی خدمتِ عالی میں ہے عرض
اور ان پر بھی قبولِ عرض ہے فرض
کہ ہوتی ہے خطا ہر اک بشر سے
خصوصاً شاعرِ فرخندہ فر سے
زمینِ شعر میں دیکھا ہے اکثر
نہیں پڑتا قدم ہرگز برابر
قلم کی دیکھیے جس جا لغزشِ پا
نظر آوے جہاں اصلاح کی جا

رکھے مجھ پر نہ ہرگز حرفِ خامی
بقولِ پاک مولانائے جامی
''بقدرِ وسع در اصلاح کوشند
اگر اصلاح نتوانند پوشند''
جو کوئی مجھ کو نیکی سے کرے یاد
خدا و مصطفیٰؐ اس سے رہیں شاد

شروع داستانِ دلفریب بیچ پیدائش پدماوت رانی سراندیپ کے

پدم کا حسنِ عشق افزا بیاں کرتا ہوں جوں بلبل
کہ فکرِ گل رخاں طفلی سے اس دل کو خوش آتا ہے

سمندِ خامہ طوفاں بلا خیز
ہوا جوں اشک گلگوں گرمِ مہمیز
دل اس کے[1] ساتھ باصد تزک و تازی
لگا جوں شعلہ کرنے تیغ بازی
نہایت مضطرب دل کو جو پایا
یہ قصہ میں نے اس کو کہہ سنایا
کہ تھا ہندوستاں میں اک مہاراج
ہر اک شاہ و گدا کے فرق کا تاج
سراندیپ اس کے پایہ تخت کا تھا
سپہر اک چتر اس کے بخت کا تھا
بہار آسا سدا رہتا تھا دل شاد
اڑا کرتی خزانِ غم کی بنیاد

۱- نسخہ نول کشور : 'اس کے' ندارد -

سریر آرائے ملک شاد کامی
جوانمردی سے گندھرب سین نامی
شبستاں میں تھی اس کے ایک رانی
نہایت خوبصورت حورِ ثانی
نسا کا جس طرح دستور ہیکا
صدف میں قطرہ اک نیساں کا ٹپکا
حمل اس کا لگا بڑھنے شب و روز
ہوئے خورد و کلاں سب عشرت اندوز
نزاکت سے شکم میں بچہ اس کا
نظر آتا تھا جوں مینا میں صہبا
غرض گزرے حمل کو جب کہ نُہ ماہ
ہوئے پورے دن اس کے حسبِ دلخواہ
جنی اس گل رخِ زیبا نے دختر
نہ دختر بلکہ اک تابندہ اختر
جو کاٹی ناف اس کی مثلِ آہو
اڑی سو[1] مشک نافہ کی سی خوشبو
ہوئی جو[2] پدمنی پیدا وہ گلفام
رکھا پدماوت اس کے باپ نے نام
ہزاروں بھنورے آ گرد[3] اس کے گھومیں
کنول کے پھول پر جس طرح جھومیں

۱- نسخۂ لکھنؤ : صد ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : کو ۔ نسخۂ شیرانی : چوں ۔
۳- نسخۂ نول کشور : گرد آ ۔

جو بھونرا جانور اس پر غمی تھا
رتن کم بخت تو اک آدمی تھا
وہیں اک سبز گہوارا بنایا
اسے غنچے کی شکل اس میں سلایا
وہیں اک دائی ستھری سی بلائی
وہ آتش اس کے سینے کو لگائی
جو پایا دائی نے عالم اُجالا
بغل میں اس کو دل کی طرح پالا
اسے بادِ مخالف سے بچاتی
چراغ آسا تہِ دامن چھپاتی
نظر سے چشمِ بد کی بس کہ ڈرتی
جدا آنکھوں سے جوں پتلی[1] نہ کرتی
لیے رہتی تھی ہر ساعت مشوش
اسے گودی میں، جوں جاڑے کی آتش
قیامت فتنہ اس قد میں جو پاتی
تھپک کر اس کو بھی اکثر سلاتی[2]
کیا تھا معتدل سب کارخانہ
بمانندِ مزاجِ چار کالہ
سب اس کے گھر میں جو خورد و کلاں تھے
اسی کی غور میں روز و شباں تھے
لگا ہر ایک کا دل خوں ابلنے
وہ تیغ آسا لگی جس وقت چلنے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : جوں مردم نہ کرتی۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : اکثر ہی سلاتی۔

لپک کر برق ساں وہ گر جو بجاتی
ہزاروں دل کے خرمن کو جلاتی
جہاں کے باغ میں اس ماہ‌رو کا
برنگِ غنچہ اک نادر[1] ثمر تھا
اگرچہ شکل و صورت میں تھی جوں گل
ولے کرتی تھی باتیں مثلِ[2] بلبل
شروعِ سالِ پنجم رائے رایاں
ہوا تعلیم کو اس کی شتاباں
بلا اک برہمن ہشیار و دانا
بہ تحصیلِ علوم اس بت کو سونپا
کئی ہمجولیاں اور اس کی ساتھن
بٹھائیں رائے نے پیشِ برہمن
کہ ہمزادوں میں وہ مکتب نشیں ہو
فراغت سے کرے حاصل سبق کو
مبادا ہو نہ جائے ناز پرورد
تپِ تنہائی سے تبخالہ درد
برہمن نے سبھوں کو سر جھکایا
جو مکتب خانہ کو بت خانہ پایا
سبق اس کو برہمن کیا پڑھاتا
کہ مثلِ مرغِ بسمل خود پڑا تھا

۱- نسخہ لکھنؤ : بادر۔
۲- نسخہ لکھنؤ : بہ نالے کرتی تھی مانندِ بلبل۔
نسخہ نول کشور و نسخہ شیرانی :
بہ باتیں کرتی تھی مانندِ بلبل

لگی پڑھنے وہ بسم اللہ جس دم
برہمن ہو گیا مجموعۂ غم
جو کی اس نے نگاہِ عشق انگیز
ہوا ہر لفظ صد معنی سے لبریز
وہ گل جس صفحہ پر ہوتی سبق خواں
نظر آتا وہ اک جزوِ گلستاں[۱]
ہر اک حرف اس کو تھا مشکل سے آتا
دہن میں تھا نہ تنگی سے سماتا[۲]
لپٹ رہتا تھا خوبی کے سبب سے
دلِ عاشق نمط حرف اس کے لب سے
دوبارہ حرف شیریں لب پہ آ کر
ہو جاتا شربتِ دردِ مکرّر[۳]
سبق کو بھول کر وہ غارت ہوش
تبسم کرکے ہو جاتی تھی خاموش
برہمن مثلِ مستانِ خرد گم
شہیدِ جلوۂ تیغِ تبسّم
یہ کہتا تھا کہ کمتر ہنس شکر لب
کہ مصری تیغ یہ کاٹے ہے بے ڈھب
مصاحب ایک اس بت کا تھا طوطا
کہ اس کا نام 'ہیرا من' رکھا تھا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : نظر آتا تھا جوں سطحِ گلستاں ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : دہان تنگ میں کیونکر سماتا ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

پر اس کے سبز مثلِ بختِ کامل
پہ منقار اس کی پر خون صورتِ دل
محبت[1] اس کے اعضا میں مبیّن
ہوا تھا عشقِ خونی طوقِ گردن
چنار آسا تھا ظاہر سبز دل کش
پہ باطن میں چھپی تھی اس کے آتش
جو کچھ پڑھتی تھی وہ غارتِ گر جاں
وہ طوطا ساتھ تھا اس کے سبق خواں
سخن جو نازنیں لب پر گزرتا
وہی الفاظ پھر وہ حفظ کرتا
جو تھا ہمدوش[2] اس آئینہ رو کا
شتابی ہو گیا گویا وہ طوطا
غرض طوطا بھی پڑھ کر علم یک بار
ہوا آنکھوں کی صورت اس کے اغیار

محبت پیدا ہونا آپس میں بدماوت اور طوطے شیریں کلام کا اور اطلاع پا کر درپے دفع طوطے کے ہونا سہیلیوں خود کام کا

اگر معشوق ہو دمساز عاشق کا تو یہ گردوں
حسد سے کچھ عجب حیلہ جدائی کا اٹھاتا ہے

کتابِ حسن کا جو نکتہ داں ہے
بدم کے حال سے یوں قصہ خواں ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ : مبین -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہم درس -

کہ جب وہ چودھویں سن میں ہو داخل
ہوئی جوں چودھویں کا چاند کامل
ہوا دل اس کا گرمِ عشق بازی
سمجھنے لاگی[1] رسمِ جاں گدازی
لگی ہر رنگ اپنے کو بنانے
لگی لوگوں کو چھب تختی دکھانے
مہِ نو کی طرف کر کے نظارہ
لگی کرنے وہ ابرو کا اشارہ
جہاں میں جب بعقل و نکتہ دانی
نہ پایا کوئی اپنا اس نے ثانی
تب اس نے ربط انساں سے اڑایا[2]
مصاحب اپنا حیواں کو بنایا
جو تھا علم و ادب میں یکسر ممتاز
شکر لب نے کیا طوطا ہی دمساز
جو کچھ احوال ہوتا اس سے کہتی
جدا اک آن وہ اس سے نہ رہتی[3]
لگائے چھاتی سے پھرتی تھی ہر جا
اسے الفت سے ، جیوں انگیا کی چڑیا
قفس ہاتھوں سے اس کا کھولتی تھی
اسے پھولوں میں ہردم تولتی تھی

۱- لاگی : بمعنی لگی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : اٹھایا -
۳- نسخۂ لکھنؤ : پڑھتی -

ہوئی تھی بسکہ اُس طائر سے الفت
پرستارانہ تھی[1] سرگرمِ خدمت
دکھا کر آخر اپنی چشم و ابرو[2]
دل اس کا لے گئی چھل کر پری رو
محبت دونوں جانب تھی جو صادق
شکر لب کا ہوا طوطا بھی عاشق
لگا بیٹھی جگر میں اس کے تقدیر
بسانِ طائرِ قبلہ نما ، تیر
سویدا کی طرح لت[3] دل میں حیواں
پری کے عشق کو رکھتا تھا پنہاں
کسی سے حال اپنا کچھ[4] نہ کہتا
برنگِ غنچہ منہ موندے ہی رہتا
غرض اک روز فرصت اس نے پائی
پدم کو داستاں غم کی[5] سنائی
کہ ابرو نے ترے ہے مجھ کو مارا
مرے دل پر ہے لت چلتا یہ آرا[6]
ترے اس پنجۂ مژگاں نے بیباک
قفس آسا کیا سینہ مرا چاک

۱- نسخۂ لکھنؤ : پرستاریں نہ تھیں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : چشمِ جادو ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : لب ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : حال یہ اپنا ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : داستانِ غم ۔
۶- نسخۂ لکھنؤ : تو لت چلتا ہے آرا ۔

ترے غم سے ہے باطن میرا پُرخوں
میں ظاہر سبز جوں برگِ حنا ہوں
اگرچہ سبز ہے ظاہر مرا رنگ
پہ باطن میں مرے آتش ہے جوں سنگ
برنگِ زر جگر جلتا نہاں ہے
مرے یہ سبز پر جس کا دھواں ہے
کہ جب دیتا ہے زر کو تاب زر گر
دھواں نکلے ہے اس سے سبز اکثر
میں شمعِ سبز کی صررت ہوں جلتا
نہیں منقار، ہے شعلہ نکلتا
پری سے داستانِ عشق خوں خوار
وہ اخفا غیر سے کرتا تھا اظہار
نہ سمجھا آہ لیکن وقت گفتن
کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن
کھر کی طرح لفظ اس قصہ خواں کے
پڑے کانوں میں ہر خرد و کلاں کے
خصوصاً تھیں جو پدماوت کی ہمدم
انھوں نے بھی سنا یہ قصہ غم
جلی حسرت سے ان کے سینے میں آگ
حسد کا ان کو ڈسنے لگ گیا ناگ
سبھوں نے مصلحت کر کے یہ پنہاں
کہا احوال پیشِ رائے وایاں
کہ یہ طوطا نہایت بد بلا ہے
یہاں سے دور اسے کرنا بھلا ہے

عجب یاد اس کو کچھ افسونگری ہے
کیا شرمندہ سحرِ سامری ہے
دم اس کا گرم مثلِ چرمِ حداد
گلا دیتا ہے اک ساعت میں فولاد
پدم کے دل کو اس نے کر کے جادو
کیا وحشت فزا مانندِ آہو
اسے ہے عشق کی باتیں بتاتا
ہے آتش خرمنِ دل میں لگاتا
برنگِ آئنہ وہ ناز پرورد
مبادا ہو نہ جاوے صورت درد
ہمیں خطرہ یہی رہتا ہے دن رات
نہیں معلوم پر تقدیر کی بات
یہ قصہ جب کہ راجہ نے کیا گوش
سر اس کے سے اڑا طائر صفت ہوش
اسے سو طرح کا منصوبہ سوجھا
خیالِ خام لیکن سب کو بوجھا
تب اس دختر کی خاطر کر کے منظور
کہا حکمت سے طوطا کیجیے دور
یہ کہہ کو اس نے اک بلی منگائی
پری رو کے شبستاں کو بھجائی
یہ گویندوں کو سمجھایا کہ جاؤ
کبھی تم وقت فرصت کا جو پاؤ
قفس کو توڑ کر پرزے کرو تم
کرو عالم سے طوطے کے تئیں گم

قفس سے کھینچ کر با تیغ بیداد
کرو تم ذبح اس کو مثلِ صیّاد
گئے رانی کے پاس اٹھ کر وہ بیدرد
جدا تاثیر سے مثلِ دمِ سرد
وہ بلی جا کے رانی کو دکھائی
کہ راجہ نے ہے یہ تجھ کو بھجائی
نظر کر دشمنِ جانی کو طوطا
ہزاروں بات اپنے دل میں سوچا
کہا رانی کو یاں سے کر[1] مجھے دور
اگر ہے تجھ کو میری زیست منظور
بچادے[2] میری بلی سے تو گردن
برا ہوتا ہے کلرو گھر کا دشمن
کہا رانی نے تو تو میری جاں ہے
مری بھی[3] زندگی تجھ بن کہاں ہے
جدائی تیری مشکل ہے پیارے
نہ ہو پانی جدا لاٹھی کے مارے
تجھے خطرہ اگر بلی کا ہیگا
چھپا رکھوں گی تجھ کو مثلِ عنقا
یہ کہہ کر لے قفس اس کا شتاباں
کیا اک کوٹھڑی میں جا کے پنہاں

۱- نسخۂ لکھنؤ : کر یاں سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : بچا لے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : بھی -

و لیکن یہ نہ سمجھی وہ کہ تقدیر
لپٹ ہنستی ہے جتنی کیجے تدبیر

سہیلیوں کا پدماوت کو سیرِ چمن کی رغبت دلانا اور اوصاف بہار صحرا زبان پر لانا

پدم کی آہ ہمزادوں کی صورت یہ دلِ محزوں
مجھے کس کس طرح گلگشت کی رغبت دلاتا ہے

جو تھا آگاہ اس رازِ نہاں سے
فسوں خواں یوں ہوا اس داستاں سے
کہ اک دن مل کے پدماوت کی ہمزاد
جو تھیں غارت گرِ دل ہائے آباد
منگا کر اپنے ڈولوں کی سواری
پدم کے گھر کی ، کی سب نے طیاری
کہاروں نے جو ڈولوں کو اٹھایا
گلِ خورشید میزاں میں چڑھایا[1]
محافے جا پدم کے گھر آتارے
بہم اک جا ہوئے چاند اور چارے[2]
سبھی رونق فزائے خانہ ہوگئیں
سبھی اس شمع کی پروانہ ہوگئیں
پئے تعظیم سب نے سر جھکائے
زمیں پر تارے گویا ٹوٹ آئے

۱- نسخۂ نول کشور : بٹھایا ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ نول کشور : ستارے ۔

سلامی دست رنگیں سر پر آیا
گل و سنبل کا گلدستہ بنایا
کھڑی ہو سرو کی صورت ییک پا[1]
سبھوں نے کی یہ پھر عرض تمنا
کہ اے سر تا پا خوبی کے گلشن
چراغِ حسن تیرے دم سے روشن
اگرچہ جگ میں جو خرد و کلاں ہیں
تمھارے حسن کے سب قصہ خواں ہیں
ولے افسردگی نے ہم کو ڈوبی
کہ کچھ سمجھے نہ ہم دنیا کی خوبی
نہ مثلِ گل کبھی کی سیرِ بازار
نہ بلبل کی طرح گلگشتِ گلزار
یہ گھر میں باپ کے جو ہم ہیں[2] یکجا
سو ، ندی ناؤ کا سنجوگ ہوگا
ٹک[3] آؤ کھول کر دل کھیل لیویں
خوشی کی داد ہم آپس میں دیویں
کہ اس جا اختیار اپنا ہے باقی
ہے اپنے حکم میں جام اور ساقی[4]

۱- نسخۂ لکھنؤ : چمکنا -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہیں جو ہم -
نسخۂ شیرانی : یہ گھر باپ کے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : تو اول کھول کر -
۴- نسخۂ لکھنؤ : یہ جام ساقی -

کبھیں سسرال کو جب جائیں گی ہم
یہ صحبت پھر کہاں سے پائیں گی ہم
نہیں معلوم ہم کو واں کا انجام
کہ دکھ پاویں گی اس جا یا کہ آرام
سنا ہے سخت ہیں واں کی گزلدیں
بری ہوتی ہیں اکثر ساس ننديں
نکل کر واں سے پھر پھر ِ تماشا
اگر جاوے کوئی مقدور کس کا
جو ہے کچھ[1] آج سو پھر کل نہیں ہے
ہمیں اس غم سے ہرگز کل نہیں ہے
پدر کے گھر کی کیجے قدر معلوم
مچالو ہو سکے جو کچھ یہاں دھوم
چلو صحرا کا اب گلگشت کیجیے
نکل بستی سے سیر دشت کیجیے
سنا ہیگا کہ اب کے سال صحرا
رم آہو نمط ہے وحشت افزا
چلو اور اس کو دیوانہ بنائیں
دل ِ صحرا پری خانہ بنائیں
تجھے لازم ہے چلنا اے پری رو
کہ اکثر ہوئے صحرا گرد[2] آہو
نہیں ہوتا یہ سب کہتے ہیں اکثر
غزالوں کا مکاں صحرا سے خوش[3] تر

۱- نسخۂ لکھنؤ : جو کچھ ہے آج -
۲- نسخۂ لکھنؤ : مکرو (کذا) -
۳- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ شیرانی : صحرائے خوشتر -

تماشا کر ادھر سے باغ جائیں
گل و غنچہ سے دل اپنا لبھائیں
بہاری خاطر اب کی سال گلشن
بھرے ہے کہتے ہیں پھولوں سے دامن
دلِ عاشق سے وہ دیتا نشاں ہے
جہاں لالہ ہے اور آبِ رواں ہے
گلِ چنپا کہاں بن میں کھلا ہے
تری چنپا کلی سے خوش نما ہے
گلوں کے بیچ میں یوں سروِ رعنا
رکھا ہو متصل جیوں جام و مینا
ہے شاخِ سبز پر غنچہ نمودار
ترے طوطے کی جیسے سرخ منقار
وہاں چہرہ تو کر گل کے مقابل
کہ جاویں بھول عشقِ گل عنادل
چراغ گل نہ ہو کیونکر بھلا گل
ترے آگے ہے گل جوں شمع کا گل
اگر نرگس سے تو آنکھیں لڑاوے
اسے نظروں میں وہ ہی مل کے آوے
غرض سب ماہرویانِ فسوں ساز
چمن کے وصف میں تھیں نکتہ پرداز
نسیم آسا زبانِ مصلحت کار
نہ کہتی تھیں سخن جز سیرِ گلزار
لبِ ہر شعلہ خو پر شوق انگیز
نہ تھا جز حرف گل مانند گل‌ریز

ہدم بھی چاہتی تھی ان کو آخر
ہوئی تیّار رفتن بہرِ خاطر

سیرِ باغ کو بدساوت کا جانا اور دشمن کا طوطے کو قفس سے اڑانا

ذرا تو بھی چل اے دل اب گلستاں کے تماشے کو
کہ گلگشتِ چمن کو آج تیرا یار جاتا ہے

چمن میں صبح دم اک بلبلِ زار
دلِ عاشق نمط کرتی تھی تکرار
کہ سیرِ باغ کو ہے کون آتا
نہیں گل جامے میں پھولا[1] سماتا
یہ ایسی کس کے مقدم کی خوشی ہے
گلِ عباس[2] نے شہنائی لی ہے
نہ جانوں کس کے استقبال کو یاں
چمن سے بو نے گل نکلی ہے پنہاں
یہ نرگس راہ کس کی دیکھتی ہے
کہ در پر اس کے ٹکی لگ رہی ہے
یہ کس کے غمزے نے مارا ہے شب خوں
کہ ہے غنچے کی شاخ اک تیر پُر خوں

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : پھولا گل سماتا ۔
۲۔ گلِ عباس : (مذکر) ایک پھول جو سفید ، سرخ ، زرد رنگوں میں ہوتا ہے اور چار بجے کے قریب کھلتا ہے ۔ (جامع اللغات ص ۲۷۸)
نسخۂ لکھنؤ : گل عباس نے تنہائی لی ہے ۔

گلِ خورشید کو کس کی تڑپ ہے[1]
کہ لی ہے ہاتھ میں اس نے دف و نے
یکایک سرو کو کیا ہو گیا ہے
اٹھائے سر یہ کس کو جھانکتا ہے[2]
سنی ہے کس کے مقدم کی خبر عام
سراپا چشم ہے ہر نخلِ بادام
غرض بلبل کو تھی اک[3] بے قراری
کہ جا پہنچی پدم کی واں[4] سواری
لیے ہمراہ اپنی فوج جادو
کیا تاراج گلشن کی طرف رو
عماری سرخ سے نکلی وہ باہر
شفق سے جس طرح خورشید انور
ہری پوشاک پہنی اپنے تن میں
بہار آسا ہوئی داخل چمن میں
برنگِ سرو اس کا سبز داماں
یکایک ہو گیا زیبِ خیاباں
عصا فوّارہ لے کر اہتمامی
ہوا جوں چوبدار اس کا سلامی
اٹھی تعظیم کو نرگس بھی ناچار
سہارے سے عصا کے مثلِ بیمار

۱- نسخہ لکھنؤ : طرب ہے ۔
۲- نسخہ لکھنؤ : دیکھتا ہے ۔
۳- نسخہ لکھنؤ : واں بے قراری ۔
۴- نسخہ لکھنؤ : بھی سواری ۔

چمن میں دیکھ کر اس کا تجمّل
بہم ہنستا تھا گل پر دوسرا گل
رکھیں[1] مالن نے پیشِ شاہِ خوباں
یہ رکھ کر عرض کی پھولوںکی چھڑیاں
کہ گل نے طور تیرا تھا اڑایا
سو اس لونڈی نے سولی پر چڑھایا
جو تھا تاجِ خروس اس بوستاں کا
یہ اس کی زلف سے ہم داستاں تھا
کہ میں کو قابل خدمت نہیں ہوں
قدیم اس آستاں کا شالہ بیں ہوں
جدھر کو شعلہ رو وہ گرم جاتی
اک آتش خرمنِ گل میں لگاتی
چمن میں دھوم اس گل نے مچائی
کہ گل کی سیر کو ہے برق آئی[2]
غرض واں گل سبھی[3] شرما رہے تھے
سر اپنا زانو پر اوندھا رہے تھے
پری نے باغ کو شرما دیا تھا
ہر اک بلبل کو سودائی کیا تھا
کبھی غنچے سے پنجہ جوڑتی تھی
دلِ عاشق کی صورت توڑتی تھی

۱- نسخۂ لکھنؤ : کلیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : گون آئی -
۳- نسخۂ لکھنؤ : گل واں سبھی -

ولیکن منہ نہ تھی اس کو لگاتی
کہ ہے غنچے کے منہ میں باس آتی

کبھی رکھتی تھی گل کو بر سرِ گوش
کہ کہہ احوال اپنا اے چمن پوش

کبھی رکھ زلف پر باصد بہانہ
بناتی تھی گلِ شبّو کا شانہ

کبھی پھینک اس کو یوں تھی مسکراتی
کہ سرگوشی نہیں مجھ کو خوش آتی

کبھی سوسن سے کرتی تھی اشارا
کہ چشمِ سرمہ سا نے مجھ کو مارا

کبھی لالے کو فرماتی تھی ہنس کر
کہ تو نے داغ کھائے ہیں یہ کس پر

شقائق نو یہ پڑھ کر اس نے افسوں
کھلے سر کر دیا تھا مثلِ مجنوں

جدھر کو جوں صبا کرتی گزارہ
ہر اک گل جیب کو کرتا تھا پارہ[۲]

کیا تھا نصب جس جاکہ ہنڈولا
پری نے واں پرِ پرواز کھولا

ہنڈولے کی کہوں کیا دل رہائی
فلک نے چال جس سے تھی اڑائی

۱۔ نسخہ شیرانی و نسخہ نول کشور : تجھ کو ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

برنگِ مہ کہ ہو میزاں میں داخل
ہوئی گہوارۂ گرداں میں داخل[1]
قدم رکھتے ہی ماہ اس سے یہ[2] بولا
فلک نے تجھ کو[3] میزاں میں ہے تولا
مشبّہ یہ تھا ماہ و چرخ رخشاں
ہوئی ڈر کر جو گہوارے میں چسپاں[4]
جو ڈر سے اس نے مژگاں کو دیا کھول
نظر آتی تھی جوں تصویر ہنڈول
برنگِ شمعِ فانوسِ خیالی
وہیں دل میں ہنڈولے نے[5] چھپالی
چھلاوے سی کبھی یاں اور کبھی واں
لگہ ساتھ اس کے تھی افتاں و خیزاں
ہنڈولے سے نکلتی کیوں نہ آواز
کہ تھا فرقت سے اس کی نالہ پرداز
نزاکت سے بہت حرکت نہ بھائی
وہ گردش اس کے سر کو خوش نہ آئی
تھا گہوارہ لوگوں نے اوتارا
فلک سے جس طرح ٹوٹے ہے تارا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : برنگ مہ ہوئی میزاں میں واصل
ہوئی گہوارۂ گردوں میں داخل
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : تجھ کو ہے ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم موخر ہیں ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : ہنڈولی نے وہیں دل میں ۔

غرض مثلِ صبا دامن اٹھا کر
سرِ ہر گل پہ اک ٹھوکر لگا کر
نکل کر جب چلی گلشن سے وہ ماہ
تذروِ باغ بولا بھر کے اک آہ
میں کہتا تھا کہ سرو بوستاں ہے
نہ سمجھا یہ کہ تو سرو رواں ہے
کنارے باغ کے واں ایک دریا
برنگِ دیدۂ عاشق تھا بہتا
کہوں کیسا تھا وہ دریائے پُر شور
زمیں ہلی جس نے تیغِ موج کے زور
نہایت اس کا پانی تھا مصفّا
مگر آئینے کا پانی بھرا تھا
برنگِ ظلمِ طبعِ کینہ آرا
نظر آتا نہ تھا اس کا کنارا
ملیں تھیں عرض میں اس کے بصد ٹھاٹ
ہزاروں ندیاں[1] دامن کے جیوں پاٹ
کسی نے اس کی طولانی نہ دیکھی
درازی اس کی جوں طولِ امل تھی
فلک کی طرح ساحل اس کا گلزار
برنگِ کہکشاں دریا نمودار
حباب اس کے کی صورت میں کہوں کیا
لبِ بیمار پر تبخالہ پیدا

۱- نسخہ لکھنؤ : "ندیاں" ندارد ۔

چلی آتی تھی موج اس کی دمادم
برنگِ مصرعِ برجستہ پیہم
دلِ[1] خستہ کی صورت تھی کماھی
تڑپتی سینۂ دریا میں ماہی[2]
برنگِ چشمِ عاشق[3] حلقۂ آب
نمایاں تھا رخِ دریا پہ گرداب
چلی گلشن سے وہ گلرو شتاباں
برائے غسل سوئے بحرِ جوشاں
پہنچ کر آگے پیچھے ہر پری رو
لبِ دریا پہ جیسے خیلِ آہو
قدم یک بار جا دریا پہ گاڑا
کیا دریا کو پریوں کا اکھاڑا
برنگِ تیغ ہو عریاں وہ خوں خوار
در آئی[4] سینۂ دریا میں جیوں دھار
برش اس تیغ کی تا ہو سوائی
فلک نے پھرکی پانی میں بجھائی
کشاں تھا اپنی جانب یوں اسے[5] آب
پری کو جس طرح کھینچے ہے سیماب

۱- نسخۂ مصطفائی (نسخۂ متن) : ولی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : دلِ مجروح کی مانند واہی
طپاں تھی سینۂ دریا میں ماہی
۳- نسخۂ لکھنؤ : چشم طوفاں -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اتر گئیں -
۵- نسخۂ لکھنؤ : اس کو یوں -

فسوں کیا جانے دریا نے کیا کیا[1]
کیا جو ماہ و ماہی کو یک جا[2]
کریں دریا میں وہ سب کھول کر بال
کیے ہرتاب ہر جانب بھولر جال
فلک سے ماہ کرتا تھا اشارے
کہ برجِ حوت میں آترے ہیں تارے
مصفا بحر میں جیوں گات ستھری[3]
برنگِ سرخ وہ پانی میں آتری
گلو تک تن شناور کا تھا غرقاب
برنگِ نخلِ نیلوفر تہِ آب
سرِ دریا پہ چہرے ان کے رخشاں
کنول کے پھول کی صورت نمایاں
پریشانِ رواں[4] زلفِ شناور
بروئے موج مثلِ عنبرِ تر
بزیرِ زلف دستِ ہر گل اندام
تڑپ جاتا تھا جوں ماہی تہِ دام
بہم رخ پر بھی تھے چھینٹے لگاتے
ستارے پانی میں تھے ڈبڈباتے
یہ تھا افراط پانی کا رخوں پر
کہ غرقِ آب تھے سب مثلِ گوہر

۱- نسخۂ لکھنؤ : کیا تھا۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہر اک جا۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : جیوں گل سنہری۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : پریشاں تھی رواں۔

وہ غرقِ آب روئے ہر نکو فال
نمایاں جیسے آئینے میں تمثال
بدن پر قطرہ با شوق کاہی
لپٹ جاتا تھا مثلِ فلسِ ماہی
وہی قطرہ بدن سے جبکہ ڈھلتا
دکھاتا شیشہ بازی کا تماشا
تنِ گل‌گوں سے لگ کر قطرۂ آب
اُترتا بحر میں تھا مثلِ سرخاب
کیا تھا ہر پری رو نے ہر اک جا
دلِ دریا میں شورِ فتنہ برپا
نظر ہولی کہ ایسا بخت خورسند
فلک یوں رشک سے بولا کہ تاچند
دواں اتنے میں واں[1] پہنچا خبردار
بخود پیچاں برنگِ مار مکار
کہا جی کی اماں پاؤں تو بولوں
گرہ دردِ دلِ غمگیں کی کھولوں
ہوئی گھر کی وہ بلی عربدہ خواہ[2]
قفس پر جا پڑی طوطے کے ناگاہ
مچایا شور و شر ہم نے بہت سا
نہایت کد سے وہ پنجرا چھٹایا
قفس سے اُڑ گیا آخر وہ مجروح
نکل جاتی ہے جیسے جسم سے روح

۱- نسخۂ لکھنؤ : دواں آئی وہاں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : غیر بدخواہ ۔

پدم کا سنتے ہی سر سے[1] اڑا ہوش
اٹھا دریا کی صورت دل میں[2] اک جوش
ہوئے بس چہرے پر تھیے[3] اشک ریزاں
برنگِ نخلِ باراں دیدہ مژگاں
عجب گھبرا کے وہ دریا سے نکلی
پری کی طرح اس مینا سے نکلی[4]
چلی گھر کی طرف اپنے شتاباں
برنگِ ابر اشک از دیدہ ریزاں
قفس خالی جو دیکھا ، غم کی ماری
برنگِ نوحہ پردازاں پکاری
کہ تیرا سبز رنگ اے طائرِ زار
ہوا جوں زہر رگ رگ سے[5] مری پار
خیال اس تیز شہپر کا غم انگیز
گزرتا دل سے ہے جوں خنجر تیز
تری منقار کی یاد اے ستم گر
دہکتے دل پہ رکھ دیتی ہے اخگر
پتنگ آسا یکایک سر کو تو موڑ
محبت کی گیا ہے ڈرو کو توڑ

۱- نسخۂ لکھنؤ : دل سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : دل سے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہوئی بس چھوٹتے ہی -
۴- نسخۂ لکھنؤ : مصرعے مقدم موخر ہیں -
۵- نسخۂ لکھنؤ : اک رگ میں -

ہوا پر دیکھتی ہوں جب[1] پکھیرو
سمجھتی ہوں کہ آیا میرا مہرو
گزر جاتا ہے جب طائر کہیں پر[2]
وہیں سر دے پٹکتی ہوں زمیں پر
تو کہتا تھا کہ ہوں مجنوں میں تیرا
کیا اب اس لیے جنگل بسیرا
محبت بے مروت توڑ کر تو
گیا تنہا مجھے کیوں چھوڑ کر تو
مثل کہتی ہوں میں اب بالضرورت
تو پھیر آنکھیں گیا طوطے کی صورت
یوں ہی کر کر بیاں روتی تھی وہ ماہ
نہ تھا کچھ کام اسے جز نالہ و آہ
پھر آخر سوگ میں بیٹھی وہ غم ناک
قفس کی طرح کرکے پیرہن چاک

داستان : طوطے کا اڑ جانا اور جال میں ایک صیاد کے آنا

فلک کی کیا کہوں باتیں جسے آزاد پاتا ہے
برنگ دل وہیں دام مصیبت میں پھنساتا

جو بے دردوں نے وہ طوطا اڑایا
پدم کے ہوش کو گویا اڑایا
وہ طوطا تھا جو سر تا پا توکل
اڑا کہہ کر کہ اب تیرا توکل

۱- نسخہ لکھنؤ : جو۔
۲- نسخہ لکھنؤ : طائر وہ بڑھ کر۔

خیال آنا چلا رونے ہوا پر
دیے وحشت کے اس نے کھول شہپر
کبھی جوں چشم کرتا سیرِ دریا
کبھی مجنوں کی صورت دشت پیما
نہ تھا دل بستہ خشکی و تری کا
کہ وہ سایہ زدہ تھا اک پری کا
بسانِ رنگِ عاشق درد دمساز
نہ تھا آرام اس کو غیرِ پرواز
جرس کی طرح سرگرمِ فغاں تھا
برنگِ نالہ روز و شب رواں تھا
ہوا پر سبز طوطے فوج در فوج
نظر آنے ایسے جوں نیل[1] کی موج
ستم کش نے جو اپنی جنس پائی
قیاس ان کو کیا فضلِ الٰہی
خوشی سے ہوگیا طوطوں کا دمساز
"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"
لگا ہمراہیوں میں اڑنے دلشاد
نہ فکرِ دام و نے پروائے صیاد
خوش اس کو دیکھ چرخ حیلہ پیوند
ہوا اس غم میں تا اس کو کرے بند
کہ ناگہ ایک صیادِ فلک نام
برنگِ کہکشاں سر پر لیے دام

۱- نسخہ لکھنؤ : پنگ -

ہوا اس دشت میں وہ صید جویاں
قضا کے تیر کی صورت نمایاں

برنگِ دام چشم[1] اس نے دیے کھول
نظر آیا اسے طوطوں کا جب غول

شجر کی شاخ پر ہر ایک خود کام
لٹکتا تھا برنگِ میوۂ خام

خصوصاً ان میں وہ طوطا فسوں ساز
بسانِ ناز دل کش نغمہ پرداز

خیالِ پدمنی میں تھا غزل خواں
نہایت شوق سے جیوں نکتہ سنجاں

وہیں صیاد نے بے طاقتانہ
بچھایا جلد دامِ عاشقانہ

سرشکِ دل کا اس میں دانہ رکھا
قضا کی طرح چھپ کر آپ بیٹھا

طمع نے ڈالوں کے طوطوں کو گھیرا
اجالا دن کیا ان پر اندھیرا

زمیں کی سمت کو آخر وہ ناچار
گرے برگِ خزاں آسا بیک بار

نہایت شوق سے کھول اپنی آغوش
لپٹ ان کو گیا دامِ زمیں پوش

رہا حیرت سے پدماوت کا طوطا
بسانِ طائرِ تصویر بیٹھا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : برنگ چشم دام۔

نظر میں اس کی تھا دامِ فسوں کار
کہ تھا وہ ذوفنوں از بسکہ ہشیار
نہ اترا شاخ سے وہ مرغِ گستاخ
رہا مانندِ برگِ سبز بر شاخ
نہ اُلجھا دام میں وہ شوخ دیدہ
بسانِ طائرِ رنگِ پریدہ
ولیکن قید سے یاروں کی دل گیر
ہزاروں طرح کی کرتا تھا تدبیر
کبھی کہتا تھا پھنس جا کان اندوہ[1]
کہ ہے اک جشنِ عالی مرگِ انبوہ
کبھی کہتا تھا وہ حیرت سرانجام
کہ ہے آزاد کو کیا دام سے کام
جہاں میں دم غنیمت اپنی جان ہے
یہ سب کہتے ہیں جی ہے تو جہاں ہے
سراسیمہ وہ بیٹھا مضمحل تھا
دل اپنے سے اسے رد و بدل تھا
مروت نے اسے آخر نہ چھوڑا
خیال اس نے یہ دل میں اپنے جوڑا
کہ ہے طرز وفا سے دور یہ بلت
بروز بد نہ کیجے یار کا ساتھ
تڑپتے یار ہوں دامِ بلا میں
رہوں آزاد میں بیٹھا ہوا میں

۱۔ نسخہ لکھنؤ : بس ! جالکاہ الدوہ ۔

مروت کے سبب سے کام ناکام
ہوا ناچار وہ بھی طالبِ دام
بلا کے دام میں مرغِ خردمند
طلسمِ سخت کی صورت ہوا بند
اسی کا منتظر بیٹھا تھا صیّاد
کمیں سے[1] جلد اٹھ دوڑا وہ جوں باد
چلا طوطوں کو لے گھر کو شتاباں
برنگِ گردبادِ دشت ، رقصاں
ہمارے عصر میں کیا کہیے عبرت
فقط کہنے کو ہے نامِ محبت
یہ اپنے وقت کے جو آشنا ہیں
برنگِ عمر بالکل بے وفا ہیں
وفا حیواں کی دیکھی تو نے[2] بھائی
نباہا کیا ہے پاسِ آشنائی
یہ انساں گرچہ انساں ہے مقرر
وفا میں لیک ہے حیواں سے کمتر
بس اب موقوف کر تو یہ فسانہ
انھوں سے کر گریز شاعرانہ
تو اپنے مقصد و مطلب[3] پہ آجا
ہمیں احوال طوطے کا سنا جا

۱- نسخۂ لکھنؤ : کمیں میں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : دیکھو تو ۔
نسخۂ نول کشور و نسخۂ شیرانی : تو نے دیکھی ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : مطلب اور مقصد ۔

راجہ رتن سین والیِ چتور گڑھ کا طوطے کو مول لینا اور اپنا دل اس کی دانائی اور خوش گویائی پر دینا

اگر بیچے تو ہے مالک ، اگر بخشے رضا اس کی
نوشتہ خامۂ تقدیر کا کوئی مٹاتا ہے ؟

قلم کے ہاتھ سے ہے داد ! بیداد
رگِ دل چھیڑے ہے جوں نیشِ فصاد
عجب نیرنگ سے ہے نغمہ پرداز
ہر اک دم چھیڑ دیتا ہے نیا ساز
حقیقت شہر عاشق[1] کی ہے کہتا
نہیں اک لحظہ یہ خاموش رہتا
لکھے ہے صورتِ حال اب رتن کا
اسی کشور کا اور اس کے وطن کا
کہ ملکِ ہند میں سب کو یقیں ہے
چتور آسا کوئی خطہ نہیں ہے
کہ وہ جس قدر ہیں اس مکاں کے
برنگِ شمع مہرویاں ہیں بالکے
برنگِ ابروے شوخِ ستم ناک
ہر اک شمشیر زن ہے واں کا سفاک
و لیکن جتنے واں[2] خرد و کلاں ہیں
بسانِ عاشقاں اہلِ وفا ہیں

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : عالی ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : ولیکن واں کے جو ۔
وہ سب اہل وفا جوں عاشقاں ہیں

فلک کے دیدے[1] نے لاکھوں کیے دور
کوئی خطہ نہ دیکھا مثلِ چتّور
قضا را اک برہمن با دلِ زار
چلا چتّور سے ہمراہِ تجّار
جو عاشق کے وطن کا کارواں تھا
برنگ اشک روز و شب رواں تھا
شباشب[2] قطعِ منزل میں سبک پے
ہوئے جوں شوق مثل نشہ مے
پیادہ برہمن ہاتھوں کو ملتا
برنگ گرد تھا ساتھ اس کے چلتا
سراندیپ ان کے دل کا تھا جو مقصد
بسرعت قطع کی وہ رات بے حد
خریدا واں کسی نے حسبِ مقدور[3]
گُہر ، مرجان و عنبر ، مشک و کافور
برہمن خستہ دل کم مایہ ہر سو
خریدارانہ کرتا تھا تکاپو
جو تھا وہ بے بضاعت سخت ناچار
کھڑا تھا جنس ارزاں کا خریدار
کہ ناگہ چوک میں صیاد دیکھا
کہ طوطا بولتا وہ بیچتا تھا

۱- نسخہ لکھنؤ : فلک کی دید نے ۔
۲- نسخہ لکھنؤ : وہ سب ۔
۳- نسخہ لکھنؤ : خریدا ہر کسی نے واں بمقدور ۔

کبھی اشلوک کہتا پنڈتانہ
کبھی اشعار پڑھتا عاشقانہ
برہمن نے وہیں دے کر کئی دام
لیا صیاد سے وہ مرغِ خود کام
پھرا وہ قافلہ سب گھر کو ناگاہ
ہوئی چتور میں طوطے کی افواہ
کہ قدسی طائر اک لایا برہمن
کرے ہے جس کی سبزی چشم روشن
بسیرت آدمی صورت میں طائر
بسانِ عقل ہر اک فن میں ماہر
رتن بھی سن کے وصفِ طائرِ زار
دل و جاں سے ہوا مشتاقِ دیدار
وہیں طوطا حضور اپنے منگایا
ہُما کو روبرو اپنے بٹھایا
جو دیکھا رائے نے وہ مرغ خوشگو[1]
نہٹ ہشیار، دانا، آدمی خو
برہمن سے کہا کہہ مول اس کا
دعا دے کر وہ طوطا تب یہ بولا[2]
کہ اے راجہ ترا قایم رہے راج
رہے سرسبز جوں گردوں ترا تاج
برہمن کیا کہے گا مول تجھ سے
مری قیمت تو سن لے آپ مجھ سے

۱- نسخۂ لکھنؤ : خوش خو -
۲- نسخۂ لکھنؤ : آپ بولا -

مرے بدلے اگر ہاتھی تو دے گا
مجھے اس مول پر بھی مفت لے گا
کہ میں طائر فلاطونِ زماں ہوں
ہیں میرے بال و پر اوراق قانوں
حقیقت بحر و بر مجھ کو ہے یاد
فراست میں ارسطو کا ہوں استاد
نہایت علم مجلس میں ہوں ممتاز
زباں داں ، بید خواں[1] ، افسانہ پرداز
مری ہر بات ہے چوں حسنِ کامل
علاجِ قوتِ بیماریِ دل
برنگِ فکر شعرائے دل افروز
فلک کی سیر کرتا ہوں شب و روز
منجم کی طرح ہر خیر و شر میں
ہیں میری سبع سیارہ نظر میں[2]
برنگِ جامِ جم با چشمِ بیدار
جہاں کے رازسے ہوں میں خبردار
مرے ہر آن دل میں ہیں بدیہی
کھلے سب حالِ استقبال و ماضی[3]

۱۔ نسخہ لکھنؤ : بند خواں ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : منجم کی طرح ہر چیز و شے سے
مری یہ سب نظر میں ہیں ستارے
۳۔ نسخہ لکھنؤ : مرے میزان دل میں بدمنی تھی
کُھلا سب حالِ استقبال و ماضی
متن کے شعر کے پہلے مصرعے میں 'ہیں' کی رعایت سے ~~دوسرے مصرعے~~
میں کھلا (اصل) کی بجائے کھلے ہی ہونا چاہیے تھا ۔

غرض سن کر ہوا حیرت میں راجا
عوض اک گنج کے طوطا خریدا
خوشی سے پھول کر گھر کو برہمن
گیا لبریز جوں گل زر سے دامن
نہایت خوش ہوا طوطے سے راجا
کہ ہاتھ آئی اسے سونے کی چڑیا
وہیں استاد اک زرگر بلایا
قفس زرینہ جوں خاتم بنایا
وہیں چرکینہ پنجرے کو کیا دور
اسے دھویا بآب و مشک و کافور
نئے زریں قفس میں سبز طوطا
زمرد کے نگیں کی طرح رکھا
نہایت تلخ کام و جان غم ناک
نظر آیا اسے وہ طائرِ پاک
کیا آب و خورش اس کا مقرر
گلابِ خالص و قندِ مکرر
اسے دامِ محبت نے جو گھیرا
دیا طائر کے تئیں[۱] دل میں بسیرا
برنگِ بختِ سبز اس کو باعزاز
کیا تھا ہم نشین و محرمِ راز
درون و چہ برون خلوت چہ جلوت
جدا کرتا نہ اس کو ایک ساعت

۱- نسخہ لکھنؤ : طائر کو ہی -

ولے ہنگامِ عزمِ صیدِ صحرا
اسے رانی کو جوں دل سولے جاتا

یہاں راجہ رتن سین کا شکار کو جانا اور ناگمت رانی کے ظلم سے دائی کا طوطا چھپانا

زباں کا تھا مناحق میں ہنرمندوں کے بہتر ہے
سخن ورنہ برنگِ خامہ یاں سر کو کٹاتا ہے

سخن سنجِ معانی محرمِ راز
ہوا ہے اس طرح سے نکتہ پرداز

کہ اک دن دشت و صحرا میں رتن سین
شکار افگن تھا باصد زینت و زین

پہنچ کر لیزہ باز اس جا ہزاراں
بنایا دشت میں تازہ نیستاں

بلوں نے دھوم جنگل میں مچائی
غضب کی آتش اس بن میں لگائی

تڑپتا شیر تھا گولی کا مارا
ہوا بندوق کے آگے چکارا

کھڑا مستانہ ہاتھی جھومتا تھا
کہ گولی کھائی تھی سر[1] گھومتا تھا

گریزاں کرگدن جاتا تھا گھائل
نہ روکے ڈھال تیغوں کے مقابل

۱- نسخہ لکھنؤ : ہر -

کوزن و شیر اور چیتے چکارے
وہ کرگ و روبہ و خرگوش سارے
پڑے تھے لکڑے ٹکڑے جابجا یوں
کھلونے جیسے مٹی کے اجڑے ہوں[1]
لگا آخر کو چھپنے آن کر تیر
کماں کے حلقے میں جوں شیر تصویر
وہ رانی اس کی زلف عنبریں فام
کہ اس کا ناگمت مشہور تھا[2] نام
سنگار اپنا کیا اس نے سراپا
کہ جیوں دستور ہوتا ہے نسا کا
کناری اوڑھنی کی مثل دل خواہ
نمایاں تھی برنگ ہالہ ماہ
لباس تاش میں رخشاں وہ دلبر
شعاعی خط میں جوں خورشید انور
وہ ڈورا سرمے کا اور چشم گلفام
رم آہو کا تھا اک حلقہ دام
نظر میں برق ساں وہ قد نہ آتا[3]
جو میں اس شوخ کا لکھتا[4] سراپا

۱۔ نسخہ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل شعر بھی تھا :
رتن ہرچند آپ آہو نما تھا
پلنگ افگن ولیکن ہو گیا تھا
نسخہ مصطفائی ، نسخہ نول کشور و نسخہ شیرانی میں یہ شعر نہیں ہے ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : ناگ متی تھا رکھا ۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ : آیا ۔
۴۔ نسخہ لکھنؤ : کہتا ۔

غرض بن ٹھن کے وہ غارت گرِ دل
رخ آئینے سے کرتی تھی مقابل
نظر آیا اسے اپنا جو عالم
مصفا چہرہ و ابروئے پُر خم
نگہ کرکے وہیں حسنِ خو آئیں
ہوئی عاشق وہ اپنے آپ خود میں
اسی اغماض میں تیوری چڑھا کر
قفس طوطے کا ہاتھوں میں اٹھا کر
کیا آئینہ ساں اس کی طرف رو
کہا ہنس کر کہ اے مرغ سخن گو
نہایت تو پھرا ہیگا جہاں میں
رہا اکثر ہے بزمِ گل رخاں میں
بہارِ سبزہ کی مانند ہر جا
ہر اک صورت کا گل ہے تو نے دیکھا
چِترنی پدمنی کو جانتا ہے
ہر اک کا حسن تو پہچانتا ہے
پدم کا تو نے ہیگا[1] ناز دیکھا
ہے اس کے حسن کا انداز دیکھا
قسم دیتی ہوں تجھ کو مجھ سے سچ بول[2]
ٹک اپنے دیدۂ انصاف کو کھول

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہوگا ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : کچھ بول ۔

کہ میرا حسن بہتر یا پدم کا
بتادے فرق جو ہو بیش و کم کا
یہ باوہ گوئی طوطے نے جو کی گوش
رہا جوں بلبلِ تصویر خاموش
وہ خاموشی کو رانی نے نہ بوجھا
خیالِ خام سے پھر اس کو[1] پوچھا
کہ گر حسنِ پدم ہے مجھ سے بہتر
تو کہہ دے سچ ، نہ رہ زنہار ششدر
ہوئی جب پھر کے رانی باد پیما
اٹھا طوطے کے سر میں[2] اک دھواں سا
کہا رانی سے سن اے ناز پرور
رہے نت چترِ دولت تیرے سر پر
پدم کی بات سچ مت پوچھ مجھ سے
کہ ہے وہ گل نہایت دور تجھ[3] سے
اگرچہ تو بھی اک رشکِ پری ہے
ترے ہر عضو میں جادوگری ہے
ولیکن اس پری رو کا کفِ پا
ترے منہ سے کہیں دلچسپ ہوگا
جو دیکھے شکل تو اس دلربا کی
نظر آوے تجھے قدرت خدا کی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : اس سے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : دل سے ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : مجھ سے ۔

نکل آوے جو خورشیدِ جہاں تاب
فروغِ منہ اڑے مانندِ سیماب
ہوئی جب گوش زد رانی کے یہ بات
وہیں سوچی کہ یہ طوطا ہے بد ذات
غضب سے اپنی دائی کو بلایا
یہ قصہ درد کا اس کو سنایا
کہ اے غم خوار یہ طوطا نہیں ہے
مرے حق میں یہ مار آستیں ہے
اگر یہ قصہ راجا کو سناوے
مرا نقش اس کی نظروں سے[1] مٹاوے
پدم کا عشق اس کے دل میں گڑ جائے
یہ گھر بستا ہوا دم میں اجڑ جائے
وہ ہو مجنوں کی صورت دشت پیما
ہو جاوے[2] بستے گھر میں فتنہ برپا
مرا آباد گھر کر دے گا حیواں
دلِ عشاق کی مانند ویراں
یہی بہتر کہ[3] اس کو ذبح کر ڈال
بلائے ناگہاں گھر سے مرے ٹال
وہ دور اندیش دائی تھی جو دانا[4]
مآل اس کار کا سوچی سراپا

۱- نسخۂ لکھنؤ : اس بھر دل سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : گو ہووے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہے -
۴- نسخۂ لکھنؤ : دانا تھی جو دایہ -

رتن کی طبع سے ہو کر ہراساں

کیا طوطے کو اپنے گھر میں پنہاں

اسی صورت کا اک طوطا منگایا

اسے کر ذبح رانی کو دکھایا

کہا دل شاد رکھ[1] اے مونس جاں

کہ انساں ہووے کیا حیوانِ ناداں[2]

جو وقتِ شب رتن با خاطرِ جمع

ہوا رونق فزائے خانہ جوں شمع

وہیں اس سادہ دل خاتوں نے اول

سنایا راۓ کو یہ قصہ مجمل

کہ میں نے حسن اپنا تھا بتایا

ترے طوطے نے شاید رشک کھایا

اٹھا کر ترش رو سرخام کردار

سیندوری انبہ کی صورت نمودار

لگا بیٹھا مرے دل پر خرد گم

سرِ منقار مثلِ نیشِ کژدم

مرا حقِ نمک اس کو جو بھولا

یہ کہتا تھا وہ مجھ سے پھولا پھولا

کہ میں دیکھی ہے اک مہ روئے گلرنگ

ہے تیرا حسن جس کے آگے پاسنگ

کہا اتنا کہ گھر کی گربہ گمراہ

پڑی جا کر قفس پر اس کے ناگاہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : رہ ۔

۲- نسخۂ لکھنؤ : حیواں سے نالاں ۔

فغاں ہم نے کیا[1] پر کچھ نہ تھا سود
سزائے کذب کو پہنچا وہ مردود
رتن نے سن کے اس قصے کو سوچا
کہ آج اس دال میں کچھ ہیگا کالا
سپید و سرخ ہو غصے سے بے تاب
برنگ اشک خونی ہو گیا آب[2]
غضب سے بولا اے برگشتہ اختر
تو میرے سامنے یہ مکر کم کر
تو کر طوطے کو میرے جلد پیدا
ہے تیرا مکر سب مجھ پر ہویدا
و اِلا سن یہ رانی ناگ متی ![3]
ہر اس کے لیکے ہو جا تو بھی ستی[4]
جہاں طوطا گیا تو بھی وہیں جا
نہ کر تو آپ کو ناحق میں رسوا
جہاں میں راج ہٹ ہوتا ہے مشہور
خصوصاً واجبی تھا یہ جو مذکور
ہوا رانی کے دل میں خوف پیدا
چھٹی کا دودھ اس کو یاد آیا
سر اس کے سے اڑا اک بارگی ہوش
ہوا خواب و خورش اس کو فراموش

۱- نسخۂ لکھنؤ : نہایت غل کیا۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : رانی ناگمت تو۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : اب ہو جا ستی تو۔

گئی تب دائی کے آگے ہراساں[1]
تدرو آسا بچشمِ سرخ گریاں
سر اپنا پیٹ کر اور کر کے زاری
تظلم خواہ کی صورت پکاری[2]
کہ مثلِ زلف میرے سر پہ دائی
بڑی کالی بلا امشب ہے آئی
اگر طوطا نہیں اب ہاتھ آتا
تو میرے ہاتھ سے راجہ ہے جاتا
غرض دائی نے سن کر یہ فسانہ
کھجانا اس گھڑی بہتر نہ جانا
وہیں اٹھ کر برائے پاس خاطر
کیا جلدی سے اس طوطے کو حاضر
وہیں طوطا جو دیکھا لائی دائی
گئی جاں اس کی پھر قالب میں آئی
رتن کے پاس لے آئی وہ طوطا
کہا بس میں نے راجہ تم کو دیکھا
تجھے میں آزماتی تھی ، نہ کر دھوم
کیا بس میں نے تیرا پیار معلوم[3]
کہ اک طوطے کے بدلے اے جفا جو
مجھے بے آبرو کرنے لگا تو

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : گئی دایہ کے پاس اٹھ کر ہراساں ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : طرف دایہ کے وہ اس دم پکاری ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس کے بعد کا شعر مقدم مؤخر ہیں ۔

الا اے طوطیِ دانائے اسرار
لگا دیتی ہے آتش تیری منقار
پدم کا تو بیان کرکے سراپا
سراپا کیوں مجھے ہے تو[1] جلاتا

بیان حسن پدماوت کا زبان طوطے سے بموجب استفسار راجہ رتن سین کے

حذر کرنا پری رویوں سے اے دل تجھ کو بہتر ہے
کہ ان کا قد سراپا آہ شعلہ سا دکھاتا[2] ہے

قلم کی آتشیں منقارِ بلبل
لکھے ہے یوں شکست ساغر گل
کہ جب راجا نے اس طوطے کو پایا
برنگِ سرمہ آنکھوں سے لگایا
اسے خلوت میں لے جا کر یہ پوچھا
چھپا رکھا تجھے رانی نے کیوں تھا
پدم ہے کون جس کے حسن کا تو
بتاتا تھا جو پاسنگ اس پری کو
بطورِ راستی کھول اپنی منقار
سخن کی بو کر اس غنچے سے اظہار
یہ سن کر قصہ وہ مرغِ خوش الحاں
ہوا مثلِ صدف یوں گوہر افشاں

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ ہے - نسخۂ اول کشور : تو ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : دہکتا -

کہ اے گلدستۂ باغِ مروت
کہوں کیونکر پدم کی میں حقیقت
ابھی بھولے سے نام اس کا لیا تھا
سو حکمِ قتل رانی نے دیا تھا
بچایا مرگ سے دائی نے فی الحال
ملے تھے خاک میں ورنہ پرو بال
اگر میں راستی اب کے[1] کہوں گا
خدا جانے کس آفت میں پڑوں گا
مثل ہے یہ غلط ہرگز نہیں سانچ
کہ کہتے ہیں نہیں ہے سانچ کو آنچ
ہے کجبازوں کے دل سے راستی دور
کہ ہے ''الحق مرٌ'' قولِ مشہور
صفت اس سرزمیں کی میں کہوں کیا
چترنی پدمنی جس جا ہوں پیدا[2]
و لیکن میں پدم ہوں نمک خوار (؟)
ہوں اس کے قد کی صورت راست کردار
کہوں اک قصہ[3] غارت گرِ ہوش
کہ ہو خواب وخورش تجھ کو فراموش[4]

۱- نسخۂ لکھنو : اُن کی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -
۳- نسخۂ لکھنؤ : داستاں -
۴- نسخۂ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل ایک شعر اور بھی ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ملتا :

نہ تنہا سن کے تو ہو شاد و خرسند
تو ہووے جان و دل سے آرزومند

سرالدیپ ایک معمورہ ہے دل شاد
سمندر کے وہ ٹاپو میں ہے آباد[1]
برنگِ چشم گردِ شہر دریا
رہیں ہیں لوگ اس میں مردم آسا[2]
جو گرد و پیش بستی کی فضا ہے
رخِ خوباں کی صورت دل کشا ہے
نہ ہوں کیونکر وہاں کے لوگ ستھرے
کہ واں جنت کے باشندے ہیں اترے
عدن کو چھوڑ کر جو آئے آدم[3]
ہوئے آب و خورش سے واں کے[4] خرم

۱- نسخہ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد ایک شعر اور ہے :

سراپا حسن و خوبی سے ہے معمور
رہے ہے آفت و آسیب سے دور

۲- نسخہ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل اشعار بھی ہیں جو دوسرے نسخوں میں نہیں ملتے :

بنے ہیں کوچہ و بازار مرغوب
عمارت ہائے سنگیں و خوش اسلوب
نہایت جنس واں ہر ایک سستی
ہر اک بستی ہے معشوقوں کی بستی
مکاں یک دست واں کے رشک رضواں
مکیں واں کے سراسر حور و غلماں

۳- نسخہ لکھنؤ : جو آئے آدم -

۴- نسخہ لکھنؤ : ''آب و ہوا سے واں کی'' - اس جگہ اس نسخے میں مندرجہ ذیل اشعار زائد ہیں جو دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں :

اثر آب و ہوا کا کیا بیاں ہو
کہ جس سے پیر بھی مثلِ جواں ہو

بسا ہے موجِ ہوا کی واں کی تاثیر
کہ کرتی دل کو ہے جوں زلف تسخیر
مگر وہ قصبہ ہیکا پرئیاں کا[1]
کہ واں تصویر کا عالم ہے بستا
خرد حیراں ہے جو پانی کے اوپر
بسا ہے عالمِ تصویر کیونکر
جو اس خطے کا ہے اب کارفرما
اسے کہتے اب گندھرب سین راجا
قلم آسا ہے اس کے عدل کا ٹھاٹ
گوزن اور شیر پانی پیویں اک گھاٹ[2]
ہے اس کے پردۂ عصمت میں دختر
بہ پیکر پدمنی خورشید منظر

خزاں کا واں نہیں ہرگز گزر ہے
بہارِ جاودانی ہر شجر ہے
درختوں پر ہیں مرغانِ غزل خواں
کہ جس زمرے کا میں ہوں ایک ناداں
خس و خاشاک واں کا گلستاں ہے
چمن ہر ایک واں رشکِ جناں ہے
مثال اس کی بھلا کس کس سے میں دوں
ہے اس کی شان میں یہ شعر موزوں
"اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است"

۱- نسخۂ لکھنؤ : قطع ہیکا پرستان کا ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : اس کے بعد یہ ایک شعر اور ہے :
شجاعت اور سخاوت میں بہت طاق
نہایت خلق میں مشہورِ آفاق

ہوئی جو پدمنی مخلوق گلفام
پدر نے اس کا پدماوت رکھا نام

ٹھہرتا ہی نہیں نظارہ اس پر[1]
کوئی سورج کو دیکھے کیا برابر

کہوں کیسا ہے اس کا قد و قامت
بلا و فتنہ و آفت قیامت[2]

نظر جس کو پڑا اس کا سراپا
وہیں دل سے اٹھا اس کے بھبھوکا

جو کوئی دیکھے وہ موئے سیہ فام
بلا ٹوٹے وہیں اس پر سر شام

۱- نسخۂ لکھنؤ : "ٹھہرنے کی نہیں آنکھ کے منہ پر" ، اس نسخے میں یہ شعر پہلے اور اس سے پہلا شعر بعد میں درج ہے -

۲- نسخۂ لکھنؤ میں اس کے بعد مندرجہ ذیل اشعار دوسرے نسخوں سے زائد ہیں :

نگاہِ مست اس کی جس پہ پڑ جائے
تو اس کا خانۂ دل بس اُجڑ جائے

ادا و غمزہ آفت کی نشانی
غرض ہے اک بلائے ناگہانی

نزاکت کیا بھلا اس کی بیاں ہو
کہ اک گل برگ بھی اس پر گراں ہو

خدا نے یہ دیا حسن دل افروز
کہ ہیں مشتاق مہر و مہ ، شب و روز

صفا میں اس کی ہمسر کب قمر ہے
اسی کے رشک سے داغ جگر ہے

عجب ہے حسن اس کا جاودانی
فلک نے بھی نہ دیکھا اس کا ثانی

جواہر بال بال اس کے میں افزوں
الدھیری شب میں‌جیوں چمکے ہے جگنو
عیاں موئے سیہ سے اس کے یوں فرق
سیہ بادل میں چمکے جس طرح برق
نمایاں مانگ ہے یوں اس کے سر پر
عمک پر جیسے کھینچا ہو خطِ زر
عیاں موئے سیہ سے فرق پر نور
برنگِ شعلہ بالائے سرِ طور
وہ لیچے پٹی[1] عرابی جو دیکھے
وہیں زاہد زمیں پر سر کو پٹکے
جو باندھے کھینچ کر جوڑا وہ مغرور
بندھادل واں سے چھوٹے کیا ہے مقدور[2]
وہ ڈھیلا پیچ ہے جو اس کا سادا
نہ چھوٹے اس میں آ رستم کا دادا
عجب رہتا ہے وہ موبند از تار[3]
شبِ یلدا میں جوں ثاقب نمودار
جو سر میں تیل ڈالے تھی سہیلی
رکھا تھا نام اس کا بھی چنبیلی

۱- نسخۂ لکھنؤ : ''وہ ابرو اس کی'' - اس شعر کے بعد ایک زائد شعر بھی ہے :

رگ ابرو سے گر دے وہ اشارہ
تو بس عاشق کا دل ہووے دوپارہ

۲- نسخۂ لکھنؤ : تو ہووے عاشقوں کا دل وہیں چور -
۳- نسخۂ لکھنؤ : موئے زر تار -

ذقن وہ چہ صفت مژگاں وہ خونخوار
وہ کاکل اژدہا ، زلفِ سیہ مار
کہا یہ جس نے یوں زلفوں کو دیکھا
یہ لشکر بے طرح شب خوں کرے گا[1]
کہوں کیا جس گھڑی وہ درۃ التاج
کرے زلفوں میں اپنے شانۂ عاج
نمایاں شانۂ زلفِ گرہ گیر
ہے ابیض فیل کے دانتوں میں زنجیر
غلط میں نے یہ دی ساتھ اس کے تمثیل
کجا زنجیر دندان و کجا فیل
سیہ زلفوں میں اس کے شانۂ عاج
رواں مانندِ مہتابِ شبِ داج
غرض وہ زلف جو ہے با صد امید
شعاعی خط کا لادے شانہ خورشید
ہے دل اس مانگ کے رستہ میں ششدر
کہ آدھی رات اندھیری جائیں کیدھر
تہِ زلف اس کے وہ کن پھول زیبا
گلِ خوشبو ہے جیسے شب کو پھولا
کوئی کس طرح سے دیکھے بنا گوش
نظارے کا اڑا جاتا ہے واں ہوش
کہ وہ زلف اور لڑیاں موتیوں کی
سیہ ناگن ہے جیوں انڈوں پہ بیٹھی

۱- نسخۂ لکھنؤ میں یہ اور اس کے بعد کے دو شعر ندارد ۔

وہ جس پر ناز سے چیں بر جبیں ہو
اگر ہووے گدا خاقان چیں ہو
جبیں پر اس کے ٹیکا آشکارا
سحر کا جس طرح نکلے ہے تارا
مگر اک مصرع قد پر مبیّن
ہے زر کا انتخابی نقطہ روشن
دبا لیتے ہیں دم میں صید دل کو
بہ رنگ ناخن شیر اس کے ابرو
وہ بیمار آنکھیں ہوویں کیا شفا خیز
نہیں کرتی غذائے خوں سے پرہیز
مگس کی طرح دل ہے اس پہ بیتاب
ہے اس کی چشم میں شاید شکر خواب
میں اس کے چشم کی شوخی کہوں کیا
کہ جس کی شکل سے ہے خوں برستا
اسی کا عشوہ و غمزہ پکارے
کہ دل یاں ہم نے ہیں تیغوں سے مارے
کنارے چشم کے اک خال بیکا
کہ جیسے بچۂ آہو ہو بیٹھا
مشابہ کرکے اس کے رخ سے اکثر
بناتے آئنہ ہیں آئینہ گر
عجب حسن رخ و چشم بلا زاد
کیا جس چہرے پر اللہ نے صاد
جو ہووے آئنہ اس رو سے ہمسر
وہ مژگاں گھس پڑیں مانند جوہر

جو روئیں تن کے[1] وہ سینہ کو توڑیں
بھلا پھر اور کس سے منہ کو موڑیں

نوکیلی، خوش نما بینی طرح دار
ہے گویا حسن کے طوطے کی منقار

لبوں کی کیا کہوں میں دلربائی
کہ ہے دندان مصری کی مٹھائی

مسی مل کر جو برگِ پان چبائے
وہ لب جوں برگ نافرماں دکھاوے

دہن میں اس کے ہے وقتِ تکلم
برنگِ غنچہ اک رنگیں تبسّم

ہنسی، قہقہ وہ[2] جب مانند مینا
گلوئے نازنیں سے جلوہ گر تھا[3]

ہوا عالم دہن کے اس کے غم میں
کہ دیکھیں جا کہیں خوابِ عدم میں

دُرِ دنداں دہن میں یوں ہیں باہم
نہاں غنچے میں جوں قطرات شبنم

چبا کر پان منہ اس نے کیا لال[4]
چھپائی خونخوری کس ڈھب سے فی الحال[5]

۱- نسخۂ لکھنؤ: جو رو سے بھکے۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: ہنسی وہ قہقہہ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ: سے ہے دکھاتا۔
۴- نسخۂ لکھنؤ: لعل۔
۵- نسخۂ لکھنؤ: یہاں بسمل ہوئے عشاق فی الحال۔

کہ جیوں میخوار کھا لیتے ہیں کچھ شے
برائے دفعِ بوئے ظاہرِ مے
جو سرخی پان کی پھیکی وہ پڑ جائے[1]
وہ لب جیوں شربتی یاقوت دکھلائے
دہن پر حلقۂ نتھ کیا کہوں یار
ہے مرکز پر طلائی خطِ پرکار
وہ پونچھے دھو کے یوں رومال سے رو
لپیٹیں جس طرح کپڑے میں گل کو
زنخ پر اس کے ہے جو خوش نما تل
کسی عاشق کا جل کر رہ گیا دل
عجب گردن ہے جس کا حسن پرتو
ہے بزم آرائے دل جیوں شمع کی لو
وہ اس کا ساعدِ سیمیں، وہ بازو
ہے حسنِ روز افزوں کی ترازو
وہ پنجہ ہے کہ جس پر لڑ کے باہم
حنا کا قتل ہو جلتا ہے عالم
جو دیکھا حسن اس سینے کا رخشاں
ہوا آبِ بقا ظلمت میں پنہاں
وہ زیور اور کناری سینہ فرسائے
ہے عکس ماہ جوں دریا میں لہرائے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: لک پھیکی پڑ جائے۔ نسخۂ نول کشور: پھیکی سی پڑ جائے۔

مصفا سینے پر جوں تل عیاں ہے
کسی کے مردمک کا وہ نشاں ہے[۱]
پڑی سینے پہ ہے یوں زلفِ بیتاب[۲]
اگا ہو جیسے سنبل بر لبِ آب
مصفّا سینے پر زلفِ دل آرا
نظر آتی ہے مثلِ موجِ دریا
جو زلف اس کی ہے پستاں کے مقابل
ہے برجِ سنبلہ میں بدر داخل
نہ ہو کیونکر فرح بخشِ دلِ زار
وہ پستاں میں طلائی دست افشار
مگر لوگوں کی نظروں سے بچا کر
رکھے دو دل ہیں انگیا میں چھپا کر
کبھی نظارہ کہتا ہے کہ شہباز
پکڑ کے[۳] ڈور سے باندھے ہے طناز
نہیں ہے اب تلک وہ دست آموز
اسے ٹوپی میں رکھتے ہیں شب و روز
وہ انگیا ہے مگر ابرِ بہاری
کہ نت چمکے ہے واں برق و کناری[۴]
کہوں کیا حلقہ اس نازک کمر کا
ہے چشمِ حور کے سرمے کا ڈورا

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ شعر اس جگہ سے تیسرے نمبر پر ہے۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : وہ زلف پرتاب۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : کمر کے۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : برقِ کناری۔

لکھے[1] کیونکر کمر کا اس کے انداز
کہ حائل ہے کمر کے چین پشواز

نہیں چلتی نکہ کی تیز بینی
دکھائی دے ہے کمتر موئے چینی

نہ پہنچا ناف تک اس کے قیافہ
کہ تھا وہ حسن کے آہو کا نافہ

حیا آگے ہے بس اب منع کرتی
سرِ عجز اپنا ہے زانو پہ دھرتی

کہوں آئینۂ زانو کی کیا بات
کہ ہے وہ عینکِ چشمِ خیالات

شگوفہ ارغواں کا واں نہاں ہے
نہیں ساق[2] اس کی ، شاخِ ارغواں ہے

حنائی وہ کفِ پائے نو آئیں
گلِ مہدی سے بھی ہے شوخ رنگیں

کہوں کیا جلد کی اس کی صفائی
ہو جیسے دودھ پر ہلکی ملائی

جو پہنے شوخ نافرمانی جوڑا
نظر آتی ہے جوں لنکا میں سیتا

اگر پہنے وہ جوڑا ارغوانی[3]
ہو شادی مرگ عالم ناگہانی

۱- نسخۂ لکھنؤ : لکھوں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : وہ شاخ اس کی دو شاخِ ارغواں ہے - نسخۂ نول کشور و نسخۂ شیرانی : وہ ساعد اس کی -
۳- نسخۂ لکھنؤ : زعفرانی -

اگر دامن وہ شوخی سے جھٹک جائے
پری کی آنکھ میں بجلی چمک جائے
وہ اودی[1] تاش کی سنجاف داماں
کہ لپٹی ہے کسی کی آہِ سوزاں
نزاکت سے لباس اس گل بدن کا
بجز شبنم نہیں تن زیب ہوتا
بدن سے اس کے زیور کو جلا ہے
کہ جیسے آگ پر رکھا طلا ہے
سجے ہے موتیوں کا اس کو زیور
کہ گل کو زیورِ شبنم ہے بہتر
جو حسنِ گرم آئینے کو دکھلائے
وہیں سیماب آئینے کا اڑ جائے
اسے کس پیار سے آئینہ لے کر
چھپا لیتا ہے اپنے دل کے اندر
ولیکن عکس وہ شوخی سے جاوید
نکل جاتا ہے مثلِ عکسِ خورشید
حیا میں کیا کہوں اس فتنہ گر[2] کی
عرق کرتی ہے گرمی سے نظر کی
نظر آتا ہے وہ اس کا[3] پسینہ
جڑا کندن پہ ہیرے کا نگینہ

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : نہیں ہے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : جلوہ گر ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : اس تن پر ۔ نسخۂ نول کشور و نسخۂ حیرانی : اس کا وہ ۔

جو ہو اُس آتشیں رو کے مقابل
سپند آسا کھلے ہے عقدۂ دل

جو دل اس مست کی آنکھوں سے اٹکا
لہو بھر کر[1] وہیں مینا سے ٹپکا

دل گریاں جو زخم اس چشم سے کھائے
وہیں جوں زخمِ روے آب مل جائے

غرض میں کیا کہوں اس کا سراپا
کہ ہیں دلچسپ اس کے جملہ اعضا

ہنوز اس گل کا غنچہ وا نہیں ہے
صبا نے اب تلک چھیڑا نہیں ہے

نہیں لاقے پہ[2] کھایا دشنۂ تیز
وہ آہو اب تلک ہے وحشت انگیز

برائے شمع بزم ماہ سیما
جو ہو سورج لگن تو کیا ہے اچھا[3]

رتن یہ ماجرا سن کر یک بار
ہوا حیرت سے مثلِ نقشِ دیوار

پدم کے عشق نے دل میں کیا گھر
اٹھا سینے میں اس کے جوشِ محشر

وہ طوطا بھی ہوا کہہ کر پشیماں
رہا جوں طائر تصویر حیراں

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : لہو پی کر ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : سینے پہ ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : جو سورج ہو لگیں کیا ہے اچنبھا ۔ نسخۂ نول کشور و نسخۂ شیرانی : وہ کیا ہے اچھا ۔

الا اے نقش بندِ دفترِ عشق
الا اے معنیِ صورت گرِ عشق
محبت کی تو کھینچ اس دل پہ تصویر
کروں تا میں رتن کا عشق تحریر

رتن سین کا غائبانہ پدماوت پر عاشق ہو جانا اور لباسِ بادشاہی چھوڑ کے جوگی کے بھیس میں آنا

فلک بے مہر داغِ عشق جس کے دل میں پاتا ہے
برنگِ مشعلِ کشتہ اسے اکثر[1] جلاتا ہے

کروں کیا عشق کا میں وصف ارقام
کہ فرماتے ہیں حضرت مولوی جام[2]
''نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حسن از رہِ گوش
ز جاں آرام برباید ز دل ہوش''[3]
دلیل اس قول پر میں نے دوبارا
رتن کا حال دیکھا آشکارا
کہ جب وہ طائرِ حیرت سر انجام
ہوا خاموش کہہ کر قصۂ تام
رتن کا سن کے یہ احوال جانکاہ
اڑا دل سینے سے جوں شعلۂ آہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : دم میں ۔
۲- مولوی جام سے مراد مولانا عبدالرحمٰن جامی ہیں ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

تڑپنے لگ گیا بستر پہ بیدل
کہ مچھلی سا[1] ہوا بے تیغ بسمل
برنگِ غنچۂ نرگس وہ رعنا
جو تھا بیمار مادر زاد پیدا
محبت کی ہوا گرمی سے بیتاب
برنگِ اشکِ خونی ہو گیا آب[2]
برسنے اس کے چہرے سے لگا درد
گل خورشید کی صورت ہوا زرد
لگا خوں اشک کے ہمراہ آنے
لگا آتش کو پانی میں بجھانے
رخِ تاباں سرشکِ دل میں غرقاب
ہوا خورشید آسا چشمۂ آب
کہاں بجھتا تھا اس کا شعلہ دلکش[3]
بجھے کب مہر[4] کے چشمے سے آتش
گرا رو رو کے آخر کو وہ مدہوش
برنگِ ابرِ صد طوفاں در آغوش

۱- نسخۂ لکھنؤ : سمک آسا ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : "لگا رنگ اڑنے اس کا مثلِ سیماب" اور اس کے بعد ایک شعر اور ہے :

سفید و سرخ تھا وہ جانِ بیتاب
برنگِ اشکِ خونی ہوگیا آب

۳- نسخۂ لکھنؤ : سرکش ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : بحر ۔

یہ سن کر حال اس کا پُر مصیبت

ہوئے جمع آ کے سب ارکانِ دولت

لگے تدبیر کرنے واں اطبّا

گلابِ خالص اس کے منہ پہ چھڑکا

بنا کر لخلخہ اس کو سونگھایا

جو اس بیدل کو قدرے ہوش آیا

سبھوں نے اس سے پوچھا کاے دل افگار

ہوا کیا تجھ کو کر ٹک حال[1] اظہار

ہر اک کے منہ کو تکتا تھا وہ حیراں

کھلے دیدہ برنگِ جسمِ بے جاں

جواب اس کے جو منہ سے کچھ نہ پایا

لگا سر پیٹنے دستور دانا

ملنگوں کی طرح بیٹھا زمیں پر

کہا مجھ سے تو بول اے جان مضطر

ذرا پہچان تو مجھ ناتواں کو

قدیم اس آستاں کے جاں فشاں کو

ہوا کیا تجھ کو ایسا یہ جو ناگاہ

مصاحب ہو گیا با نالہ و آہ

نہیں بن روئے کیوں تیرے تئیں چیں

ہوئیں کیوں مجمع البحرین عینین[2]

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : حال اپنا کر ۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

تری آنکھوں نے یہ صورت بنائی
پڑی کشتیِ مردم در تباہی[1]
ترے منہ کا کیا رونے نے کیا رنگ
جو پھیکے گل کی صورت اڑ گیا رنگ
یہ کیسا زخم تجھ کو کھا گیا ہے
جو بسمل کی طرح تو لوٹتا ہے
ترا آہوں سے شاید دل ہے جلتا
دھواں بھی[2] تیرے منہ سے ہے نکلتا
تو ہے کس شعلہ‌رو کے غم سے دلتنگ
ہوا ہے زرد کس مہتاب سے رنگ
تو مجھ کو درد سے کر اپنے آگاہ
برنگِ نغمہ اس پردوں میں دے راہ
جو کچھ اس کا تدارک ہو تو فی‌الحال
کروں تجھ پر تصدق جان اور مال
غرض رو رو کے وہ دستور عاقل
رتن سے پوچھتا تھا حالتِ دل
وزیر اپنا جو غمگیں اس نے پایا
لبِ آتش فشاں کو یوں کیا وا
کہ مثلِ تار اے غم خوار دستور
مری رگ رگ میں ہیکا نالہ مستور[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : تری آنکھوں کی یہ حالت ہے واہی
ہو جیسے کشتیٔ مردم تباہی
۲- نسخۂ لکھنؤ : دھواں سا ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہیگی تار مستور ۔

تو کچھ مت پوچھ مجھ سے اے ستم کش
لگی ہے ناگہانی دل کو آتش

مرا شعلہ مجھے دشوار ہیگا[1]
چنار آسا ہے آتش دل میں پیدا

کہوں کیا تجھ سے میں اس سوز کی بات
کہ گزرے دل میں اک لب کے خیالات

چراغ آسا دلِ دیوانۂ من
ہوا یاقوت کی آتش سے روشن

تعجب ہے لبِ میگوں سے فی الفور
لگی آتش مرے سینے میں[2] اس طور

انار آسا مرا غم خواریوں سے
لبا لب دل ہے سب چنگاریوں سے

نہ نکلے کس طرح آہ شرر بار
کہ آتش دے ہے ہر ساعت مرا یار

سنا ہے میں نے آتش کا[3] فسانہ
ہوا ہے سینہ یہ زنبور خانہ

مرے سینے سے دل نے منہ کو موڑا
یہ گھر ہاتھوں سے زنبوروں کے چھوڑا

مجھے دل اب اسی جانب[4] کشاں ہے
کہ عنقا کی سی صورت[5] بے نشاں ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ : مجھے مذکور ہے کیا -
۲- نسخۂ شیرانی : سینے سے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : مژگاں کا -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اس دل آپ اس جانب -
۵- نسخۂ لکھنؤ : کہ جو عنقا کی صورت -

یہ کہتا ہوں کہ جوگی ہو کے جاؤں
نشاں اس بے نشاں کا ڈھونڈھ لاؤں
مدد طالع کی ہو تو ڈھونڈ لیجے
وگر نہ سر طلب میں اس کی دیجے
نہیں بن یار سیر اب مجھ کو درکار
برنگ شمع ہوں میں سر سے بیزار[1]
نہ پاوے گا[2] جو دل کا مدّعا ہے
یہ دم سینے کا مجھ کو اژدہا ہے
مجھے طوطے نے یوں تلقیں کیا آہ
کہ عیاشی میں وصلِ یار مت چاہ
تو جب تک جسم کو اپنے نہ توڑے
دل اس دلیا و دولت سے نہ موڑے
نہ پہنچے گا کبھی مطلب کو زنہار
کہ وصلِ یار شاہی میں ہے دشوار
جو کوئی طالبِ دیدار ہے گا
نہایت کھینچتا آزار ہیگا
جسے محنت سے ہاتھ آیا[3] پیارا
نپٹ پر زور ہے اس کا ستارا
ہزاروں مر گئے ہیں کھینچ کر رنج
نہیں ہاتھ آیا ہرگز وصل کا گنج

۱- نسخہ لکھنؤ : مصرعے مقدم مؤخر ہیں۔
۲- نسخہ لکھنؤ : بتاؤں کیا۔
۳- نسخہ لکھنؤ : ہاتھ آوے محنت سے۔

طریقہ عشق بازی کا ہے مشکل
کہ ترکِ سر ہے اس کی پہلی منزل
یہاں جو طالبِ مقصود ہوگا
اسے نقصان ہی[1] اپنا سود ہوگا
یہ عیش و عشرتِ دنیائے فانی
ہے خواب انگیز جوں افسانہ خوانی
جو کچھ تھی سرگزشت اپنی بہ یکبار
رتن نے کہہ سنائی سب بیان وار[2]
یہ سن کر ہو گیا بے خود وہ دستور
دماغ اس کا ہوا بے بادہ مخمور
کیا خالی جو دل میں غم بھرا تھا
وہ رویا پھوٹ کر مانندِ مینا
کہا اے نیّرِ برجِ سعادت
فسانہ مت سمجھ عینِ حقیقت
بد و نیکِ جہاں کیا جانے طائر
حسین و زشت کیا پہچانے طائر
کدھر کی فکر تجھ کو لے کے ڈوبی
سمجھتا کیا ہے طیر انساں کی خوبی
خرد کو کار فرما تو بدستور
کر اپنے سر سے سودا زلف کا دور
نوشت و خواند اس جا کی منگالے
تو زر کا زور پہلے آزما لے

۱- نسخۂ لکھنؤ : 'ہی' ندارد -
۲- نسخۂ لکھنؤ : سب وہ اے یار -

اگر زر سے بن آوے[1] کر تو تدبیر
کہ ہووے زر سے جن و انس تسخیر
میں دل میں سوچتا ہوں اے خداوند
کہ ناداں کیوں ہوا تجھ سا خردمند
رتن بولا کہ اے دستورِ غم خوار
ترا دم ہے علاجِ جانِ بیمار
و لیکن مجھ سے دیوانے کی تدبیر
کرے گا کون جز زلفوں کی زنجیر
نہیں شبہہ مرے دیوانہ پن میں
گرا دل زلف سے چاہِ ذقن میں
کھڑا روتا ہوں میں قسمت کا لوٹا
چُھٹی رسّی کنویں میں کوزہ ٹوٹا[2]
میں دل کو آپ سمجھاتا ہوں پیارے
کہ افسانے پہ تو جاں اپنی مت دے
و لیکن اس کی باتیں میں کہوں کیا
جواب اس طرح مجھ کو ہے وہ دیتا[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ: ''ان آوے'' - اس نسخے میں اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل دو اشعار زائد ہیں جو دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں:

سراغ عنقا کا زر سے ہاتھ آوے
تو اپنی جان ناحق کو جلاوے
یہ سن کر لوگ سب حیران رہیں گے
وہ تجھ دانا کو دیوانہ کہیں گے

۲- نسخۂ لکھنؤ: کھڑا روتا ہوں میں قسمت کا مارا
ملے مجھ سے مرا کیوں کر پیارا

۳- نسخۂ لکھنؤ: کہ مجھ کو یوں جواب پھر وہ دیتا -

جو تیر[1] عشق کا ہووے نشانہ
فسانہ اس کا ہو جاوے بہانہ

محبت کی نہایت تیز ہے آگ
ڈسے ہے اڑ کے اکثر عشق کا ناگ

جلا ہوں طور آسا واۓ اندھیر
کہ ہوں سالم کھڑا اور راکھ کا ڈھیر

بنا دل[2] ایسا ناوک کا نشاں ہے
کہ مژگاں جس کے غم سے خوں فشاں ہے

نہیں معلوم زخم اس کا کدھر ہے
پڑا بسمل مگر لوہو میں تر ہے

نگہ کی تیغ کا بسمل ہوں بھائی
کہ تھی جوں برق لوہو میں بجھائی

کرے ہے یاد حسن لعل میگوں
برنگ بوۓ گل زخم دل افزوں

غم کانِ ملاحت سے میں اے یار
گلا جاتا ہوں جوں لونے کی دیوار

اگر قاصد کو بھیجوں ہے یہ مشکل
کہ رہ اس کی نہ دیکھے گا مرا دل

دلِ مغموم دیکھے کس طرح راہ
اشدّ الموت ہیگا انتظار آہ

۱- نسخہ مصطفائی : "تیرے عشق کا" ۔ چونکہ اس جگہ شعر بے ربط ہو جاتا تھا اس لیے دوسرے نسخوں کو ترجیح دی گئی ہے۔
۲- نسخہ لکھنؤ : مرا دل ۔

اگر یوہیں ہو تو ہیگا یہ وسواس
پیامِ وصل ہو یا آس یا یاس

یہی بہتر ہے سب سے آپ جاؤں
نصیبِ مدعا کو آزماؤں

میاں ! جی کا نہیں ہے عشق محتاج
جہاں میں آپ کاج ہیگا مہا کاج

نگیں و تاج تجھ کو سونپتا ہوں
سب اپنا راج تجھ کو سونپتا ہوں

تو میرے ملک پر جاری کر احکام
کہ جز صحرا نہیں مجنوں کو آرام

رعیت کو مری دل شاد رکھیو
مرے کشور کو تو آباد رکھیو

جو جیتا ہوں تو پھر دیکھوں گا دیدار
مرا اور تیرا بس اللہ ہے یار

یہ کہہ کر کپڑے پھاڑے ہو کے بیتاب
کرے پرزے کتاں کے جیسے مہتاب

اگرچہ غم میں تھا وہ جانِ غم‌ناک
یہ جیوں گل پیرہن ہنس ہنس کیا چاک

لپٹی شعلہ آسا تن کے اوپر
بشکلِ جوگیاں اک سرخ چادر[1]

۱- نسخۂ لکھنؤ : لپٹی جوگیوں کی طرح تن پر
برنگ شعلہ رنگیں ایک چادر

سراپا تن پہ خاکستر لگائی
بگولے کی طرح صورت بنائی

سر عریاں پہ چھوڑا اس نے چٹلا[1]
علم پر جیسے ابریشم کا جھبا

نمایاں چٹلے پر کی راکھ یوں تھی
کہ جیسے سرو پر بیٹھی ہو قمری

نہایت ہوگئی مژگاں وہ پُر قہر
کہ خاک آلودہ ہو زنبور پر زہر

خطِ لورستہ خاکستر سے اس کا
نمایاں جوں خطِ زیرِ لگیں تھا

وزیر اس کا کھڑا تھا دم بخود واں
برنگِ ابر دل لبریزِ طوفاں

خبرداروں نے آڑ کر صورتِ آہ
کہہ و مہ سے[2] کہا یہ حالِ جاں کاہ

ہوا ہر چار سو اک شور و غوغا
ہوا ہر اک کے دل میں حشر برپا

نہ ہوتا حشر کیونکر تج کے جب راج[3]
ہوا جوگی رتن سا صاحبِ تاج

۱- وہ چوٹی جو ملنگ یا جوگی سر پر رکھتے ہیں ۔ "چٹلا" غالباً اسمِ مکبر کے طور پر استعمال ہوا ہے ۔
۲- نسخۂ نول کشور و نسخۂ شیرانی : کو ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : چھوڑ کر راج ۔ نسخۂ شیرانی : جب کہ تج راج ۔

جوگی بن کے وطن میں کا جانا اور سارے کنبے کو غم میں پھنسانا

کرے گھر جس کے دل میں عشق بے پروا وطن کی طرح
قرار و خواب و خور ، گھربار ، کنبہ سب چھٹاتا ہے

اٹھا باہر سے جوگی لے کے ناقوس
ہوا مادر کے گھر میں جا قدم‌بوس
ادا کی رسم پہلے سب ادب کی
نمانی ماں سے پھر رخصت طلب کی
کہ اے اماں سفر اب[1] سر پہ آیا
مجھے کرتا ہے اب تجھ سے پرایا
نہیں ہے حق ترا مجھ کو فراموش
ہے تیرے دودھ کا مجھ میں ابھی جوش
کہ تو نے الفت و شفقت سے مائی
مجھے بتیس دھاریں ہیں پلائی
شجر جوں گل کا ہو پانی میں آیا
تو بھیگی ، مجھ کو سوکھے پر سلایا
شجر جس طرح گل کا نہر میں ہو
میں سوکھے میں تو گیلے پر رہے سو
تو میرے غم میں یہ جاگی کہ اک پل
لگیں تیری نہ پلکیں مثلِ مخمل
جو کچھ کی تو نے مجھ پر جاں فشانی
کہوں کیا سب تری تھی مہربانی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: اک ۔

برنگِ لعل تو نے مجھ کو پالا
بسانِ مہر مجھ پر سایہ ڈالا

مرا پہنچایا آخر فرِّ شاہی
مہِ گردوں سے لے کر تا بہ ماہی

میں زریں تاج سے جوں شعلۂ راز
ہوا ہوں عشق کے ہاتھوں سے لاچار

کہ رکھ کر عشق نے اب داغ سوزاں
بنایا دل مرا سروِ چراغاں

جو انگارے کی صورت دل جلا ہے
بھبھوت اب راکھ کا میں نے ملا ہے

مجھے چلنے کی جو[1] فرصت نہیں ہے
یہ پیراہن بھی جوں گل، آتشیں ہے

ہوا ہوں گل رخوں کا میں قلندر
جٹا بلبل نمط ہے میرے سر پر

یہ کنڈل کان میں جو میں نے پہنا
ہوا حلقہ بگوش اب اک پری کا

جو بے مہری نہ کرتی زلف خوباں
تو ہوتی مجھ کو کیوں شامِ غریباں

پڑا آہو کا آہو سے[2] جو پالا
لیا کاندھے پہ میں نے مرگ چھالا

۱- نسخۂ لکھنؤ: مجھے جینے سے جو -
۲- نسخۂ لکھنؤ: آہوں کا آہوں سے -

نگین و تاج و تخت و ملک و کشور
کیا میں نے فدائے نام دلبر
اسی کے واسطے جوگی ہوا ہوں
سفر کی تجھ سے رخصت مانگتا ہوں
تو کہہ تا سیر دریا کو میں جاؤں
مگر یہ سوز دل کا واں بجھاؤں
جو کچھ میں نے کہا ہو بخش دیجو
دعا کے ساتھ مجھ کو[1] یاد کیجو
جو دیکھی ماں نے صورت اس پسر کی
اس آتش پارہ خاکستر بسر کی
وہیں بھر لائی وہ غم دیدہ حیراں
برنگ ابر طوفاں دیدہ مژگاں
جو سلگی دل ہی دل میں غنچہ آسا
وہیں آ کے[2] اٹھا دل سے بھبھوکا
وہیں جیوں دردکھول الفت کی آغوش
لپٹ گئی اپنے اس شعلے سے مدہوش
کہا ہے ہے مرے پیارے رتن آہ[3]
کہیں جوگی نہیں ہوتا سنا شاہ
لب غم نے جلایا تجھ کو کیسا
کہ جوں شعلہ نہیں دل[4] تھام سکتا

۱۔ نسخہ لکھنؤ : اکثر۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : دھویں کی جا۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ : ماہ۔
۴۔ نسخہ لکھنؤ : کہ دل اپنا نہیں تو۔

کبھی طائر بھی ٹک تو سوچ تو آہ
ہوا ہے حسن کے عالم سے آگاہ
خرد سے کیوں تو بیگانہ ہوا ہے
جنوں سے کیوں تو ہم خانہ ہوا ہے
کف پا میں ترے دیکھا ہے اکثر
کیا ہے برگِ گل نے کارِ نشتر
کرے گا کیونکہ تو صحرا میں رفتار
سناں سے تیز تر ہے جس کا ہر خار
ترا یہ ملک و دولت ہے خدا داد
خدا کی داد کو مت کر تو برباد
عبث طائر کی[1] تو نے سن حکایت
کیا دل کو گرفتارِ مصیبت
رتن بولا کہ سن اے میری غم خوار
نہیں ہے ملک و دولت مجھ کو درکار
میں اپنی دل ربا کا ہوں قلندر
نہیں بھاتا مجھے دیہیم و افسر
لکھا قسمت کا تھا جو پیش آیا
نوشتہ اب نہیں جاتا مٹایا
کہا ماں نے کہ سن اے میرے مجنوں
نوشتہ گر نہیں ہوتا دگرگوں
مجھے تو مار کر یاں سے چلا جا
زمیں کے پردے کے اندر چھپا جا

۱- اسخہ' لکھنؤ : سے -

مروں گی میں جو کھا کھا کر ترا غم
کرے گا کون تجھ بن میرا ماتم

اگر سایہ ہوا ہے تجھ کو اے جاں
بلا لوں گی[۱] عزیمت خواں بہت یاں

مرض نے جو تجھے گھیرا ہے[۲] پیارے
اطبّا ہیں بہت نوکر ہمارے

کسی نے گر کیا ہے تجھ کو جادو
سیانوں کو یہ حال اپنا دکھا تو

اگر تجھ پر اثر ہے یہ نظر کا[۳]
سپندِ دل مرا ہیگا سلگتا

تری مشکل کرے اللہ آساں
کروں گی جان و دل[۴] اپنا میں قرباں

رتن بولا کہ سن اے مہرباں تو
نہ سایہ نہ نظر نہ مجھ کو جادو

میں ہوں بیمار آہ اس لعل لب کا
دوا میری کریں گے کب[۵] اطبا

نہیں محسوس میری حرکتِ نبض
رگِ یاقوت ہیگی صورتِ نبض

۱- نسخۂ لکھنؤ : بلاؤں گی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہو -
۳- نسخۂ لکھنؤ : اگر تجھ پر اثر ہیگا نظر کا -
۴- نسخۂ لکھنؤ : جان و مال -
۵- نسخۂ لکھنؤ : کیا -

غرض مجھ کو دعا سے کر تو رخصت
خدا کو سونپ تا آؤں سلامت
جو دیکھا ماں نے ہے یہ سخت مجنوں
اثر اس کا نہ ہوگا کوئی افسوں
وہیں زلفوں کے اس نے بال جھٹکے
اکھاڑے عنبر افشاں بال لٹکے
وہ بال اس کی کلائی پر لپیٹے
بلائیں اس کی لے کر بولی بیٹے
ہوا جو تو قلندر وضع آزاد
یہ دل سے میری سمرن[1] کیجیو یاد
جو تو دلہن کے گھر جاوے کا[2] جانی
یہ کنگنا اس گھڑی ہوگا نشانی
پھر اپنا سر جو تھا لوہو میں ڈوبا
پسر بے چارے کے پاؤں میں رگڑا
کہ بیٹا میں یہ ہوں مہندی لگاتی
پلنگ کا تجھ کو ہوں نوشہ بناتی
یہ میرے اشک جاری ہیں جو سرشار
گلے میں موتیوں کے ڈال لے ہار
اسی صورت سے باتیں کر کے وہ ماں
زمیں پر گر پڑی جوں سایہ بے جاں

۱- نسخۂ لکھنؤ : ''یہ دستی میری ثمرن'' - ہندی میں ''سمرن'' مالا اور بازو کے زیور دولوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (جامع اللغات) - ''ث'' سے کتابت غلط ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہووے کا -

رتن کی اتنے میں وہ بڑھ کے رانی
کہا میری بھی اک لے جا نشانی
وہیں توڑ اپنے سر کے عنبریں مو
کہ تھے جوں دودِ شمعِ عود خوش بو
گلے میں اس کے ڈالی بٹ کے سیلی
کہا سائیں ترا اللہ بیلی
گرہ سیلی میں دیتی ہوں میں ناشاد
کہ دیکھ اس گانٹھ کو کیجو مجھے یاد[۱]
پھر اس نے چیر کر بائیں چھنگلیا
جبیں پر قشقہ اس جوگی کی کھینچا
کہ لے جاتا نہیں گر مجھ کو پیارے
مرا لوہو لیے جا ساتھ بارے[۲]
میں گو نظروں سیں اے گل تیری ہوں خار
نہ چھوڑوں گی پر ان قدموں کو زنہار
شفق کی طرح رنگیں اوڑھ چادر
ہوا جوگی مرا خورشیدِ انور
بہ میں گریاں جو ہوں گی شبنم آسا
تو مجھ کو کیوں نہیں ہے ساتھ[۳] لیتا
عجب طوطے کی صحبت تو نے پائی
کہ سیکھی[۴] اس سے طرزِ بے وفائی

۱- نسخہ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۲- نسخہ لکھنؤ : پیارے ۔
۳- نسخہ لکھنؤ : ساتھ اپنے ۔
۴- نسخہ لکھنؤ : سیکھا ۔

تو اسبابِ سفر اب تن سے کر دور
نہیں یہ سر مرا[1] گردن سے کر دور
نہیں معلوم مجھ کو سوتیا ڈاہ
ملے تو جب کہ اس معشوق سے آہ
مرا مرنا سنا کر شاد کیجو
یہی اول مبارک باد دیجو
رتن بولا کہ سن اے بلبلِ غم
چمن میں دل کے پھولا ہے گلِ غم
کسی کا سرو تن ہے کب[2] مجھے یاد
سر و سامان دیا ہے میں نے برباد
وہ دل جاتا رہا اب ہے غمِ یار
چمن میں جائے گل کی رہ گیا خار
ولے یہ خار میں آنکھوں پہ پرجا[3]
لیے مژگاں نمط اپنے پھروں کا
یہ کہہ کر جب چلا باہر کو[4] راجا
کیا حال اس کی[5] رانی نے کہوں کیا
وہیں جیوں شمعِ فانوسِ خیالی
گلے میں اوڑھنی کی کفنی ڈالی

۱- نسخۂ لکھنؤ : مری -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کسی کا کب سرو تن ہے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : ولے میں خار یہ آنکھوں سے پرجا -
۴- نسخۂ لکھنؤ : گھر سے وہ -
۵- نسخۂ لکھنؤ : اپنا -

بھبھوت اپنے ملا چہرے کے اوپر
دبایا راکھ میں انگارہ لے کر
چھپی اس راکھ میں وہ شکل دل گیر
نظر آتی تھی جیوں خاکے کی تصویر
کیا لتھ کو رخِ دل خواہ سے دور
کیا ہالے کو اپنے ماہ سے دور
وہ زیور موتیوں کا سب اتارا
نہ چھوڑا مہر نے کوئی ستارا
سنہرا جوڑا وہ ہاتھوں کا توڑا
نہ جوالے کو اس شعلے نے چھوڑا
بنائی کچھ عجب حالت تباہی
برنگِ کشتہ شمع[1] صبح گاہی
وہیں رو رو کے رستہ جا کے گھیرا
کہ اے جوگی کرے گا کب تو پھیرا
تو کیونکر جائے گا میرے سنگاتی
میں ہوں الماس اشک اس جا بہاتی
تو مجھ جوگن کو بھی ساتھ اپنے لے جا[2]
پھروں گی میں لیے تیرا یہ مینا
جو کانٹا پاؤں میں دیکھوں گی تیرے
نکالوں گی میں پلکوں کی سوئی سے
جہاں دیکھوں گی اڑتی گردِ صحرا
کروں گی اشک سے چھڑکاؤ اس جا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : شمع کشتہ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : لے گا۔

جہاں پر دھوپ ہوگی واں شتابی
ترے منہ کی بنوں گی آفتابی
جہاں تو بیٹھ کر باندھے گا آسن
سر اپنا میں کروں گی واں سنگاسن
تری راحت کو بہر دفع گرما
کروں گی سائباں پلکوں کا برپا
میں گوہر آب آنسوؤں کے لے کر
لگاؤں گی کنارے اس کے جھالر
میں دل سے کھینچ کر نالے ہزاراں
پکاروں گی برسم چوب داراں
نہ ہرگز کنکروں پر سوئے گا تو
میں سر کے بالوں سے دیدوں گی[1] جھاڑو
سمور و قاقم آخر واں ہے نایاب
کروں گی چشم[2] کا میں فرش کم خواب
اندھیری شب ہو جس جنگل میں ہاسا
جلاؤں گی دل اپنا شعلہ آسا
ترے میں تاپنے کے واسطے واں
رماؤں گی[3] یہ دھونی سینہ سوزاں
رتن جام محبت سے تھا مدہوش
کسی کی بات پر اس کا نہ تھا[4] گوش

۱۔ نسخہ لکھنؤ : دے دوں گا ۔
۲۔ نسخہ نول کشور و نسخہ شیرانی : جسم ۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ : بناؤں گی ۔
۴۔ نسخہ لکھنؤ : اس کا تھا کب ۔

نہ رانی کو جواب اس نے دیا کچھ
نہ اوروں سے خطاب اس نے کیا کچھ

وہ راہِ عزم میں تھا مضطرب حال
گھڑی اس جا گزرتی تھی اسے سال

بعزمِ راہ وہ زینے سے کودا
بشکلِ آہ وہ سینے سے کودا

گیا در سے جو وہ جوگی نکل کر
وہ نرگس کی طرح تکتی رہی در

ہوئی بے ہوش آخر غم سے ناگاہ
گریِ گریا[1] کی صورت قصہ کوتاہ

جو آئی ہوش میں پھر وہ دوانی
کہا کرتی تھی جوگی کی کہانی

وہ گھر میں اور جو خورد و کلاں تھے
سبھی جوگی کے غم میں خوں فشاں تھے

وہ اس کی ماں جو تھی راحت فراموش
برنگِ صورتِ دیوار بے ہوش[2]

حبابہ آسا کیے چشم اس نے جب[3] وا
جگر گوشے کے تئیں گھر میں نہ دیکھا

۱- نسخۂ لکھنؤ : ِ گرنا (بمعنی کاگل یعنی بہت ترش لیمو) کریا کرم کے معنی تو تجہیز و تکفین کرنے کے ہیں ۔ شاید یہاں مردے کے معنی میں استعمال ہوا ہو ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : یہ شعر اس جگہ سے چھ اشعار پہلے ہے ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : جب آنکھیں اس نے کیں ۔

کیا مژگاں سے باصد بے قراری
رگِ بسمل نمط خوننابہ جاری
پڑی سجدے میں رہتی دمبدم تھی
جبیں اس کی مگر نقشِ قدم تھی
پسر کے غم میں اس نے جوگ سیادھا
سبھی خواب و خورش یک بار چھوڑا

کوچ کرنا راجہ رتن سین کا وطن سے یادِ حبیب میں اور وارد ہونا شہرِ دل کش سرالدیپ میں

فلک لطف و کرم سے جس کسی کے پیش آتا ہے
اجاڑ اس کے تئیں بستی سے جنگل میں بساتا ہے[1]

عجب سر گرم جوگی گھر سے نکلا
برنگِ دودِ مجمر[2] گھر سے نکلا
کھڑا باہر ہوا وہ گھر سے آسا[3]
کہ لیوے جا کسی جنگل میں باسا
وہیں سولہ ہزار اس کے ہوئے یار
بشکلِ جوگیاں چلنے کو تیار
کہا ہم نے نمک تیرا ہے کھایا
ادا کا اس کے بھی اب وقت آیا

۱- نسخۂ شیرانی : شعر ندارد ۔
۲- مجمر : وہ برتن جس میں خوشبودار چیزیں جلاتے ہیں ۔ اگردان ، عود دان وغیرہ (جامع اللغات) ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : شعلہ آسا ۔ نسخۂ نول کشور : گھر سے ایسا ۔

جہاں تو جائے گا ہم بھی یہ[1] دن رات
برنگِ سایہ تیرے دم کے ہیں ساتھ

رتن بولا کہ میں نے تم کو بخشا
مرا تم پر جو کچھ حقِ نمک تھا

مرے تم عشق میں[2] آتش عناں ہو
جلاتے کیوں یہ اپنا خانماں ہو

میں ہوں آوارہ دشتِ نامرادی
ہے یار اب عشق اور اللہ ہادی

شرارِ عشق کو سمجھو نہ تم سہل
ہیں اس کے آگے یکساں اہل و نااہل

تم اپنے بستے گھر کو مت اجاڑو
نہ اس شعلے سے[3] دامن اپنا جھاڑو

جو کچھ میں نے کہا ہو بخش دیجو
دعا سے غائبانہ یاد کیجو

کہا یہ اور قدم واں سے اٹھایا[4]
کمیتِ عزم کو آگے بڑھایا

کہا یاروں نے رو رو اے ستم گر
ہمیں تو چھوڑ کر جاتا ہے کیدھر

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : واں ہم بھی ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : مرے غم میں نہ تم ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : شعلے پہ ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : قدم آگے بڑھایا ــ عزم کو واں سے اٹھایا ۔

وہی[1] دل سوز اس کے سب ہوا خواہ
ہوئے جھوں لشکرِ غم اس کے ہمراہ
سبھی خولیں کفن پیش جہاندار
چلے جوں روشنی کے جھاڑ یک بار
بسانِ آلینہ باچشمِ نم ناک
رخ و سینہ پہ اپنے سب ملے خاک
ہر اک دل میں اٹھا فرقت کا غوغا
کہ یاراں کشور چتور چھوڑا
دلا تو عشق کی ٹک چال کر غور
کیا ظالم نے جوگی شاہ چتور
چلے وہ کف زناں[2] اور نالہ فرسا
طریقِ عشق میں مانندِ دریا
کیا یک بار جا جنگل میں ڈیرا
خس و خاشاک کو شعلوں نے گھیرا
وہ رنگیں پیرہن ژولیدہ گیسو
نظر آتے تھے جیسے بن میں ٹیسو[3]
تعجب میں تھا اس کے[4] سارا جنگل
کہ آمڈا یہ کہاں سے لال بادل[5]

۱- نسخۂ لکھنؤ : وہیں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : کف زباں ۔
۳- ٹیسو : ڈھاک کا درخت یا ڈھاک کا پھول جس میں سے زرد رنگ نکلتا ہے ۔ (جامع اللغات صفحہ ۲۱۷)
۴- نسخۂ لکھنؤ : اس دن ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : لعل بادل ۔

نہ ہوتے کیونکہ زینت بخشِ ہاموں
کہ تھے سب لٹ کھلے جوں بید مجنوں

خس و خار ان کا سدِ راہ کب تھا
چلے جاتے تھے وہ سب شعلہ آسا

بچھڑتا جو سو ہوتا جلد واصل
نہیں ہرگز سراغِ شعلہ مشکل

سمجھ کر کہربائی پیرہن کو
لپٹ جاتے تھے خار و خس بدن کو

طرف مقصد کے طوطا رہنموں تھا
بسانِ خضر تھا ساتھ ان کے جاتا[1]

برنگِ دانہ ہائے سبحہ یکدل
چلے جاتے تھے وہ منزل بمنزل

لیا طوطے نے جو جنگل کا رستا
نہیں سیلاب کی جا[2] غیر صحرا

چندیری شہر کو بالیں[3] بجا کر
تدرو آسا رکھا کہسار میں سر

غرض بیجا نگر بھی چھوڑ کر[4] واں
چلے بندر کو وہ شہرِ غزالاں

۱- نسخۂ لکھنؤ میں یہ اور اس کے بعد کا شعر مقدم مؤخر ہیں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : نہیں سیلاب کی راہ ۔ نسخۂ نول کشور : یہ پھر سیلاب کی مانند ٹھہرا ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : بائیں بجا کر ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : بیجا نگر کو چھوڑ کر ۔ نسخۂ شیرانی : بیجا نگر چھوڑ کر واں ۔

ہزاراں راہ پر آفت کو پہنچے
برنگِ آئینہ صورت کو پہنچے
اٹھائی جو بہت گرمی و سردی
ہوا تن جیوں طلائے لاجوردی
چلے از بس اندھیری شب جو رہتہ
ہوئے جیوں شانہ ہر خار ان کے اعضا
عجب وہ رہ روِ راہِ بلا تھے
کہ حیرت وار ان کے نقش پا تھے
برنگِ سوزن آخر رشتہ راہ
کیا سر سے انھوں نے چل کے کوتاہ
برنگِ خس کہ جس کو سیل مارے[1]
یہ پہنچے[2] ناتواں دریا کنارے
جو تھا فرمان دہِ ملکِ بنادر[3]
زمانے میں تھا ثانی اس کا نادر
ہزاروں فیل کا مالک تھا خود کام
نہایت باصلابت گنجتی نام[4]
کسی نے جا خبر دی اس کو فی الفور
کہ جوگی ہو کے آیا شاہ چتور
لبِ دریا پہ اترا ہے پیادہ
عبورِ بحر کا ہے کا ارادہ

۱۔ نسخہ لکھنؤ : سہل ہارے۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : پہنچ گئے۔
۳۔ نسخہ لکھنؤ : ملک شناور۔
۴۔ نسخہ لکھنؤ : گیجیے نام۔

سر الذہب اس کے دل کا مدعا ہے
کہ واں اس مضمحل کا دل لگا ہے
وہیں سن کر وہ دور اندیش آیا
بہ آئینِ نصیحت پیش آیا
صدف آسا دو لب اس نے کیے وا
سخن ہر ایک مثلِ گوہر آگلا[۱]
کہ فرہاد عاشقِ بے چارہ مضطر
پٹک کر مر گیا کہسار سے سر
وہ مجنوں جو کہ تھا مشتاقِ لیلی
رہا صحرا ہی میں جوں گردِ صحرا
تو ان دونوں سے بھی آگے بڑھا ہے
کہ سیرِ کوہ و صحرا کر چکا ہے
پھر اس دریا پہ تو آیا ہے[۲] ظالم
نہیں جس سے[۳] گزرتی موج سالم
عبور اس بحر سے تیرا ہے مشکل
کہ اس دریا کا نہ سر ہے نہ ساحل
جگر سوز آب اس کا اشک کردار
نہنگ اس کا ہے جوں خاک آدمی خوار
ہر اک موج اس کی لظروں میں پیالے
چلی آتی ہے مثلِ نشہ[٤] سے

۱- نسخۂ لکھنؤ : جوں گوہر نکالا -
۲- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ شیرانی : آتا ہے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : کہ جس سے ہیں -

یہ دریائے خوں خوری[1] میں اک بلا ہے
کہ ہر موج اس کی شکلِ اژدہا ہے
برائے قتلِ حیوانات و آدم
کمر کو موج سے باندھے ہے محکم
ستم گر نے ہزاروں اوکھٹ و گھاٹ
دیے ہیں[2] موج کی تلوار سے کاٹ
نہ تیج موج[3] کا ڈر ہے کہاں ہی
کہ پہنے فلس کا جوشن ہے ماہی
پھر اس کافر نے آخر داد دے کر
لگائی تیغ ماہی کے گلے پر
برنگِ آئینہ اس کا یہ گرداب
ہے جس کو دیکھتا کرتا ہے غرقاب
پھرا ہے گرد یہ دریائے خوں خوار
کرہ ارضی کے اوپر مثلِ پرکار
اگر ہوتی نہ اس ظالم میں آفات
بناتا کیوں سکندر صنع کا بات (؟)
رتن بولا کہ سن اے مہر گستر
تری باتیں ہیں سب موتی سے بہتر
پہ ہم وہ تشنہ ہیں[4] جو منہ لگاویں
زمیں کی طرح دریا کھینچ جاویں

۱- نسخۂ لکھنؤ : خوں جواں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : گیے ہیں -
۳- نسخۂ لکھنؤ : یہ تیغ موج -
۴- نسخۂ لکھنؤ : تشنہ لب -

قدم ہم بحر و بر میں ہیں بدلتے[1]
نہنگ و شیر کی صورت ہیں چلتے
نہیں عشاق کو آفات سے بیم
رضا کو سر کیا ہے ہم نے تسلیم
نصیحت گر نے[2] جب چارہ نہ دیکھا
بھر آئی چشم اس کی[3] مثلِ دریا
وہیں پر ایک جانب سے طلب کر
لگائیں کشتیاں دریا کے لب پر
رتن اور یار اس کے شعلہ کردار
چڑھے سب کشتیوں پر برق کردار[4]
ہوا ان[5] جوگیوں سے بے تأمل
ہر اک کشتی کا تختہ تختۂ گل
برنگِ چشم ہر کشتی دل آویز
ہوئی یک بارگی مردم سے لبریز[6]
بگردِ چشم[7] کشتی تھی نمایاں
وہ جوگی مثلِ گرد آلودہ مژگاں

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : کبھیں ہر ہم نہیں ہرگز دہلتے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : نصیحت گرنا ۔
۳۔ نسخۂ نول کشور : بھر آئے اشکِ اس کے ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : لپٹ کر کشتیٔ چوبیں سے اک بار ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : یوں ۔
۶۔ نسخۂ لکھنؤ : برنگ چشم ہر کشتی نمایاں
ہوئی یکبارگی مردم سے پنہاں
۷۔ نسخۂ لکھنؤ : برنگِ چشم ۔

رتن نے لشکرِ غم کو اٹھایا
جگر سے بادبانِ آہ کھولا

ہوا خشکی سے وہ دریا کا سیاح
وہ طوطا ناخدا اور عشق ملاح

ہمدم کی یاد میں وہ جانِ پُر غم
غزل عبرت کی پڑھتا تھا ہر دم[1]

غزل

بیتاب کوئی شے نہیں سیماب کی مانند
ہو وہ بھی نہ ہوگا دلِ بیتاب کی مانند

یہ زخمِ جگر کیا ہے کہ پانی ہے چواتا
یہ اشک کا پانی تو ہے تیزاب کی مانند[2]

میں مثلِ کتاں جیب کے دکھلاؤں تماشے
آوے جو سرِ بام تو مہتاب کی مانند

ہے چشم کا دریا بھی تو اک سیر کے قابل
کیا لختِ جگر تیرے ہیں سرخاب کی مانند

جوں سوچ، تو شمشیر عبث کھینچے ہے ہردم
قربان میں خود ہوتا ہوں گرداب کی مانند

کس بحر کی امداد کو جاتا ہے تو اے اشک
یک دست عناں چھوڑے ہے سیلاب کی مانند[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ ہردم -
۲- نسخۂ لکھنؤ : یہ زخم جگر کب ہو کہ پانی بھی چواؤ جائے
پھر اشک کا پانی ہے کہ تیزاب کی مانند
۳- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -

عبرت[1] تو عجب طور سے باندھے ہے مضامیں
ہر بحر غزل میں درِ شاداب[2] کی مانند

یونہیں کرتا ہزاروں نالہ و آہ
چلا جاتا تھا وہ دریا میں جیوں ماہ
خدا کے فضل نے بادِ مرادی
طرف عاشق کی کشتی کے چلا دی
نظر آنے لگا قلعہ پدم کا
سبک دل سے ہوا تب بار غم کا
جوں ہی اس پار اترا جانِ غم ناک
بجا لایا ثنائے ایزدِ پاک
نظر جب سر زمینِ یار آئی
عجب دھوم اس کے دل نے اک مچائی
کبھی اللہ کا ہوتا ثنا خواں
کبھی وہ بخت کے جاتا تھا قرباں
برنگِ اشک خونی کرکے پر جا
زمینِ یار پر تھا سجدہ کرتا[3]

رتن سین کا سرالدیپ کے بتخانے میں فروکش ہونا اور پدماوت کا پیغام زبانی طوطے کے سننا اور غمِ محبت رتن کے دل میں ہونا

جو ہووے وصل کا نزدیک دن بیچارے عاشق کو
شبِ ہجراں سے بھی دیکھا تو کچھ دونا ستاتا ہے[4]

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : عشرت ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : در خوش آب ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : کرتا تھا سجدہ ۔
۴۔ نسخۂ نول کشور : بناتا ہے ۔ نسخۂ شیرانی : شعر ندارد ۔

لکھے ہے لکتہ سنج اب یوں روایت
که جوگی پار اترے جب سلامت
کہا طوطے نے اے سردارِ عالی
نہ رہیو جامِ عشرت تیرا خالی!
کنارے شہر کے بتخانہ ہیگا
که مہجوروں کا وصلت خانہ ہیگا
پدم کے وصل کا خواہاں ہے گر تو
صنم خانے میں ڈیرہ چل کے کر تو[1]
که اکثر پدمنی ہے[2] واں کو جاتی
سرِ عجز اپنا ہے بت کو جھکاتی
ہے ظاہر میں وہ بت خانہ و لیکن
مہادیو اس مکاں کا ہے ہیگا ساکن
ہے بت خانے کی یہ ظاہر کرامات
که ہے وہ مرجعِ اربابِ حاجات
جو اس کشور کے سب خرد و کلاں ہیں
بسانِ گوئے سرسی واں دواں ہیں
ہزاروں نازنینانِ فسوں کار
صنم سے حالِ دل کرتے ہیں اظہار
کوئی فرزند دختر مانگتی ہے
صدف میں اپنے گوہر مانگتی ہے

۱- نسخہ شیرانی : اشعار ندارد۔
۲- نسخہ نول کشور : بھی۔

کوئی جوڑے کی مانگی ہے دعا کو
کہ تنہائی معین ہے[1] خدا کو
برہمن کو وہاں ہے رزق حاصل
ہے بدکاروں کو اس سے فسق حاصل
ہے عارف کے تئیں مسجود خانہ
ہے فاسق کے تئیں مقصود خانہ
تو بت خانہ کو جا ہیں یاں سے جاؤں
بدم کو تیرے مقدم کی خبر دوں
تماشا ہاتھ آوے گا تجھے مفت
چلے گا سہل میں تیرا وہاں جفت
یہ کہہ کر وہ رسولِ جان گدازاں
چلا جیوں ہدہدِ شاہِ سلیماں
بدم کے گھر کو ہنستا وہ توکل
چلا جیوں باغ کی جانب کو بلبل
جہاں تھی بدمنی کی جمع محفل
ہوا جیوں شمع اس محفل میں داخل
بدم کے جاکے وہ دامن پہ بیٹھا
چکن کا جیسے ہووے سبز بوٹا
پری نے اس کو پہچانا جو[2] یک بار
جگر سے کھینچی اک آہِ شرر بار

۱- نسخۂ لکھنؤ : تھی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : نہ -

امنڈ کے غم کی بدلی دل سے آئی
جھڑی آنکھوں کی پلکوں سے[1] لگائی
سرشک اس نے بہائے حد سے افزوں
کیا جوں شمع سوزِ دل کو بیروں
پھر آخر طوطے سے جب خوب رو لی
شرر کی طرح سوزِ دل سے بولی
کہ سن اے بیوفا اب تک کہاں تھا
جدا کس طرح مجھ سے میری جاں تھا
ہر اک طوطا اگرچہ بے وفا ہے
و لیکن تو بہت ناآشنا ہے
گیا تو کرکے مجھ سے مکر و سالوس
بہم ملتی رہی میں دست افسوس
تو اب سے دور مجھ سے جبکہ تھا دور
یہ گھر تھا میرے حق میں گرم تنور
نہیں کی میں نے تجھ بن سیر گلشن
گل و گلشن تھا تجھ بن مجھ کو گلخن
تری فرقت میں اے میرے توکل
نظر آتا تھا آتش پارہ ہر گل
کہوں کیا کیا غمِ دردِ جدائی
اٹھائی جو مصیبت سر پر آئی
برنگِ نخلِ گل فرقت[2] میں تیرے
گرہ ہیں غنچہ آسا دل میں میرے

۱- نسخۂ لکھنؤ : نے۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : فرقت سے (اس مصرعے میں فرقت کو ہجر کے مترادف استعمال کیا گیا ہے)

بھروسا زندگی کا مجھ کو کم تھا
کہ ٹوٹا سر پہ میرے کوہِ غم تھا
تری شیریں بیانی کرکے میں یاد
جگر کو کاٹتی تھی[1] مثلِ فرہاد
ہزاروں شکر اور حمد الٰہی
کہ تو نے جیتے جی صورت دکھائی
جو کچھ اب تو نے کی ہو سیر آفاق
بیاں کر تیری باتوں کی ہوں مشتاق
جہاں کی سیر کر مدت میں آیا
مری خاطر ہے تحفہ کیا تو لایا
بھلا میں بھی تو دیکھوں عشق تیرا
ادا کرتا ہے کیا حق پرورش کا
وہیں طوطے نے خلوت کرکے فی الحال
سنایا پہلے اپنا اس کو احوال
حقیقت کہہ چکا اپنی وہ جس دم
کہا اک اور بھی سن قصۂ غم
تجھے جس روز سے میں نے تھا[2] دیکھا
یہی کرتا تھا میں دل میں پریکھا
کہ اک خوشروجواں تجھ سا[3] جو پاؤں
ترے ساتھ اس کو میں جوڑا[4] ملاؤں

۱- نسخۂ لکھنؤ : جگر بازی تھی کرتی ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : تھا میں نے ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : تم سا ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : اس کا جوڑا لا ۔

برنگِ نواماں خط کرکے یک جا
کروں نظارہ میں بیٹھا تمھارا

رتن سین ایک راجہ میں نے پایا
تری خاطر ہوں جوگی کرکے لایا

جوں ہی اس نے سنا مجھ سے ترا نام
دیا چھوڑ اپنا[1] خواب و عشق و آرام

ترے کارن لٹا کر افسر و تاج
سب اپنا راج دم میں کرکے تاراج

اب اس کشور میں آیا ہے پیادہ
بشکلِ جوگیاں وہ شاہزادہ

پھرا مثلِ فلک کہسار و صحرا
ہوئے پُر آبلہ اس سے کفِ پا

جو سوتا سیج پر[2] پھولوں کی اکثر
رگِ گل سے تھا پڑتا خط[3] بدن پر

تری خاطر جو وہ[4] کانٹوں پہ سویا
ہیں اب جوں غنچہ پر خار اس کے اعضا

برہنہ سر و پا با داغِ جاں سوز[5]
چلا آیا وہ جیوں ماہِ دل افروز[6]

۱- نسخۂ لکھنؤ : اس نے ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : جو سویا سیج پر ۔ نسخۂ نول کشور : جو سوتا سیج میں ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : تھا خط پڑتا ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : سو وہ ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : سر و پا برہنہ با داغ دل سوز ۔
۶- نسخۂ لکھنؤ : مہر دل افروز ۔

کیا تیرے صنم خانے میں ڈیرا
طلب کرتا ہے بت سے وصل تیرا
وہ شہزادہ ہے اب تیرا بھکاری
ترے بن زندگی ہے اس کو بھاری
کسی صورت تو شکل اپنی دکھا آ
تو اس مردے کو جیوں عیسیٰ جلا آ
جو طوطے سے سنی حیرت کی گفتار
ہوئی وہ نازنیں اک نقشِ دیوار
نظر میں پھر گیا جوگی کا نقشا
سب اس کی محنت و رنج و تعب کا
محبت نے بچھایا دام کامل
پری کا طائر آسا پھنس گیا دل
وہ جاذب عشق[1] غالب تھا رتن کا
لیا دل کھینچ[2] دم میں سیمتن کا
صنم کا ہووے ہرچند آہنیں دل
پہ عاشق کا اگر ہے جذب کامل
وہ آہن کو[3] ہے بالتخصیص کھینچے
برنگِ سنگ مقناطیس کھینچے
جوانی کا جو عالم تھا پدم کا
سرایت کر گیا قصہ یہ غم کا

۱- نسخۂ لکھنؤ : وہ جذب عشق -
۲- نسخۂ لکھنؤ : لیا دم کھینچ -
۳- نسخۂ لکھنؤ : وہ آہوں کو -

کیا غم نے جو ابرو کا اشارا
خوشی اس سے ہوئی وہیں کنارا[1]
لگا کر شعلہ عشق فتنہ گر نے
لگا جوں شمع غارت اس کو کرنے
لگا مخفی کلیجے میں[2] کڈھب تیر
کھلی چشم اس کی رہ گئی مثل تصویر[3]
ولیکن تھی نہایت وہ تو[4] ہشیار
ہوئی گو بادۂ الفت سے[5] سرشار
لیا دل کا وہیں تھام اس نے مینا
کہ رازِ عشق ہو جاوے نہ افشا
اٹھا ہرچند دل سے خوں کا اک جوش
پہ تھی جوں غنچۂ تصویر خاموش
ہجوم اشک تلخ آنکھوں میں آیا
ولیکن پی گئی زہرابہ آسا[6]
غبار آہ نے سینے کے اندر
کیا آئینہ آسا دل مکدّر
دل اس کا سینے سے باہر کو آبلا
بہت دشواریوں سے اس نے تھانبا[7]

۱- نسخۂ لکھنؤ : دوبارہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کلیجہ پر -
۳- نسخۂ لکھنؤ : رہیں آنکھیں کھلی مانند تصویر -
۴- نسخۂ لکھنؤ : جو -
۵- نسخۂ لکھنؤ : ہوئی وہ نشر الفت میں -
۶- نسخۂ لکھنؤ : وہ زہر آسا -
۷- تھانبا : بجائے تھاما -

غرض ہر طرح کرکے راز مخفی
بطور غصہ اس طوطے سے بولی
کہ سن اے باد پیما[1] بیہدہ گو
خطر آیا نہ اپنے جی کا تجھ کو
جو میرے روبرو یوں بے محابا
تو نامحرم کی باتیں ہے سناتا
اگر ہوتا نہ پاسِ آشنائی
اسی ساعت[2] تری تھی موت آئی
مغرور بے حیا ہیگا تو بدذات
نہ سوچا تو کہ چھوٹا منہ بڑی بات
ادب میرا یکایک تو گیا بھول
اڑا دیتی ہوں بارے مار کر دھول
بس اب اڑ یاں سے جان اپنی بچا جا[3]
کوئی دن اور دنیا کی ہوا کھا
غرض طوطے سے جو کہتی تھی وہ بات
برنگِ شعلہ دودِ آہ تھا سات
اگرچہ سوچ کر کہتی پری چہر
پہ لرزاں تھا سخن جوں پرتوِ مہر
سخن جو اس کے لب سے تھا نکلتا
برنگِ مے تھا کیفیت میں جلتا

۱- نسخہ' لکھنؤ : بادہ پیما -
۲- نسخہ' نول کشور : اسی باعث -
۳- نسخہ' لکھنؤ : بس اب اڑ جا یہاں سے جاں بچا جا -

وہ کچھ کہتی، نکلتا کچھ زباں سے
نمایاں درد تھا اس کے بیاں سے
بھلا دی عشق نے سب اس کی تقریر
ہوئی ہر بات میں لکنت زباں گیر
سحر کے ماہ کی صورت دمادم
ہوا جاتا تھا تغییر اس کا عالم
سراپا عشق دل پر چھا گیا تھا
اسی گرمی سے دل[1] گھبرا گیا تھا
ہوا عشق اس کے چہرے پر ہویدا
ہوئی جوں لعل خشکی لب سے پیدا
ہوا وقت تکلم اس کا ہر حرف
لہو آلودہ مثلِ کلک شنجرف
یکایک ذو فنوں طوطا وہ عیّار
سمجھ کر عاشقانہ اس کے اطوار
نہ پھولا اپنے جامے میں سمایا
نشانے پر جو دیکھا تیر آیا
خوشی سے پر ہلا اور کھول منقار
برنگِ سبز تیر و سرخ سوفار[2]
لگا کہنے میں تیرا کیا بگاڑا
تری خاطر ہے اک راجہ اجاڑا
ترا نام اس نے سن کر ووہیں فی‌الفور
دیا چھوڑ اپنا بستا ملک چتور

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : اس کا گرمی سے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : برنگ سبزہ تیز و سرخ منقار ۔

کیا تہ بند لنگوٹی دو شالہ
لیا کاندھے پہ اپنے مرگ چھالا[1]
برہنہ ہو کے کر کر[2] جوگیا بھیس
چلا آیا پیادہ وہ ترے دیس
وہ اپنی سی نہایت کر چکا ہے
تو کر آگے جو کچھ تیری رضا ہے
یہ کہتا ہوں کہ ہووے تجھ سے[3] جس طور
فقیر اپنے کی لازم ہے تجھے غور
وگرنہ تیرے غم میں جان دے گا
یہ خوں ناحق گلے تیرے پڑے گا
وہاں بیکس کی ناحق جان جاوے
یہاں ناحق تو ہتیاری کہاوے
غرض اس شوخ نے تیوری چڑھا کر
خیال اپنے میں عشق اپنا چھپا کر
کہا طوطے تری خاطر ہے منظور
مرے اس راز کو رکھیو تو مستور
صنم کے پوجنے کے دن ہیں نزدیک
کروں گی جا کے روشن جان تاریک

۱- مرگ چھالا : (مذکر) ہرن کا پوست مع بالوں کے جس سے جوگی یا کشتی لوگ بستر کا کام لیتے ہیں یا پوجا کے وقت آسن بناتے ہیں۔ (جامع اللغات ص ۵۱۴)
۲- نسخہ لکھنؤ : سراپا برہنہ اور۔
۳- نسخہ لکھنؤ : یہ میں کہتا ہوں تجھ سے ہووے۔

دکھاؤں گی میں اس جوگی کو صورت
کروں گی دفع اس کی سب کدورت
جو یوں جاؤں سمجھ اے نیک فرجام
کہ و مہتر میں ہو جاؤں گی بدنام
یہ بدنامی اگرچہ ہے خوش آیند
پر اس کو جو ہے[1] دامِ عشق میں بند
مرا کیا عاشقی سے کام ہیگا
مرا معشوق آپ ہی نام ہیگا
یہ سن کر طیر بت خانے کو آیا
رتن کو ماجرا سب کہہ سنایا
کہ تیرا حال ہم[2] نے کہہ پدم سے
ملاقی کر دیا ہے فوجِ غم سے[3]
ترے بھی عشق کا کاری لگا تیر
پری کے بھی کیا ہے دل کو نخچیر
جو پوجا کو یہاں آوے گی پیاری
تو سچ جانے گا سب باتیں ہماری
رتن کے سوز دل پر پانی چھڑکا
زیادہ لیکن اس کا شعلہ بھڑکا
ہوئی اس کی مضاعف بے قراری
ہوا دن رات بے چارے پہ بھاری

۱- نسخہ' لکھنؤ : ہو -
۲- نسخہ' نول کشور : میں نے -
۳- نسخہ' لکھنؤ : ملاقی کر دیا فوج الم سے -

گنے تھا انگلیوں پر دن وہ جاں سوز
کہ کب آوے گی یاں ماہِ دل افروز
رہا جو منتظر اس کا سحر شام
سفید آنکھیں ہوئیں جیوں مغز بادام
کبھے[1] ہنستا تھا اور کاہے بگڑتا
نصیب دل[2] سے تھا دن رات لڑتا[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : کبھی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : نصیب دوں -
۳- اس شعر کے بعد ضیاء الدین عبرت کی نظم ختم ہو جاتی ہے - غلام علی عشرت نے باقی قصہ شروع کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل عبارت اور چند اشعار لکھے تھے - چونکہ ان کو شاملِ متن کرنے سے قصے کے تسلسل میں فرق آتا تھا ، اس لیے ان جملوں اور اشعار کو حاشیے میں درج کر دیا گیا ہے -

"یہاں سے انتہائے نظم آرائی میر ضیاء الدین عبرت کی اور ابتدائے طبع آزمائی سید غلام علی عشرت کی - (عشرت)

کہ عشرت پی کے تو اُلفت کا اک جام
مری خاطر سے کردے اس کو اتمام
کہ اس[1] میں روح بھی عبرت کی ہو شاد
دعائے خیر سے تجھ کو کرے یاد
غرض قصہ ادھورا نہ رہ جائے
جو ہیں مشتاق اُن کے کام آئے
سو میں نے 'شوق' کی خاطر یہاں سے
کہ ہیں مشفق مرے اعلیٰ جہاں سے
اُٹھا کر اپنی ِکلکِ درفشاں کو
کیا تحریر یوں اس داستاں کو
کہ سن کے سب بیان وحشت انگیز
ہوئی اُلفت کی آتش دل میں ہی تیز"

(حاشیہ در حاشیہ)
۱- نسخۂ لکھنؤ : جس -

کہا یاں تک یہ قصہ بس ضیاء الدین عبرت نے
اب اس کا شوق ہردم مجھ کو یوں[1] رغبت دلاتا ہے

جو دو اک دن میں دن پوجا کا آیا
پدم نے یہ بہانا خوب پایا

اگرچہ تھی وہ دل از دست دادہ
ہوئی بیتاب ہر حد سے زیادہ

غرض گھیرا طپش نے دل کی ، وہ ماہ
پرستاروں کی جانب دیکھ بھر آہ

لگی کہنے کہ ہاں ہووے سواری
کروں گی سیرِ گلشن کی تیاری

ہے مدت سے برنگِ غنچہ دل تنگ
چمن کا ہو کلیدِ قفل آہنگ

کہوں کیا میں کہ دیر حکم تھی واں
سواری کا ہوا موجود ساماں

اٹھ اب اے ساقیِ سرمست ، خود کام
پلا مجھ کو مئے گلرنگ کا جام

سواری باغ میں آئی پدم کی
لکھوں تعریف اس رشکِ ارم کی

سیر باغ کو پدماوت کا جانا اور تنہائی میں چند شعر عاشقانہ پڑھ کے دل کو بہلانا

چمن میں کس کے آنے کی ہے شادی کون آتا ہے
کہ ہر اک پھول شبّو کا جو شہنائی بجاتا ہے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہے یہاں سے سوا ہر مجھ کو اب ۔

لیے ہمراہ خیلِ ماہ رویاں
بہار آسا چلی سوئے گلستاں
قریبِ بت کدہ تھا اس کا اک باغ
ہے جس کے رنگ سے باغِ ارم داغ
قیامت سرو اس کے یوں نمایاں
خجل ہو دیکھ جس کو قدِ خوباں
مصفّا اور رنگیں غنچۂ گل
فدا جس پر[1] سراپا جانِ بلبل
وہ سنبل واں کی مثلِ زلفِ خوباں
بلائے خاطرِ جمعِ پریشاں
وہ عالم نرگسِ شہلا کا اے یار
شفا بخشِ مرضِ چشمِ بیمار[2]
وہ سوسن با زبانِ حال فی الحال
کرے عاشق کا استفسار احوال
وہ جاری آب جوئیں اس طرح سے
بہے ہے چشمِ عاشق جس طرح سے
بھرے[3] نہروں میں پانی مثل سرشار
نسیمِ سرد اور سایہ ہوادار
صراحی جام سے[4] وہ غنچہ و گل
جنہیں[5] دیکھے گئی دل کی گرہ کھل

۱- نسخۂ لکھنؤ : جن پر -
۲- نسخۂ لکھنؤ : چشم دلدار -
۳- نسخۂ لکھنؤ : بھرے -
۴- نسخۂ لکھنؤ : جام و مے -
۵- نسخۂ لکھنؤ : جوہیں -

کہیں نسریں، کسی جا نسترن ہے
جدا ہر کوئی گل مثلِ چمن ہے[1]
کسی جا موگرا اور موتیا ہے
چنبیلی اور کہیں بیلا کھلا ہے
بہارِ جعفری رنگِ مدن بان
جدا رکھتی ہیں[2] اپنی اور ہی آن
نوائے کوکلا وحشت فزا ہے
وہ خیل[3] قمریاں کوکو سرا ہے
صدائے طوطیان و عندلیبان
خراشِ سینۂ آفت نصیبان
فصیلوں پر چمن کی رقصِ طاؤس
ہو رقاصِ چمن جن کا[4] قدم بوس
وہ سرگرمِ ترنم فاختہ ہے
غرض اک عالمِ بے ساختہ ہے
وہ سائے تاک کے[5] غارت گرِ ہوش
لگائیں تاک جن پر آ کے مے نوش
ہوئی داخل جو وہ اس گلستاں میں
بہار آئی گویا[6] باغِ جناں میں

۱- نسخۂ لکھنؤ : ادھر اک گل پہ بلبل نغمہ زن ہے ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : رکھتی ہے ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : وہ جنگل ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : جس کی ۔ نسخۂ نول کشور : بن کے ۔ نسخۂ شیراز : جن کی ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : وہ سایہ تاک کا ۔ نسخۂ نول کشور : وہ ثانی تاک کے ۔
۶- نسخۂ لکھنؤ : بہار آتی ہے جوں ۔

پرستاریں جو لاکھوں گلبدن تھیں
کہوں کیا رونقِ صحنِ چمن تھیں
صبا نے فرشِ گل ہر سو بچھایا
پدم کو میہماں اپنا بنایا
گلوں نے عطرداں اپنے کیے وا
معطر مغز ہو تا میہماں کا
بسانِ چوبداراں اہتمامی
ہوئی نرگس عصا لے کر سلامی
وہ بنگلا تھا جو اس گلشن میں تعمیر
نہیں ہو سکتی[1] خوبی جس کی تحریر
کہوں کیا اس کا[2] رنگ و شان شوکت
کہ تھا[3] روئے زمیں پر قصرِ جنت
ذرا دم لے کے واں وہ[4] شعلۂ نور
لگی پھرنے چمن میں جس طرح مور
گروہ خادماں تھا اس کے ہمراہ
اور ان میں جو ستاروں میں پھرے ماہ
پھرے کوئی کسی کو ساتھ لے کر
خیابانِ چمن میں ایدھر اودھر[5]

۱- نسخۂ لکھنؤ : نہیں ہووے گی ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : اس کی ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : کہ ہے ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : واں سے ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : ہر روش پر ۔

کوئی آبِ رواں کو سدِرہ ہو
کوئی مل مل کے دھووے دست وپا کو

ہم لے چند گل کو[1] بستہ کرکے
پھرے کوئی لیے گلدستہ کرکے

اشاروں سے کسی کو کوئی بلاوے[2]
کسی کو کوئی کچھ عالم دکھاوے

گلِ سوسن سے کوئی ہم زباں ہو
کوئی نرگس سے باندھے ٹکٹکی کو[3]

چنبیلی کوئی[4] اپنے قد کو دکھلا
کرے سروِ چمن پر حشر برپا

ادھر اودھر ہو کوئی مست بیباک[5]
لگاوے خوشۂ انگور پر تاک

ہے کوئی توڑنے کو سیب آتی
لے کوئی توڑ جھٹ سے ناشپاتی

اناروں کے کوئی دانے نکالے
چبا دانتوں میں اور اس سے مزا لے[6]

۱- نسخۂ لکھنؤ : چند گلگوں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : گھر بلاوے - نسخۂ نول کشور : کسی کوئی بلاوے-
۳- نسخۂ لکھنؤ : مصرعے مقدم مؤخر ہیں -
۴- نسخۂ لکھنؤ : چلی ہے کوئی -
۵- نسخۂ لکھنؤ : کوئی اُن میں سے ہو کر چست و چالاک - نسخۂ نول کشور : مست بیتاب -
۶- نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم مؤخر ہیں -

اچھل کر کوئی نارنگی کو توڑے
نہ جب تک ٹوٹے ٹہنی کو نہ چھوڑے
کوئی غنچہ دہن اور غیرتِ گل
پھرے گاتی ہوئی مانندِ بلبل
غزل خوانی کرے کوئی خوش آواز
سنے تھی[1] کان دھر کر کوئی طناز
کسی کے پاؤں پر کر سر کا سایہ
جتا جاتی تھی کوئی کچھ کنایہ
کوئی طرار شاکی ہو[2] کسی کی
کہے تجھ کو خبر کیا میرے جی کی
اگر مرجھایا گل تو دیکھے غافل[3]
بلا شک اس کو میرا جانیو دل
کسی کو کوئی آنکھوں سے کہے ہے
اری آلی،[4] اگر بادام لے ہے
کسی کے پاس کوئی اور کوئی دور
پھرے صحنِ چمن میں صورتِ حور[5]
اور ان میں وہ صنم باعزت و شان
اودھر ایدھر پھرے سرو چراغاں[6]

۱- نسخۂ لکھنؤ : سنے ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : جو گل مرجھایا دیکھے تو او عاقل
بلا شک جانیو اس کو مرا دل
۴- نسخۂ نول کشور : آئی -
۵- نسخۂ لکھنؤ : جس طرح حور -
۶- نسخۂ لکھنؤ : پھرے تھے ہر طرف سرو خراماں -

اکڑ کے جب چلے وہ سرو قامت

نہ قامت بلکہ سر تا پا قیامت

کرے قمری نہ کیونکر طوق داری

کہ ہے پامال کبکِ کوہساری

کبھیں زلفِ معنبر کو وہ کھولے

تو لاکھوں پیچ سنبل کے تئیں دے

ولے دل میں جو اس طوطے کی باتیں

سکھائی عشق کے تئیں جس نے گھاتیں

ادھر اودھر پھرے بس[1] مضطرب حال

بجان و دل غمِ الفت کی پامال

گل و بلبل پہ دھر با[2] صد بہانہ

پھرے اشعار پڑھتی عاشقانہ

رہوں دیدار کو اے مہر تا چند

سراپا چشم میں نرگس کی مانند

نہیں ہے باغ میں یہ سرو اے ماہ

ہے میرے پاس دل پر درد کی آہ

بسانِ سنبلِ گلزار اے جاں

تری دوری سے ہوں میں نت پریشاں

اسی صورت کے دو اک شعر پُر درد

اکیلے ہو کے پڑھنا با دمِ سرد

۱- نسخۂ لکھنؤ : پھرے تھی ہر طرف وہ -

۲- نسخۂ لکھنؤ : رکھ کر -

پلا ساقی شرابِ نابِ انگور
کہ جس کے نشہ میں ہوں مست و مسرور[1]
بھٹکتا باغ سے بت خانہ جاؤں
صنم خانے کا عالم دیکھ آؤں

ایک سہیلی کا بُت خانے میں آنا اور رتن سین کو جوگیوں میں دیکھ جانا

چمن کی سیر تو کرتا ہے اے دل بے خبر اس سے
کہ گلچین قضا یاں کیسے کیسے گل کھلاتا ہے

غرض گلگشت کرتی وہ خود آرا
پھرے تھی باغ میں محوِ تماشا
کہ ناگہ اک پرستارِ وفادار
بسان طوطیِ گلزار طرّار
نکل آئی چمن سے سوئے صحرا
کہ وحشی طبع کو اکثر ہے بھاتا
چلی سمتِ صنم خانہ وہ مہرو
کرے نظارہ تا روئے صنم کو
یہ دیکھا کر کے اس نے واں گزارا
کہ ہے اک ماہ اور صد[2] ماہ پارہ

۱- نسخۂ لکھنؤ میں یہ اور اس کے بعد کا شعر نئے عنوان کے نیچے درج ہیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : صدہا -

پرستش کو صنم کی واں تھی[1] آئی
نظر آئی بتوں میں[2] اک خدائی
جونہیں دیکھا وہ جوگی ماہ پیکر
ہوئی آئینۂ حیرت سراسر[3]
بچھا کر مِرگ چھالا اپنا اپنا
جدھر دیکھیے ہر اک[4] جوگی ہے بیٹھا
بھبھوت اپنے ملے تھے گو وہ ہر آن
صفا جوں آئینہ تھے وہ[5] دو چنداں
وہ حلقہ کان میں غارتِ گر ہوش
دلِ عالم ہے جن کا[6] حلقہ در گوش
وہ زریں الڈویاں[7] جیوں مہ پہ ہالا
وہ ہر اک پاس اک اک مِرگ چھالا
لباس ان کا وہ رنگیں کہربائی
برنگِ کاہ پھرہ اک خدائی
وہ عالم ان کا کیا کہیے کہ کیا تھا
کہ جن پر اک جہاں جوگی ہوا تھا[8]

۱- نسخۂ لکھنؤ : وہ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : الھوں میں۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہوئی جوں آئینہ غرقِ تحیر۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : اُدھر۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : پر تھی۔
۶- نسخۂ لکھنؤ : جس کا۔
۷- الڈویاں : لغوی معنی کنڈلیاں یا حلقے۔ جوگی اور جوگنیں بالوں کی جٹاؤں کو لپیٹ کر سروں پر بناتے ہیں۔
۸- نسخۂ لکھنؤ : بہ حسن ہر ایک جگہ جوگی لیا تھا۔

کوئی ہاتھوں میں سمرن اپنے لے کر
دھیان و گیان میں کہتا تھا ہر ہر

وہ عالم ان کا[1] تھا اک جا نے عش عش
نگہ بھر جس کو دیکھا کر گئے غش

خصوصاً جب نظر آیا رتن سین
گیا بس دیکھتے ہی صبر اور چین

عجب عالم میں دیکھا اس کا عالم
کہ یہ عالم ہے عالم میں بہت کم

وہ صورت رشکِ مہر و ماہِ کنعاں
سرورِ خاطرِ طبعِ عزیزاں

ہے بیٹھا صندلی چوکی[2] بچھائے
بھبھوت اپنے بدن اوپر[3] لگائے

وہ سر سے تا قدم موئے پریشاں
تہِ ابرِ سیہ مہرِ درخشاں

وہ پیشانی کا اور ابرو کا عالم
ہلال و بدر گویا ہیں یہ باہم

کہوں کیا[4] وہ مژہ تیرِ جفا کار
جگر سے ہو جو اک ہی وار میں پار

۱- نسخۂ لکھنؤ : اس کا۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : صندلیں چوکی۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : بدن پر سب۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : کہیں کیا۔

قیامت چشمِ مست اس کی[1] وہ سرشار
کریں چنگے بھلے کو پل میں بیمار
صدف کی طرح کان اس کے طرح دار
وہ مندرے ان میں رشکِ درِ شہوار
بیاں کیا کیجے عارض صاف وخوش رنگ
صفائے گل جنہیں ہو دیکھ کر دنگ
وہ بینی دیکھ کر عالم ہے کہتا
الف ہے منشیِ وحدت نے کھینچا
کہوں کیونکر نہ غنچہ اس دہن کو
کہ رہ مطلق نہیں جس میں سخن کو
وہ لب یاقوت یا گلبرگِ تر ہیں
وہ دنداں غیرتِ سلکِ گہر ہیں
کہوں کیا اس کا وہ چاہ زنخداں
کہ چاہِ مسکنِ[2] صد ماہِ کنعاں
بیاض گردن اس کی دیکھ پاویں
ندامت سے نہ آہو سر اٹھاویں
وہ شانہ اور بازو اور کلائی
کہ عاشق جن کی ہے ساری خدائی
وہ پنجہ غیرتِ برگِ چناری
خطِ اللہ کی صورت ہے ساری

۱- نسخۂ لکھنؤ : چشم میں اس کی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : جائے مسکن -

صفائی سینہ کا عالم[1] کہوں کیا
کہ ہے[2] اک صندلیں لوحِ مصفّا
شکم ویسا ہی کچھ صاف و ملائم[3]
کہ ہو مخمل کو جس سے شرم دائم
نہ ہو دل ناف کو کیوں دیکھ بیتاب
کہ بحرِ عشق و خوبی[4] کا ہے گرداب
کہے ہے خلق جس کو مو کمر ہے
میاں ہم بھی ذری دیکھیں کدھر ہے
سرین نیچے کمر کے جلوہ گر ہیں
کہ اک رشتے میں لٹکے دو گہر ہیں
وہ زانو کی صفائی اور ملاحت
کہ آوے دیکھ آئینے کو حیرت[5]
عجب وہ ساق سیمیں شمع کافور
سراسر[6] حسن و خوبی معدنِ نور
غرض سر سے وہ لے تا ناخنِ پا
بلا بالا قیامت سرو آسا
بایں عالم کہوں کیا وہ رتن سین
دل و جاں کو ہو جس سے راحت و چین

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : کی صورت ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : تھی ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : شکم کچھ صاف ، نازک اور ملائم ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : حسن و خوبی ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : حسرت ۔
۶۔ نسخۂ لکھنؤ : سراپا ۔

لگائے آنکھ دیوارِ چمن پر
ہدم کا منتظر بیٹھا تھا مضطر
کہ یعنی جب وہ گلشن کو چلی تھی
خبر طوطے نے پہلے اس کو دی تھی
کہ آئی وہ گلِ باغِ جوانی
برائے گشت و سیرِ بوستانی
سو یہ تھا منتظر اس کے قدم کا
کہ جلوہ دیکھے تا حسنِ ہدم کا
غرض وہ کھینچ آہیں سرد دل سے
یہ پڑھتا تھا غزل اک دردِ دل سے

غزل

صبا نے تیرے مقدم کی سنائی
تنِ بے جاں میں گویا جان آئی
دکھا جلوہ مجھے او مہرِ تاباں!
شبِ فرقت سے تا ہووے رہائی
بسانِ قیس میں، او رشکِ لیلٰی!
بیاباں کی بہت سی خاک اڑائی
چھٹا کر[1] بادشاہی تیرے غم نے
مری صورت ہے جوگی کی بنائی
بہارِ داغِ دل آ دیکھ میرے
تجھے سیرِ گلستاں گر خوش آئی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : چھڑا کر۔

قدم رنجہ نہیں کرتا تو اے گل
ہے شاید پاؤں میں مہدی لگائی

دکھا صورت کہ ہوں مانندِ نرگس
سراپا چشم از رنجِ جدائی

ترے در تک تو آ پہنچا ہوں مر مر
ولے محفل میں ہو کیونکر رسائی

سریرِ پادشاہی سے ہے 'عشرت'
مجھے خوش تیرے کوچے کی گدائی

غزل یہ دردِ دل سے پڑھ کے وہ ماہ
صنم خانے میں جا کہتا تھا بھر آہ

تمھارا جگ میں ہے وہ آستانہ
کہیں ہم جس کو مسجودِ زمانہ

پرستش گاہِ عالم بس[1] ہے یہ در
مرادِ خلق بر آتی ہے اکثر

حصولِ دین و دنیا سب کو یاں ہے
تمھارا فیض عالم پر عیاں ہے

کوئی کیسا ہی یاں مغموم آوے
نہیں ممکن کہ وہ محروم جاوے

مرادِ دل مری سب حسبِ دل خواہ
بتاں آمادہ کر دو[2] جلد للہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : عالم میں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : یہاں آباد کردو -

کبھو افلاک کی جانب نظر کر
غمِ دل سے کبھی تھا آہ بھر بھر[1]
کہ کب اے گردشِ ایام دل خواہ
قرانِ مشتری ہووے گا با ماہ
بلندی پائے کب میرا ستارا
ملے مجھ سے جو آ وہ ماہ پارہ
طپش سے غم کی وہ مہرِ درخشاں
بسانِ ذرہ تھا بے تاب ہر آں[2]
ستم دیدہ شبِ تار جدائی
بدل خواہاں دعائے روشنائی
شتابی ساقیا اک جام بھر دے
کہ جو پیتے ہی مجھ کو مست کر دے
تری مے سے جو کیفیت میں پاؤں
تو پھر اوروں کو بھی رغبت دلاؤں

سہیلی کا پدماوت کے پاس آنا اور نادانستہ وطن میں جوگی کا مذکور کرکے رغبت دلانا

فغاں ہے[3] زاہد و بت خانہ کی جانب کو دل میرا
پرستش کو صنم کی آج کیا رغبت دلاتا ہے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : بھر کر ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : بیتاب و حیراں ۔
۳۔ نسخۂ مصطفائی : فغاں اے ۔ نسخۂ نول کشور : فغاں نے ۔ نسخۂ شیرانی : شعر ندارد ۔
مفہوم کے اعتبار سے مصرعے کی موجودہ صورت جو نسخۂ لکھنؤ کے مطابق ہے ، زیادہ قرینِ صحت ہے ۔

یہاں سے یوں فسوں خوانِ محبت
کہے ہے داستانِ عشق و محنت[1]
ہدم کی وہ پرستارِ وفا جو
جو آئی تھی وہاں طوفِ صنم کو
جو دیکھی اس نے یہ جوگی کی صورت[2]
سراپا حسن اور خوبی کی صورت
کہوں کیا میں کہ جوں آئینہ حیراں
نسیم آسا چلی سوئے گلستاں
مٹے جوبن سے اس جوگی کی یکبار
ہوئی تھی بسکہ مستِ عشق سرشار
غرض جیوں تو ہدم تک جا کے فی الحال
کہا سیرِ صنم خانہ کا احوال
کہ اے سر تا قدم سرمایۂ حسن
حدیثِ عشق الفت آیۂ حسن
عجب دیکھا ہے میں نے ایک عالم
کہ جائے حسرت و حیرت ہے عالم[3]
یہاں سے بت کدہ وہ جو قریں ہے
زمینِ باغ سے[4] جس کی زمیں ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ : عشق و محبت ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : جوہیں دیکھی اس نے جوگی کی صورت
- - - - - - - خوبی کی صورت
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہے باہم ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : باغ میں ۔

وہاں آج ایک حلقہ جوگیوں کا
خدا جانے کہاں سے آ کے اترا
کہوں کیا میں ہزاروں ان میں جوگی
پری کی شکل، پر غم کے بروگی
سبھی سولہ برس کے یا کم و بیش
سنانِ خارِ غم سے بادلِ ریش
اور ان میں اک گرو ان کا ہے جیوں ماہ
وہ سب ہیں فوج اس کی اور وہ شاہ
عجب صورت سے وہ والا گہر ہے
زمیں پر دوسرا گویا قمر ہے
خدا جانے کہ ہے کس کا بروگی
کہ نکلا اپنے گھر سے بن کے جوگی
سنا تھا گرچہ گوپی چند کا حال
یہ ہے اس سے زیادہ اس کا احوال
کیا تھا بھرتری نے ترک گو راج
نہ ایسا ہوگا وہ جیسا ہے یہ آج
کہوں کیا میں کہ اس کی دیکھ حالت
جگر پھٹتا ہے اور آتی ہے رقت
بیاں کیا کیجیے جائے عجب ہے
کوئی شہزادۂ عالی نسب ہے
و یا ہے یہ کسی راجہ کا بیٹا
کہ اپنا چھوڑ کر ہے راج آیا
پرستش کو صنم کی جو چلوگی
مرے کہنے سے کیا ہے دیکھ لوگی

شتابی جام دے ساقی نہ کر دیر
کہ مے پینے سے ہوتا ہوں نہیں سیر[1]
ملاقاتِ پدم ہے یاں رتن سے
ملے ہے عندلیبِ نو چمن سے

پدماوت اور رتن سین کا سامنا ہو جانا اور دونوں پر عالم بے ہوشی اور بے خودی کا آنا

خدا کے واسطے اے دل تو یوں بے خود نہ ہو جانا
کہ تیرے جذبِ الفت سے وہ کافر آج آتا ہے

زبانی اس کی سن کر حال سارا
چلی طوفِ صنم کو وہ خود آرا
نہایت مضطرب وہ سرو قامت
گئی اودھر کو با شور و قیامت[2]
غرض دن بھی پرستش کا تھا اس روز
کہ واں پر یہ گئی سہر دل افروز
پرستش کا انھوں کے ہے یہ[3] دستور
بجالا کر سراسر غیرتِ حور
کھڑی ہو دست بستہ کھینچ کر آہ
لگی یوں عرض کرنے بت سے وہ ماہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلا شعر لئے عنوان کے بعد ہیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : یہ سن کر بات اس سے سرو قامت
چلی اس طرف وہ شور قیامت
۳- نسخۂ لکھنؤ : جو دستور -

تمھاری دیو جی چیری کہاؤں
تعجب ہے مراد اپنی نہ پاؤں
ہمارے ساتھ کی سکھیاں بیاہیں
دیا ہے آپ کی ، دلہن کہائیں
کبھی مورت سے جا کر کالکا کی
ندا ہو ہو کے اس کی[1] یوں کہے تھی
کہ صدقے تیرے اے ماتا بھوانی
ملا دے مجھ سا کوئی مجھ کو ثانی
بتوں سے اس کو آتی کچھ نہ آواز
بہ تنگ آ کر تو یہ کہتی وہ طناز
عبث[2] پتھر کو میں نے سر جھکایا
کہ مطلب ایک بھی ان سے نہ پایا
جواب آتا اسے کیا ان بتوں سے
کہ دیکھ اس کو وہ آپ ہی مر گئے تھے
غرض اک دیر میں نکلی وہ مہرو
کہ چاہے اپنی پھر دولت سرا کو
کہ اس میں وہ پرستارِ وفا کیش
لگی کہنے کہ اے رانی وہ درویش
عمارت وہ جو سمتِ شرق یاں ہے
سو اس میں وہ گروہِ جوگیاں ہے
زبس ہے حسن سے ان کے سراسر
بسانِ مطلعِ خورشید وہ گھر

۱۔ نسخہ لکھنؤ : اس سے ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : عجب ۔

جہانہ جو تھی اس کی بس کہ وہ ماہ
کبھی سو بات اس نے حسبِ دل خواہ
عافے میں بصد شوکت اُدھر کو
ہوئی جوں ہی روانہ وہ پری رو
کشش تھی بسکہ یہ عشقِ گدا کی
کہ آ پہنچی[1] سواری بادشا کی
پرستاریں جلو میں ایدھر اودھر
بھنور قربان جیسے گل کے اوپر[2]
ادھر تو اس کو تھی ہی[3] انتظاری
کہ آ پہنچی ہدم کی واں سواری
اٹھایا جوں ہی پردہ اس نے یکبار
نگاہیں دونوں کی باہم ہوئیں چار
کہوں کیا عشق نے جلوہ دیکھایا
ادھر اس کو اُدھر اس کو غش آیا
ادھر اودھر ہوئے وہ دونوں بیہوش[4]
کمالِ نشہ میں جیسے قدح نوش
وہ گھائل اس طرف تیرِ مژہ سے
ادھر بسمل یہ اس تیغِ نگہ سے

۱- نسخۂ لکھنؤ : کہ آئی واں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : پرستاریں تھیں جو طاؤس طناز
اور ان کے بیچ میں وہ غیرتِ ناز
۳- نسخۂ لکھنؤ : اُس کی تو تھی -
۴- نسخۂ لکھنؤ : نظر ملتے ہوئے دونوں وہ بے ہوش

اتفاق کچھ پدم کو اس میں آیا
کہ اس نے آپ کو اپنے میں پایا

اتر ڈولے سے اور صندل منگا کے
لکھا اس مست کی چھاتی پہ آ کے

ہوئی حالت ابھی ہے یہ تمھاری
برار آوے گی کب صحبت ہماری

رنگے کپڑے جو تم نے تو ہوا کیا
بنے جوگی نہ لیکن جوگ سیکھا

عجب ہی مے تھی اے یارو یہ[1] پرجوش
کہ ساقی اور مے دونوں ہیں بے ہوش

خواب دیکھنا پدماوت کا بیچ تصور رتن سین کے اور تعبیر پانا اس کی اپنے ہمدموں سے

نہیں میں چھوڑتا دامن تو پھر جانے کو وہ بدخو
خفا ہوتا ہے کس کس شکل اور دامن چھڑاتا ہے

حروفِ رمز چھاتی پر بنا کے
چلی القصّہ وہ صندل لگا کے

وہ حلقے کان میں دیکھے جو اس کے
ہوئی حلقہ بگوش اس کی وہ دل سے

پھنسا کر دل کو جوگی کی جٹا میں
ہوئی رونق فزا دولت سرا میں

۱- نسخہ' لکھنؤ : وہ -

ز بس مضطر نہایت مثلِ سیماب
فغان و نالہ بر لب ، چشم پُر آب
طپش سے دل کی از حد ناگوارا[1]
غرض جیوں تیوں وہ گزرا روز سارا
ہوئی شب اور بھی غارت گرِ جاں
برنگِ زلف پُر پیچ و پریشاں
تصور تھا اسے زلفِ رتن سے
کٹی القصہ شب رنج و محن سے
بیادِ روے جاناں آخرِ کار
ہوئی پردے سے شب کے صبح اظہار[2]
الٹھی عادت سے اپنی وہ گل اندام
نہ آیا تھا اسے از بسکہ آرام
غرض بیٹھی وہ تختِ زر پہ آ کے
مصاحب اس کی بیٹھیں گرد جا کے
لگی کہنے انھوں سے رشکِ مہتاب
رہی ہوں رات ساری آج بے خواب
دلِ بے کل نے ہرگز کل نہ پائی
کہوں کیا میں کہ کچھ غفلت نہ آئی
گئی میں سو سحرگاہاں جو بیتاب
عجب عالم کی دیکھی[3] طرفہ اک خواب

۱- نسخۂ لکھنؤ : کر گوارا ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : سحر پردے سے شب کے ہو نمودار ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : کا دیکھا ۔

کہ نکلا غرب سے خورشیدِ انور
طلوعِ ماہ بھی ہے شرق اوپر
طرف مہتاب کی ہے مہر آیا
بہم دونوں نے اک جا وصل پایا
ہوئی راون سے راون گڑھ آپر جنگ
نہیں معلوم کچھ اس بات کا ڈھنگ
سنی ہمزادوں نے اس کی جو تقریر
کہا اس خواب کی[1] ہیگی یہ تعبیر
پرستش کو گئی تھی کل جو تم واں
ہوئی تم پر دیابت کی[2] نمایاں
مہ و خورشید ہیں یہ مرد اور زن
ہوا اس بات سے دل پر یہ روشن
کہ راجہ سمت مغرب سے کوئی آئے
تو بس شادی تمہاری اس سے ہو جائے
بر آویں گے اگرچہ مطلبِ دل
پہ کوئی جنگ بھی ہووے مقابل
ملا اوکھا[3] کو انرو[4] جس طرح سے
بر آوے تیرا مطلب اس طرح سے
انھوں نے یہ دی تعبیر اس کو
تمہارے دل کو راحت اور خوشی ہو

۱۔ نسخہ نول کشور : اس بات کی ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : دیا تم صنم کی ہوئی ۔
۳۔ نامِ عاشق ۔ (مصنف) ۔
۴۔ نامِ معشوق ۔ (مصنف) ۔

سہاگ اور بھاگ ہووے سب تمھارا
کہ ہو یہ خواب جلدی آشکارا
اُدھر[1] اس بات سے خوش وہ شکرلب
کہ ہو[2] تعبیر ظاہر خواب کی کب
پلا ساقی مجھے جامِ مئے ناب
کہ دل میرا ہوا جاتا ہے بے تاب
میں تیرے جام سے ہوں مست سرشار
کروں راجہ رتن کو غش سے ہشیار[3]

رتن سین کا ہوش و حواس میں آنا اور اپنا حال مصیبت کا بت خانے میں سدا شیو کو سنانا

جدا رکھتا ہے تجھ سے مجھ کو جاناں گردشِ گردوں
وگرنہ یہ جدا رہنا تو کس کافر کو بھاتا ہے

پدم کی لکھ کے درد و بے قراری
رتن کی اب لکھوں میں آہ و زاری
کہ یاں جس دم رتن کو ہوش آیا
تو جلوہ یار کا اپنے نہ[4] پایا
لگا بیتاب ہو ہو کر وہ رونے
طپش سے دل کی اپنے جان کھونے
کیا خونناب دل آنکھوں سے جاری
لگی افزود ہونے بے قراری

۱- و ۲- نسخۂ لکھنؤ : ہوئی -
۳- نسخۂ لکھنؤ : بیدار -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اپنے میں -

بسا دولت کے آید بر گزرگاہ
چو مرد آگہ نباشد کم کند راہ

وہ ہوش آیا تھا[1] بے ہوشی کا دریا
افاقت سے تو کچھ غش ہی بھلا تھا

غم آیا اور[2] اس پر فوج در فوج
کہ جوشِ بحر جیسے موج در موج

نہ دیکھے پر تو وہ جوگی بنا تھا
جو دیکھا تو کہوں میں حال کیا تھا

خبر سر کی رہی نہ کچھ قدم کی
نظر کے سامنے صورت ہدم کی

تصور کرکے اس کا قد و قامت
سر اس کے پر ہوئی برپا قیامت

کہوں کیا دیکھ نقشہ اس پری کا
درِ دیوانگی اس پر ہوا وا

اگرچہ صبر تھا غم نے جلایا
رہا تھا کچھ سو آنسو نے بہایا

ہوا غم پر غمِ دیدار طاری
لگی افزود ہونے بے قراری[3]

غرض حالت یہ اس کی ہو گئی یاں
کہ رہ جاتا ہے قالب جیسے بے جان

۱- نسخہ لکھنؤ : جو ہوش آیا تو ۔
۲- ہے غم آلودہ ۔
۳- نسخہ لکھنؤ : ہوا دل پر غمِ دلدار طاری
ہوئی ہردم زیادہ بے قراری

گیا صبر و تحمل نے کنارا
جو بحرِ درد و غم نے جوش مارا

بدم کی شکل اس جا یہ بنی تھی
کہ اس کو دم بدم یہ جان کنی تھی

اسے واں دیکھ کر آتے تو آئی
دلِ بیکل سے لیکن[1] کل نہ پائی

وہ مکھڑا تھا جو اس کا ارغوانی[2]
ہوا ہے[3] رشکِ رنگِ زعفرانی

ہوئیں اس کی وہ کیفی مست[4] آنکھیں
بسانِ مردمِ رنجور ہل میں

اڑا چہرے سے اس کے رنگ جوبن
خزاں دیدہ ہو کوئی جیسے گلشن

غمِ جوگی یہ کچھ دل میں سمایا
کہ دل ہی دل میں آہ[5] جوگی بنایا

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہرگز ۔
۲- نسخۂ نول کشور : زعفرانی ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : ہوا سو ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : کیفیں مست ۔
نسخۂ لکھنؤ میں اس شعر سے پہلے ایک شعر اور بھی ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ملتا :

بدل جمعی وہ رشکِ ماہ رویاں
ہوئی چوں سنبل گلشن پریشاں

۵- نسخۂ لکھنؤ : دل ہی میں اسے ۔

محبت نے کی دونوں دل میں[1] تاثیر
ہوا پیوست[2] دونوں دل میں اک تیر
ادھر اس کو طپش اس کے الم کی
ادھر تھی مبتلا یہ اس کے غم کی
رہے چندے اسی صورت شب و روز
مہ و خورشید با داغِ دل افروز[3]
کہ اک دن تنگ آ کے با دلِ ریش
غمِ دوری سے اس کے مردِ دلریش[4]
صنم خانے میں جا کے وہ پری زاد
صدا شیو سے لگا کرنے یہ فریاد
کہ اے بے فیض سنگِ تیرہ کہسار[5]
نہ آخر تو ہوا میرا مددگار
عبث اک عمر پوجا تجھ کو میں نے
کیا مطلب نہ میرا آہ تو نے
ترے کوچے کو میں سمجھا تھا گلزار
سو وہ پُرخار نکلا آخرِ کار
عبور بحر کرنا حسبِ دل خواہ
غرض ہے شیر کے[6] مشہور ہمراہ

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ کی دو دل میں ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : پُر خار ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : جگر سوز ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : بادلِ ریش ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : پتھر تیرہ کہسار ۔
۶۔ نسخۂ لکھنؤ : تیرگی ۔

دم بز ہاتھ میں آوے کسی کے
تو البتہ کنارے ہی پہ ڈوبے

کہاں کشتی مری لے کر ڈوبائی
نہ اے بت تو نے کی یاں ناخدائی

صدا یوں بت کدے سے اس کو آئی
نہیں یاں کچھ خبر اپنی پرائی

تجھے جس شمع سے ہے مثل خس لاگ
گئی بھڑکا کے سو یاں بھی وہی آگ

کہوں کیا تجھ سے اپنی حالتِ زار
دوا کس کی کرے ہووے جو بیمار

مرا خود حال غم سے یہ[1] بنایا
کہے تو ہو گیا پریوں کا سایہ

مجھے رہ رہ کے ہوگا یہ پریکھا
یہ بیداری ہے[2] یا کچھ خواب دیکھا

کہوں کیا میں کہ پریاں چھوڑ کیلاس
یہاں کس واسطے آئیں مرے پاس

جو آئیں تو گئیں پھر کیوں شتابی
مجھے جیوں عاشقاں دے کر خرابی[3]

زمیں پر چرخ سے یاں آشکارا
کیا تھا چاند تاروں نے گزارا

۱- نسخہ' لکھنؤ : یہ غم نے -
۲- نسخہ' لکھنؤ : تھی -
۳- نسخہ' لکھنؤ : دے اضطرابی -

رتن نے جو جواب صاف پایا
کہوں کیا جو جو اس کے جی میں آیا
در بت پر منگا کے چوب[1] انبار
ہوا جلنے کو دے کر آگ تیار
یہی بس جی میں اپنے اس نے ٹھانی
عبث ہے شمع ساں یہ زندگانی
نہ پہنچے گرچہ ہم اس کے قدم تک
غبار اپنا تو پہنچے گا پدم تک
لگا ہونے بتوں میں اس کا چرچا
کہ ناحق ہے رتن آتش میں جلتا
کوئی ہم میں سے اس کے تئیں[2] بچا لو
شرار و درد غم اس کا بجھا لو
اگر جل جائے گا جس دم یہ جوگی
پڑے گی پھر سبھوں[3] پر ہتیا سی
جو ہووے آ کے اپنا یوں قدم بوس
نہ کیجے آب سے پھر اس کو مایوس
ہنومان اس میں اس کا دیکھ احوال
سدا شیو پاس جا کے دم میں فی الحال
بیاں کرنے لگا احوال سارا
کہ جلتا ہے کوئی جوگی بچارا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : وہاں ہیزم کا کر کے خوب انبار ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : اب اس کو ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : ہم سبھوں ۔

جلے گر آپ ہی تنہا تو پھر کیا
ہمیں بھی ساتھ ہے اپنے جلاتا
تمھارا جو مکاں ہے واں پہ آ کے
ہے یوں بیٹھا غرض دھونی لگا کے
ہزاروں ساتھ اس کے جوگی چیلے
کہ وہ بھی یوں ہی اپنے جی پہ کھیلے
کوئی دم میں یہ جلتے ہیں وہ[1] جیوں کاہ
کیا القصہ میں نے تم کو آگاہ
اگر کچھ نام پر بھی[2] اپنے کد ہے
تو اے شیو ان پہ یہ وقتِ مدد ہے
جلاتی اس کی بس عالم کو ہے آگ
تو بچ کر واں سے میں آتا ہوں یاں بھاگ
غرض سن کر سدا شیو مستعد ہو
چلا لے ساتھ گورا پاربت کو
بدل کر جیوں کلنگی بھیس یک بار
ہوا سنگل کے جانب کو وہ تیار
گلے میں استخوانِ چند اور مار
بہم ڈالے ہوئے جیسے کوئی ہار
سوارِ گاؤ کاندھے مرگ چھالا
کئی ڈالے گلے میں[3] اور مالا

۱- نسخۂ لکھنؤ : دم بھر میں وہ جلتے ہیں وہ - نسخۂ نول کشور : دم میں کہ جلتے ہیں وہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : اگرچہ نام پر کچھ -
۳- نسخۂ لکھنؤ : کئی سر تھے گلے میں -

جبین پر ماہ[1] اور موئے پریشاں
سحاب و ماہ جیوں دست و گریباں
لیے کنٹھی وہ دوڑے[2] اپنے سب ہاتھ
چلا[3] واں سے وہ گورا پاربت ساتھ
جلو میں ساتھ ساتھ اس کے ہنومان
شفیقِ حالِ عشاقِ پریشان
مہادیو اس طرح سے آ کے پہنچا
رتن جلنے کو جس جا مستعد تھا
بہم کرنے لگا اس سے یہ گفتار
کہ جوگی کیوں ہے تو جلنے کو تیار
ہوئی بھاری تجھے کیوں زندگانی
جو کھوتا ہے تو اپنی نوجوانی
فلک سے کیا مصیبت تجھ پہ[4] آئی
جو تو نے آگ ہے اس جا لگائی
الم ہے کیا تجھے اے غیرتِ باغ
برنگِ لالہ کیوں کھاتا ہے تو داغ
تجھے اے ماہ سچ کہہ کیا الم ہے
ہلال آسا تو کس کے غم سے خم ہے

۱- نسخۂ لکھنؤ : جبیں جیوں ماہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کنٹھی رکھاتے تھے ڈمرو - نسخۂ نول کشور : لیے کنٹھے وہ دوڑے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : چلے -
۴- نسخۂ لکھنؤ : سر پر -

سرشک چشم تیرا کیوں ہے ڈھلتا
بسانِ شمع کہہ تو کیوں ہے جلتا
تو وہ بولا سہند آسا چٹک کر
وہیں قدموں پہ اس کے سر پٹک کر
کہ ہے تو کون سمجھانے کو آیا
جلے کو اور بھی دونا جلایا
مجھے ہے عشق کی آتش نے بھونا
جلایا تو نے سو آ اور[1] دونا
کہوں میں کیا تجھے غم کا بروگی
بنا عشق پدم سے ہوں میں جوگی
جو دیکھے ہے مجھے تو شکل محتاج
سو میں آیا ہوں اپنا چھوڑ کر راج
پرستش میں نے کی یاں دیوتا کی
تمنا یاں نہ بر آئی سو[2] میری
سدا شیو کا مجھے اک آسرا تھا
کہ حاصل ہوگی یاں میری تمنا
بر آئی جب نہ میری آرزو یاں[3]
تو میں ناچار جلتا ہوں پریشاں
نہ ہووے پاس اپنا جب کہ جانی
تو پھر کس کام ایسی[4] زندگانی

۱- نسخۂ لکھنؤ : آ کر مجھ کو ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : بھی پھر آئی نہ ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : نہ بر آئی تمنا جب میری یہاں ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : آوے ۔

نہ ہووے بر میں اپنا[1] جب کہ دلبر
تو پھر اس زیست سے ہے مرگ بہتر

یہاں تک آرزو میں گھر سے آیا
غضب ہے یاں بھی سو[2] مطلب نہ پایا

تو ہی پھر کہہ مجھے اب کیا کروں میں
جیوں کیا خاک، بہتر ہے مروں میں

اب اے ساقی مجھے وہ جام[3] بھر دے
کہ جس کا نشہ میرا کام کر دے

پلا دے مے کہ ہوشِ ظاہری جائیں
جو اسرارِ نہاں ہوں سو نظر آئیں

گورا پاربتی کا پری زاد کے بھیس میں آگے رتن سین کے آنا اور عاشق کامل پدماوت کا جان کے تدبیر اس کے پاس جانے کی بتانا

ہنسی آتی ہے مجھ کو ہم نشیں اس جا کے عاشق کو
فلک بے مہر کس کس شکل سے دیکھو لبھاتا ہے

سدا شیو سے ابھی وہ غم کا پامال
بیاں کرتا تھا اپنے دل کا احوال

کہ بہرِ امتحانِ عاشقِ زار
بنا گورا نے شکل اپنی طرح دار

اٹھا کر منہ سے پردہ روبرو آ
رتن سے پہلے آ کے حال پوچھا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : پاس اپنا۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : یاں بھی کچھ۔ نسخۂ نول کشور : یاں سے سو۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : اک جام۔

کہ تو اے نوجواں کس کا ہے مائل
ہے کس کی تیغِ ابرو کا تو گھائل
زباں پر لا پدم کا نام اک بار
ہوا وہ عاشقِ دل باختہ زار
لگی کہنے یہ گورا مسکرا کے
کہ تو عاشق ہوا ہے کس کا جا کے
نہ اپنی شکل پر کچھ رحم آیا
کہ اس پر حال یہ اپنا بنایا
اکھاڑہ تو نے اندر کا سنا ہے
جہاں کا حسن زیبِ دوسرا ہے
ہر اک صورت وہاں رشکِ قمر ہے
قمر کے داغ جن سے دل اوپر ہے[1]
سو اس مجلس میں مثلِ شاہ ہوں میں
ستارہ ہیں وہ سب اور ماہ ہوں میں
میں ہوں فرماں روائے کشورِ حسن
ہر اک نکتہ ہے میرا دفترِ حسن
نہیں کچھ قدرداں[2] حسنِ پدم کی
اسے نہ[3] دست رس میرے قدم کی
تمیز و عقل سے تو بہرہ ور ہے
تو بہتر مجھ سے کب کوئی بشر ہے

۱- نسخہ لکھنؤ : ہر لگ مہر تاباں سارا گھر ہے -
۲- نسخہ لکھنؤ : وہاں کیا قدر ہے -
۳- نسخہ لکھنؤ : نہیں ہے - نسخہ نول کشور : اسے نہیں -

جو دانا درجۂ اعلیٰ کو پاوے
تو لازم ہے کہ اسفل کو[1] نہ جاوے
کر اب بس ترک دل سے تو گدائی
کہ بخشوں گی میں تجھ کو بادشاہی
نہ کھو یہ نوجوانی او گل اندام
چل اب کر جی سے باہم عیش و آرام
فغاں بر لب وہ بولا بھر کے آنسو
کہ ہاں اے بے مروت کون ہے تو
مبارک حسن ہو تجھ کو یہ تیرا
نہیں مطلب بر آتا اس سے میرا
یہ باتیں کر نہ مجھ سے تو اے بے باک
کہ ہے سب مجھ کو اس بن آگ اور خاک
فدا اس پر سراسر نوجوانی[2]
نہیں خوش مجھ کو اس بن زندگانی
مجھے جب غیر اس کے کچھ نہ بھاوے
تو لطفِ حسن تیرا کیا خوش آوے
نہیں بن مرگ مجھ کو اور چارا
کہ بے اس کے نہیں جینا گوارا
تو کیا گر حور ہووے آ مقابل
تو البتہ قصور اپنا کرے دل
ملے رہنے کے خاطر باغ رضواں
عجب کیا یار بن ہو مثلِ زنداں

۱- نسخۂ لکھنؤ : اسفل پر -
۲- نسخۂ لکھنؤ : میرا سر اور جوانی -

ورائے یار ہرگز مت ورے ہو
ہری ہے کو تو پر مجھ سے ہرے ہو[1]

سنی جب گفتگوئے عاشقِ زار
کہ اس کو یار بن ہے زیست دشوار

سداشیو سے یہ کی پھر ہنس کے تقریر
کہ اس پر کر چکا ہے عشق تاثیر

مقرر ہے یہ پدماوت کا مائل
دل اس کا تیغِ غم سے سچ ہے گھائل

فغاں پر لب ہے یہ جو با رخِ زرد
ہے گرمِ نالہ ہردم با دمِ سرد

اسے بس آتشِ غم نے ہے بھونا
قلق ہردم ہے اس کے دل پہ دونا

تمھارا اس کے دل میں آسرا ہے
کہ یہ بیمار محتاجِ دوا ہے

نہ اپنے نام کی ہوگی تمھیں لاج
کلنک اک تازہ پھر ہوگا لیا آج[2]

رتن یہ ان کی باتیں سن کے باہم
ہوا کچھ دل ہی دل میں[3] شاد و خرم

جو دیکھی غور سے ان کی وہ صورت
مٹی تب دل سے بارے سب کدورت

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -
۲- نسخۂ لکھنؤ : تمھیں آج -
۳- نسخۂ لکھنؤ : دل میں اپنے -

ہوا معلوم یعنی دیوتا ہے
کہ اس نے بھیس اپنا یہ کیا ہے
سنی تھی جو نشانی اور آثار
سو اس میں اس نے دیکھے سب نمودار
سوارِ گاؤ باشکلِ کلنکی
رتن نے جبکہ اس کی وضع دیکھی
یقیں یہ صاف اس کے دل میں آیا
کیا یعنی سدا شیوا نے یہ مایا
گرا پاؤں پہ فوراً اس کے جا کے
لگا رونے زبس آنسو بہا کے
ہوا یاں تک وہ جوش غم سے گریاں
دوبارہ ہو گیا عالم میں طوفاں
لگا کہنے کہ آیا تھا میں تم پاس
کہ یاں میری بر آوے کی غرض آس
بر آئی جب نہ میری یاں تمنا
سو ہو مایوس اب میں مر چلا تھا
خدا کا شکر سو تم نے دیا کی
بوقتِ نزع میری آ خبر لی
مرا احوال ہیگا جائے شفقت
کہ ہے مجھ پر زبس رنج و مصیبت
مرادِ دل مری اب تم[1] دلا دو
پدم سے یعنی اب جلدی ملا دو

۱- نسخۂ لکھنؤ : مجھ کو ۔

نہیں تاب جدائی مجھ کو فی الحال
کیا ہے غم نے اس کے بسکہ پامال

کہا اس بت نے اتنی بات کیا ہے
تحمل دل میں رکھ اپنے خدا ہے

خزاں کے دن گئے ، آئی بہار اب
ہوئی روز الم پر عیش کی شب

مثل ہے جب تلک کھینچے نہ کچھ رنج
غرض حاصل نہ ہووے تب تلک گنج

نہ زیر ارہ جب تلک سر جھکاوے
بسان شانہ زلفوں تک نہ جاوے

نہ پہنچے جب تلک کچھ صدمۂ خار
میسر ہو نہ ہرگز گشت گلزار

غبار راہ تا ہرگز نہ ہووے
برنگ سرمہ آنکھوں تک نہ پہنچے

نہ کچھ رنج سفر جب تک اٹھاوے
ہے ممکن منزل مقصود پاوے ؟

جلا دے شمع ساں جب تک نہ تن من
نہ ہو بزم جہاں میں نام روشن

نہیں ہوتی[1] کوئی ایسی شب تار
سحر جس سے نہ آخر ہو نمودار

ہماری آرزو اے مضطرب حال
ذرا کر صبر نالا دے پر و بال

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہوگی -

اگرچہ ہاتھ آتا ہے تو مشکل
مرادِ دل تری پر ہوگی حاصل
کروں تیرے تئیں اب اس سے آگاہ
جو اے راہی تجھے درپیش ہے راہ
شتابی منزلِ مقصود دیکھے
بہ چشمِ دل رخِ بہبود دیکھے
حصارِ شہر کے[1] ظاہر ہیں نو در
سو رہتے ہیں غرض مسدود اکثر
کوئی جب شہر سے باہر کو جاوے
و یا حسبِ الطلب اندر کو آوے
تو وا ہوتے ہیں اس دم اے خرد مند
وگرنہ غنچہ ساں رہتے ہیں وہ بند
مگر اک سمت ہے اک[2] چشمۂ آب
حصارِ شہر کے پائیں ہے گرداب
کوئی غوّاص ہو غوطہ لگاوے
تو جیوں در وہ دُرِ مطلب کو پاوے
کہ اس میں ایک دروازہ ہے پنہاں
نہیں اکثر کسی پر وہ نمایاں
یہاں کے مالکِ کشور[3] نے وہ در
رکھا ہے حکمتِ عملی سے واں پر

۱- نسخۂ لکھنؤ : میں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : کو ہے ۔
۳- نسخۂ نول کشور : کشور مالک ۔

مبادا یاں پہ کر دشمن کوئی آئے
ہر اک در شہر کا اعدا سے گھر جائے
درِ کم سے تو پھر وہ راہ پاوے
اسی صورت سے جی اپنا بچاوے
جو ہے مدِنظر یہ راہ تجھ کو
تو بس میں کر چکا آگاہ تجھ کو
تو جیوں غواص کر ضبط اب نفس کو
کہ تا غوطہ کی تجھ کو دست رس ہو[1]
صدف آسا کھلا ہے اس میں یوں در[2]
پھر اس میں کود کر جا مثلِ گوہر
غرض اک راہ یوں ہے کر تو جاوے[3]
اٹھا کر رنج مطلب دل کا پاوے
نہیں جو اور در ہیں ان میں تو جا
کبھی تو ہوں گے قسمت سے تری وا

رتن سین کا درِ دولت پر گندھرب سین کے آنا اور برہمنوں کی زبانی حرف خواستاری پدماوت کا گندھرب سین کو پہنچانا

جب آتا عشق ہے ہم دم کہاں پھر شوکت شاہی
کہ شاہوں کو بھی ظالم جیوں گدا در در پھراتا ہے

۱۔ نسخہ لکھنؤ : یہ جوں غواص کر ضبطِ نفس تو
کہ ہوتا دست رس غوطہ کا تجھ کو

۲۔ نسخہ لکھنؤ : جو در ۔

۳۔ نسخہ نول کشور : شعر ندارد ۔

الا اے ساقیِ یارِ غریباں
رفیق و مونسِ آفت نصیباں
سوالِ دخترِ رز ہے تجھ سے میرا
اگر دیوے تو ہے احسان تیرا
رکھے گا اس سے مجھ کو گر تو محروم
تو پھر اٹھنا مرا یاں سے ہے معلوم
ترے حق میں ہوئے گی یہ زبونی
رتن کی سی لگا دوں گا میں دھونی
سجھا کے اس کو جو مقصود کی راہ
گیا تھا وہ[1] سدا شیو مردِ آگاہ
ادھر لے جوگیوں کا ساتھ لشکر
حصارِ شہر کے آیا وہ در پر
درِ دولت جو گندھرب سین کا تھا
اسے سو چار سو سے آ کے گھیرا
غرض یہ بات جی میں جو سمائی
درِ دولت پہ آ دھونی لگائی
کرے وہ جنگ تو پھر جنگ کیجے[2]
بہر صورت پدم کو اس سے لیجے
سحر گاہاں وہاں کا تھا یہ معمول
پرستاریں تھیں جاتی لینے کو پھول
نکل کے شہر سے گلشن میں جا کے
گل اپنی جھولیوں میں واں سے لا کے

۱- نسخۂ لکھنؤ : گیا گھر کو سدا ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : کریں جو جنگ اس سے خوب کیجے ۔

اسے ہم وزن تھیں گل سے[1] بناتیں
خوشی سے پھر نہ تھیں پھولوں[2] سماتیں
چلا گھر سے سحر خیل پرستار
سو دیکھا جوگیوں سے در کو گلزار
نہ دروازے کو کھولا اور ہٹ کے
گئیں سب الغرض واں سے آلٹ کے[3]
کہا راجہ سے لوگوں نے یہ جا کے
کہ جوگی گرد ہیں دولت سرا کے
مسلح جنگ کا ہر اک گدا ہے
نہیں معلوم مطلب ان کا کیا ہے
کہا راجہ نے پوچھو تو انہیں جا
کہ مقصد مجھ سے ہیگا آپ کا کیا
اگر ہو خرچ رہ کا تم کو درکار
جواہر دوں تمھیں میں اور دینار
کہو پوشش تمھیں سب کو بنادوں
بنا کے کہربائی بھی رنگا دوں
اگر تم راہ چلنے سے ہو عادی
تو بارے دوں تمھیں منگوا[4] سواری
کیا چاہو اگر تم استقامت
تو بنوا دوں ابھی باغ و عمارت

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہم وزن گلشن تھیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : نہیں پھولی خوشی سے تھیں -
۳- نسخۂ لکھنؤ : گویا پلٹ کے -
۴- نسخۂ لکھنؤ : سب کو -

رتن بولا الھوں سے انے فلانی
کہو راجہ سے یہ میری زبانی
نہ پوشش کی ہمیں خواہش نہ زر کی
نہ دل میں کچھ ہوس لعل و گہر کی
مکاں سے قید اپنے دل کو کم ہے
کہ مثل وحشیاں جوگی کو رم ہے
نہیں مطلب کسی اشیا سے ہم کو
مگر خواہش ہے یہ لیویں پدم کو
یہی ہے بھیکھ اپنی اور خیرات
سوا اس بات کے دل میں نہیں بات
ترے در پر ہم اپنی جان دیں گے
غرض ہم تجھ سے پدماوت کو لیں گے
یہ سن کر بندگان بادشاہی
لگے کہنے کہ بس اے مرد واہی
یہ کیا گفتار ہے اپنی زباں تھام
ترا منہ جو پدم کا لیوے تو نام
قدم جس جا نکہ کا باز پس ہو
وہاں پھر کیونکہ تیری دست رس ہو
خیال و وہم بھی جاتا نہیں واں
تجھے کیا حرف نسبت اس سے ناداں
اگر ہے زیست اپنی[1] تجھ کو درکار
نہ لیجو نام لب پر پھر یہ زنہار

۱- نسخہ نول کشور : گر ہیگی زیست اپنی -

عبث رکھے ہے اپنی موت پر دل
کہ بس ہے یہ خیالِ خام مشکل
یہ راجہ ہے وہ عزت دار نامی
ہیں رایانِ جہاں اس کے سلامی
رکھیں کیا وصف اس کے ہم زباں پر
ہے فرق عزت[1] اس کا فرقداں پر
سنے یہ گفتگوے نا سزاوار
تو کھینچے تم سبھوں کو بر سرِ دار
یہ ڈر ہے تم بھی اور چیلے تمھارے
نہ اڑ جاویں کہیں گولوں کے مارے[2]
کہو یہ حرف مت اپنی زباں سے
صلاحِ وقت یہ ہے جاؤ یاں سے
چلو ، جانے دو ، آؤ لے سدھارو
گروجی خیر سے یاں دم نہ مارو
غرض یہ سن کے بولا عاشقِ زار
کہ اٹھنا ہے یاں سے سخت دشوار
قدم اپنا نہیں یاں سے اٹھاتے
یہ سر جاوے پہ کوئی ہم ہیں جاتے
دکھاتے ہو ہمیں کیا تیغ و خنجر
نہیں آتا ہمیں اس سے ذرا ڈر
ہوا ہوں جب سے میں عاشق پدم کا
ہوں تب سے بارکش رنج و الم کا

۱- نسخۂ لکھنؤ : غیرت -
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -

غمِ ہجراں سے بس آیا ہوں میں تنگ
نہیں مرگ اور مصیبت سے مجھے ننگ
نہیں ہے زندگی کا پاس کچھ یاں
کہ ہوں اسباب سے کچھ ہم ہراساں
لڑو گے تو لڑیں گے اور لیں گے
نہ لیں گے گرچہ اپنا جی تو[1] دیں گے
اُدھر تیغ و تبر، تیرِ جفا ہے
تو یاں بھی کم نہیں تیرِ دعا ہے
یہ سن باتیں ملائم ان کی اور سخت
کہ تھے وہ مستعد مرنے پہ اک لخت
بہ آئینِ ادب راجہ سے اک بار
کیا احوال سارا جا کے اظہار
سنی یہ گفتگو راجہ نے جس دم
ہوا قہر و غضب سے کیا وہ برہم
لگا کہنے کہ ہے مقدور ان کا
کریں یہ بے ادب جو ذکر ایسا
عجب صورت سے مانگیں ہیں یہ خیرات
مثل ہے یہ کہ چھوٹا منہ بڑی بات
بھلا آوے نہ کیونکر اس پہ حیرت
گدا و شہ میں کچھ ہے حرف نسبت
غضب ہو کر بہت سا غصہ فرما
لگا کہنے کہ ان کو باندھ لو جا

۱۔ نسخہ لکھنؤ: اپنی جان۔

یہ جتنے جوگیانِ بے ادب ہیں
سو میرے یہ تنِ دامِ غضب ہیں
لڑو ان سے شتابی جا کے مارو
انھوں کا بارِ تن سر سے اُتارو
لگے کرنے امیرِ بادشاہی
فقیروں کی غرض یوں خیرخواہی
کہ اے فرماں روائے ملک منگل
گدا کم یہ نہیں ہیں بلکہ دنگل
ارادہ آپ کا گر جنگ پر ہے
مصمم قتل کے آہنگ پر ہے
وہ عقدے ہیں جو باہم خیر و شر کے
سو ہاتھوں میں نہیں مطلق بشر کے
اگرچہ تم ہوئے بھی ان پہ منصور
تو بس ہووے گا عالم میں یہ مشہور
کہ آئے تھے یہاں جوگی بچارے
گئے ناحق یہاں بے جرم مارے
کہو ہم کو تو ہم کرتے ہیں یہ کام
ولے اس میں نہ ہوگا آپ کا نام
نصیبِ دشمناں نوعِ دگر ہو
تو یہ مشہور ہر جا بیشتر ہو
نہ لا کے تاب اور ہو کے ہراساں
سپاہ سور سے بھاگا سلطاں
حقیقت کوئی سمجھے گا نہ واہی
یہ شہرہ ہوگا مدت تا بہ ماہی

یہ آیا فکر نقص میں تمھاری
اب آگے جو کہ مرضی ہو تمھاری
مگر[1] اے تاجور یہ کام کیجے
کہ ان کو شہر میں آنے نہ دیجے
یہ تنگ آ آب و خور سے اے مہاراج
چلے جاویں گے ہو کر آپ محتاج
وزیرِ عمدگاں کی سن کے تقریر
ہوئی بس دل نشیں رائے کہ جیوں تیر
یہ سن کر شہ گدا کے خوں سے گزرا
قتالِ[2] لشکرِ مجنوں سے گزرا
کمر کو کھول کر بیٹھے وہ خرسند
رہے در مثلِ دستِ ممسکاں بند

طرف پدماوت کے فراق نامہ بھیجنا رتن سین کا اور زبانی قاصد کی بھی پدماوت کو ظاہر ہونا کچھ حال اس بے چین کا

غبارِ غصہ دھونا دامنِ خاطر سے جاناں کے
جو تو اے اشک ہمرہ نامہ بر کے آج جاتا ہے

پلا ساقی شرابِ ناب گلرنگ
کہ اس بن ہوں میں جیوں مینائے دل تنگ
ہوں جس کے نشہ سے میں مست و سرشار
کہوں احوالِ خطِ عاشقِ زار
بگوشِ دل سن اے دانا خردمند
رہے در شہر کے جس وقت سب بند

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ مگر -
۲- نسخۂ لکھنؤ : قیام -

جواب ان جوگیوں نے کچھ نہ پایا
وہ درباں یاں سے جا کے پھر نہ آیا

نہ ان کو جب ہوا کچھ حال معلوم
وجودِ حاجباں[۳] تھا بسکہ معدوم

تو فرمایا رتن نے جوگیوں سے
کہ یارو اب صلاحِ وقت کیا ہے

کہا سب نے کہ جو مرضی تمھاری
صلاحِ کار بس ہے وہ ہماری

غرض یوں کرکے یاروں سے وہ تدبیر
کیا یہ نامۂ جاں سوز تحریر

رگِ مژگاں سے پہلے اک قلم کی
سواد چشم سے حالت رقم کی

مطلا کاغذِ نامہ نہ تھا واں
کیا بس خونِ دیدہ سے وہ افشاں

رکھی بین السطور اس کی پر از نور
کہوں کیا جوں بیاضِ دیدۂ حور

گلِ باغِ حیا و سرو قامت
بہ گلزار جہاں رہیو سلامت

پس از آدابِ شوق و لکھ تمنا
کیا یہ نامۂ جاں سوز انشا

کہ اے آرام دل اور مونسِ جاں
بہارِ باغِ عشاقِ پریشاں

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : صاحباں ۔

چراغ افروزِ بزمِ عاشقِ زار
سحر میری ہے تجھ بن اک شبِ تار[1]
وہاں اے گل تو محو گشت گلزار
یہاں میں مثلِ بلبل با دلِ زار
وہاں سرخوش تو اے شمشاد قامت
یہاں برپا مجھے تجھ بن قیامت
وہاں خوش خواب تو اے رشکِ مہتاب
یہاں میں شام سے تا صبح بے خواب
وہاں تو رونقِ کاشانۂ شمع
میں یاں بیتاب جوں پروانۂ شمع
بہ دل جمعی تو واں اے راحت جاں
میں یاں جیوں زلف پرپیچ و پریشاں
تو مصروفِ طرب مہرِ دل افروز
مجھے جیوں ماہ تجھ بن[2] داغ جاں سوز
یہ غفلت تا کجا کبھو خود آرا
ادھر بھی اک نگہ[3] اے بت خدا را
کسی صورت مجھے صورت دکھا دے
مریضِ غم کو اپنے اک شفا دے

۱- اس جگہ سے نسخۂ لکھنؤ میں اشعار کی ترتیب غلط ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۳۱ اور ۳۲ دو مرتبہ چھپ گئے ہیں۔ پہلے صفحہ ۳۱ پر کسی دوسرے عنوان کے اشعار ہیں اور دوسرے صفحہ ۳۱ سے قصے کا باقاعدہ تسلسل قائم ہوتا ہے۔

۲- نسخۂ لکھنؤ : تجھ سے۔

۳- نسخۂ لکھنؤ : اک نظر۔

تپِ ہجراں کا تیرے ہوں میں بیمار
دوا ہے میری عنابِ لبِ یار
مریضِ رنجِ ہجراں کو ترے یار
ہے معجون کنار و بوس درکار
کبھی بسمل پہ تو بہرِ تماشا
خدا کے واسطے تشریف فرما
عجب کیا آئے تو آرام جاں یاں
ہے واجب مور پر لطفِ سلیماں
سرِ بالیں پہ میرے اے ہمدم تو
مسیحائی کو لا اپنے قدم تو
کہوں کیا میں کہ اے مہر درخشاں
سحر ہے بے ترے شامِ غریباں
تو آ، پُرنور میری انجمن کر
شبِ غربت کے تئیں صبحِ[1] وطن کر
غرض تجھ بن الم سے نت اے گلرنگ
برنگِ غنچہ رہتا ہوں میں دل تنگ
پریشاں بسکہ اے رشکِ چمن ہوں
بسانِ گل دریدہ پیرہن ہوں
ترے غم نے مجھے جوگی بنایا
کہ ہوں میں چھوڑ اپنا راج آیا
ترا اے رشک لیلیٰ ہو کے مفتوں
پھرا صحرا بصحرا مثلِ مجنوں

۱- نسخۂ لکھنؤ : میری ۔

قدم سے موئے سر گزرے اب اے یار
سنان خار پا سر سے نمودار
خیال زلف[1] درپیش نظر ہے
یہی دھیان اب مجھے شام سحر ہے
دکھا کر شکل تو جب سے گئی ہے
کہوں کیا تب سے اک[1] آفت نئی ہے
خیال وصل ہے تیرا گل اندام
رکھے ہے مجھ کو زندہ کام ناکام
جو صندل تو نے چھڑکا مجھ اوپر ہے
سو اس سے اور بھی اک درد سر ہے
رکھے چھاتی پہ لاکھوں غم کے پتھر
ترے در تک تو آ پہنچا ہوں مر مر
یہ درباں بے مروت طبع[3] ناساز
نہیں کرتے ہیں لیکن در کے تئیں باز
پری وش نے پر پرواز پایا
قدم تک تیرے تو میں سر سے آیا
کروں کیا میں کہ بس ہوں سخت ناچار
در و دیوار سے رہتا ہوں سر مار
یہ لکھ کر چشم سے کر خوں فشانی[4]
کیا نامے کو اپنے ارغوانی

۱- نسخۂ نول کشور : زلف تو -
۲- نسخۂ لکھنؤ : پر -
۳- نسخۂ لکھنؤ : تصرف طبع -
۴- نسخۂ لکھنؤ : جانفشانی -

جو نامے پر وہ تھے الفاظ اس کے
سیاہی سے نہیں اس نے لکھے تھے
لکھے تھے وہ بھی خونِ دل سے اے یار
ز بس رنگیں بطرزِ خطِ گلزار[1]
یہ آتش بس عبارت میں تھی اس کی
زبانِ خامہ تک بھی جل گئی تھی
برنگِ گولہ تھے سب حرف یکساں
کہ معنی ان میں تھے آتش سے پنہاں
لکھے جاتے نہ وہ کاغذ کے اوپر
نہ ملتا گر اسے بالِ سمندر
غرض لے ہاتھ میں وہ خامۂ عشق
رقم جب کر چکا وہ نامۂ عشق
کہا اس طوطیٔ دستاں سرا سے
کہ پر جس کے تھے خوش بالِ ہما سے
کہ اے پیکِ پری پرواز عاشق
سراسر چارہ و ہمرازِ[2] عاشق
کسی صورت یہ نامہ اس کو پہنچا
کہے جو کچھ جواب اس کا ابھی لا
غرض طوطے نے جب[3] نامہ اٹھا کے
بہت سا چوم آنکھوں سے لگا کے

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -
۲- نسخۂ لکھنؤ : محرم راز -
۳- نسخۂ لکھنؤ : جھپ -

کہا اس میں لگا کے تار کندن
بنا دو جلد میرا طوق گردن
ز بس تھا خوں فشاں وہ نامہ اے یار
کہ جیسے سرخ ہو طوطی کی منقار
غرض جس وقت گرمی اس کی پہنچی
گئی جل بس اسی دم گردن اس کی
بجائے تار کندن تار دیگر
کسی کوچے میں گر جاتا ہے جل کر[1]
دیا نامہ کہا کچھ کچھ زبانی
کہ اے سرسبز رشک بوستانی
زبانی بھی اسے کہیو کہ اے یار
ہے تجھ بن زیست مجھ کو سخت دشوار
اڑا نامے کو طوطا لے کے فی الحال
ہوئی عاشق کی پیک اشک دلبال
مکدّر دل مبادا اس کا ہووے
تو اس کو جا کے میل اشک دھووے
کہ اس میں وہ پری پرواز طائر
پدم کے پاس پہنچا نامہ لے کر
عجب صورت سے جا کے اس کو دیکھا
تعجب جس سے اس طوطے کو آیا

۱- نسخۂ لکھنؤ : بجائے تار دیگر تار کندن
کسی کوچے میں گر جاتا ہے جل اهن

کہ موئے سر معنبر رشکِ سنبل
پریشاں ہو رہے ہیں رخ پہ بالکل[1]
جو مکھڑا غیرتِ مہر و قمر ہے
سو اس کا رنگ مہتابِ سحر ہے
ہے یاں تک غیرتِ غم کی یہ تاثیر
کہ چشم اس کی ہے شکل چشم تصویر
غرض اس پر جو اک بارِ الم ہے
بسانِ سرو قامت اب وہ خم ہے
غمِ تازہ اسے جیسے ہے افزوں
ہوئی وہ رشکِ لیلی شکل مجنوں
برنگِ گل تھا اس کا سرخ جوبن
سو ہے جیسے خزاں دیدہ ہو گلشن
رہی تھی یا کئی پھولوں میں جو تُل
ہوئی لاغر سو اب مثلِ رگِ گل
غرض اس شکل سے جیوں[2] غم کی تصویر
عجب حیرت سے بیٹھی تھی وہ دل گیر
نظر اس میں پڑا وہ قاصدِ یار
مسیحا دم شفائے جانِ بیمار
ہوئی بے خود جو پھر کچھ ہوش آیا
تو اس محرم کو چھاتی سے[3] لگایا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : سراسر یوں پریشاں ہیں کہ بالکل ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : پھر چھاتی ۔

پیار اس کو بہت سا کر کے وہ ماہ
لگی کہنے اسے پھر[1] بھر کے یوں آہ
سنا اے بے وفا اس کا کچھ احوال
بنایا جس کے غم نے یہ مرا حال
بیاں کر مجھ سے ، اس کا حال کیا ہے
مرا تو حال سب پر برملا ہے
کہ بس اس کے تصور سے ہے جینا
نہ خوش آتا ہے کھانا اور نہ پینا
غم الفت میں اس کے میں شب و روز
ہوں مہر و مہ سے باداغِ دل افروز[2]
کہوں کیا تجھ سے اپنی بے قراری
کہ ہر شب میں ہوں اور اختر شماری
جو سوتی ہوں کبھی میں فرش گل پر
تو چبھتے ہیں رگِ گل مثلِ نشتر
برنگِ شام تیرہ بخت تر ہوں
گریباں چاک مانندِ سحر ہوں
انیسِ وقت اپنا تو ہے غم یاں
جلیسِ بزم اُس کا کون ہے واں
مجھے شام و سحر اُس کا الم ہے
اسے کیا شغل یاروں سے بہم ہے
نہیں اُس بن مجھے یاں چین و آرام
وہاں درپیش ہے کہہ اس کو کیا کام

۱- نسخۂ لکھنؤ : پھر اُس سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہوئی مہر و ماہ سے با داغ دل سوز -

سنی جب اس سے طوطے نے یہ گفتار
ظریفانہ تو کھولی اپنی منقار
اگرچہ کہنا تو ترکِ ادب ہے
غمِ عاشق ولے صاحب کو کب ہے
یہ فرماتی ہو تم جو مہربانی
سو ہے اب بندہ پرورا سب زبانی
تمہیں کچھ غم بھی گر عاشق کا ہوتا
تو کاہے بھی نہ لیتیں تم خبر کیا
غرض بیٹھی ہو اپنے گھر میں خوشحال
اور اس کا یاں تلک پہنچا ہے احوال
کہ جب سے تم کو دیکھا اک نظر ہے
ہر اک دم اس کے تئیں نوعِ دگر ہے
زمیں پر ہیں یہ دریا جتنے جاری
سو ہے اس کا یہ فیضِ اشک باری
بسنتی دیکھ پیراہن وہ تیرا
ہے رشکِ زعفراں رنگِ تن اس کا
یہ اشک سرخ اس کا واں رواں ہے
کہ جس سے رنگ خوں سارا جہاں ہے
سحر خورشید نکلے ہے جو گل گوں
اسی کا واں تلک پہنچا ہے یہ خوں

۱- نسخۂ لکھنؤ : اے بندہ پرور -

شفق سے یہ فلک پر ہے جو سرخی[1]
ہے سرخی وہ[2] اسی کے میل خوں کی
غرض ایسی نہیں باقی کوئی جا
نہ پہنچا واں ہو سیلِ خون اس کا
جبیں پر بھی ترے ٹیکا جو سیندور
بلا شک ہے یہ اشکِ سرخ رنجور
بیان کیجے کہاں تک اس کا احوال
کہ اک دن وہ غم ہجراں کا پامال
پرستش گہہ میں جا کر دیوتا کی
ہوا رنج و غم ہجراں کا شاکی
بصد امید و جانِ ناشکیبا[3]
بیاں کرنے لگا دل کی تمنا
صدا آئی اسے کاے مردِ ناداں
ہوئے ہم بھی اسی کو دیکھ بے جاں
ہوا مایوس پھر وہ آرزومند
امید وصل سے تھا جو کہ پابند[4]
یہ کہہ کر اور پھر اک آہِ جاں سوز
کہ جلیے تاب کے غم سے شب و روز
اسی جا ڈھیر لکڑی کا بنا کے
ہوا بس مستعد آتش لگا کے

۱- نسخۂ لکھنؤ : نہیں ہے سرخی -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہے -
۳- نسخۂ مصطفائی : جانان نا شکیبا -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اس کہ خورسند -

سدا شیو گر خبر اس کی نہ لیتا
تو جل جل کے وہ اپنی جان دیتا
تسلی کرکے سو وہ مردِ آگاہ
گیا اس کو سمجھا کے اب وہ کچھ راہ
سو اس کی رائے پر وہ رائے چتور
غرض اب مستعد بیٹھا ہے ہر طور
حصار شہر تیرا ہے جو اے ماہ
مع فوجِ گدایاں واں ہے وہ شاہ
تمھارے باپ کی جو کچھ سپہ ہے
ہر اک در سے سو اس کی سدرہ ہے
اب آگے جو کہو سو وہ بجا لائے
بہر صورت یہاں آوے کہ مر جائے

جوابِ نامہ پدماوت کی طرف سے رتن سین پاس آنا اور رتن سین کا عین رات کو چشمے میں مع جوگیوں کے کودنا اور متہمِ دزدی ہو جانا

کروں میں گوہر اشک اور لعلِ لختِ دل عشرت
نثارِ قاصدِ جاناں کہ نامہ لے کے آتا ہے[1]
پلا ساقی تو اب جلدی سے اک جام[2]
کہ آیا یار کا مدت میں پیغام

۱۔ نسخہ لکھنؤ : دکھائی عشق کے جذبے نے کیا تاثیر اُس جا پر
کہ نامہ لکھ کے معشوق اپنے عاشق کو بلاتا ہے
۲۔ نسخہ لکھنؤ : پلا ساقی تو اک عشرت کا اب جام۔

گھر اپنے یار مجھ کو ہے بلاتا
بلا دیے ہے کہ میں جلدی ہوں جاتا

سراپا فیض اپنی[1] جو قلم ہے
سو وہ اس طرح مصروفِ رقم ہے

کہ سن اس طوطیِ تنگِ شکر ہے
پڑھا وہ نامۂ مشتاق لے کے

پڑھی اس نے حقیقت جیب کہ ساری
کیا خونِ جگر آنکھوں سے جاری

قلم لے ہاتھ میں وہ رشکِ تصویر
جواب اس کا لگی کرنے وہ تحریر

شہِ فرماں روائے کشورِ عشق
رتن یعنی کہ زیبِ افسرِ عشق

ترا تاج و نگینِ عشق دائم
بفرقِ خاتمِ دل رہیو قائم!

پس از آدائے شوقِ صد ملاقات
یہ ظاہر ہو برائے الفت آیات[2]

کہ اے گلدستۂ باغِ محبت
برنگِ لالہ با داغِ محبت

اسیرِ الفتِ گل مثلِ بلبل
بدل خارِ وصالِ حسرتِ گل

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : سر اپنا فیض اپنا ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔ پہلے مصرعے میں 'ادا' کی بجائے 'آدا' شاید ضرورت شعری کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔

وہ تیرا نامہ اے سروِ خراماں
ہر اک جملہ تھا جس کا جیوں گلستاں
لکھا تھا بسکہ از خطِ بہاری
سو آیا وہ بعینِ انتظاری
معنبر تھی جو اس کی روشنائی
تھی شاید مشک عنبر سے[1] بسائی
نہاں ہر حرف میں تھے وہ معانی
کہ جوں ظلمت میں آبِ زندگانی
ز بس وحشت فزا معنی رقم تھے
مگر مژگانِ آہو کے رقم[2] تھے
یہ رسمِ خط در آوردہ پُر از نور (؟)
مسلسل جس طرح سے کاکلِ حور
یہ تھی[3] بین السطور اس کی نمایاں
کہ نور روز و شب ست گریباں (؟)
یہ رنگیں کاغذِ نامہ تھا بالکل
کہ شرمندہ ہو جس سے دفترِ گل[4]
ہویدا حرف اس کا سو کہوں کیا
بصد خوبی کلیدِ قفلِ دل تھا[5]

۱- نسخۂ لکھنؤ : میں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کے قلم تھے -
۳- نسخۂ لکھنؤ : تھی یوں -
۴- نسخۂ لکھنؤ : چشمِ بلبل -
۵- نسخۂ لکھنؤ : ہوا ہر حرف اس کا میں کہوں کیا
بصد خوبی کلیدِ قفلِ دل وا
یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم مؤخر ہیں -

کیا تھا جو رقم تو نے سو اے گل
ہؤا جیوں سرمہ زیبِ چشمِ بلبل
جو حالت ہے تری ای مہرِ تاباں
کہوں کیامیں ہوں اس سے یاں دوچنداں
گدازِ غم سے تیرے ہوں میں گلتی
ہے جیسے شمع ساری رات جلتی[1]
نہیں مقدور لیکن اس میں میرا
کہ دیکھوں آ کے میں دیدار تیرا
تو ہے اس جا پہ جیسے بلبل زار
یہاں میں مثلِ گل پہلو پُر از خار
سراپا غم سے ہوں میں شکلِ تصویر
حیائے خلق پاؤں میں ہے زنجیر
نگہ بھی تجھ تلک پہنچے سو کیا آہ
کہ ہیں مژگاں سے لا کھوں خار در راہ
کھچی ہے ناتوانی بس یہاں تک
کہ نالہ آ نہیں سکتا زباں تک
نہیں غیر از سبب اس جا گزارا
کہ ہے دن وہ پرستش کا ہمارا
کرے تیری ہی قسمت جب کہ تاخیر
تو پھر میری بھلا کیا اس میں تقصیر
کہ میں آئی وہاں پر اے پری وش
سو تو بس دیکھتے ہی ہوگیا غش[2]

۱- نسخۂ لکھنؤ : قوافی مقدم مؤخر ہیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : یہ شعر اس مقام سے دو شعر پہلے درج ہے -

بہانے سے میں صندل بھی لگایا
پہ تجھ کو ہوش ذرہ بھی نہ آیا[1]
جو تو اے کاش اس دم ہوتا ہشیار
گلے کا اپنے میں دیتی تجھے ہار
خبر فوراً یہ راجہ جی کو جاتی
بہر صورت مراد دل بر آتی
گزرتی گرچہ اس پر ناگوارا
دیے بن پھر نہ ہوتا اور چارا
نہ غفلت میں ہوا مطلب کسی کا
مثل مشہور ہے ''سویا سو چوکا''
لحاظ و شرم سے صد حیف ہیہات
اور اب میں کہہ نہیں سکتی ہوں کچھ بات
چنار آسا میں مل مل دستِ افسوس
سدا جلتی ہوں مثلِ شمعِ فانوس
اگر منظور ہے تجھ کو بھی یہ کام
تو اک جا تا بہ کے یہ چین و آرام
جو[2] غوطہ بحرِ غم میں تو لگاوے
تو ممکن ہے دُرِ مقصود پاوے
مری وہ منزلِ حصنِ حصین ہے
زمیں پر دوسرا عرش بریں ہے
کسی صورت جو اس پر چڑھ کے آوے
تو البتہ تو میرا وصل پاوے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: ولے پھر بھی نہ تجھ کو ہوش آیا۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ: نہ غوطہ — نہیں ممکن درِ مقصود۔

سراسر لکھ چکی جب حالتِ زار
تو کر ملفوف پھینکا غم کا طومار
زمیں پر سے اٹھا وہ نامۂ راز
کی اس طائر نے اس جاگہ سے پرواز
جہاں وہ منتظر بیٹھا تھا مضطر
دیا سو لا اسے مکتوبِ دل‌بر[1]
زبانی بھی جو کہنا تھا کہا سب
کیا احوال اس کا وہ ادا سب
جو وصلِ گل کا مژدہ اس نے پایا
نہ پیراہن میں پھر پھولا سمایا
سرِ شب چھوڑ کر اپنا وہ بستر
غرض آ پہنچا وہ چشمے کے اوپر
کہ شب بس پردہ دارِ عاشقاں ہے
اسی میں روزِ مطلب کا نہاں ہے
جو کودا اس میں جیوں غواص وہ ماہ
گرے چندے مصاحب اس کے ہمراہ
نہ پانی سے انھیں کچھ رنج پہنچا
مگر وہ چشمہ جادو سے بنا تھا
کہ نادانستہ کوئی اس پہ آوے
تو ڈر سے اس کے اس کا ہوش جاوے
رکھی تھیں بسکہ اس کی ہفت منزل
ہو ناواقف کو چڑھنا اس پہ مشکل

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: دیا سو نامۂ مشتاق لا کر۔

وہ ساتوں منزلیں جیوں ہفت افلاک
نہ پہنچے آدمی کی آڑ کے واں خاک
بصد محنت جو کوئی چڑھ کے جاوے
تو پھر اس شہر کی کرسی کو پاوے
سو یہ جوگی چڑھے اس پر شتابی
بسانِ دزد صرف اضطرابی
ز بس رشتہ وہ اس کا جاں گسل تھا
درازی میں گویا طولِ امل تھا
نہ پہنچے منزلِ مقصد پہ ناکام
گرا بس اس میں ان کا طشت از بام
کیا ناگاہ شب نے واں کنارہ
ہوئی صبحِ قیامت آشکارا
غرض سب پاسبانِ شہر اک بار
ہوئے رازِ نہفتہ سے خبردار
کیا آپس میں مل کے سب نے یہ شور
کہ چوری کے لیے آئے ہیں یہ چور
کیا راجہ سے جا کے سب نے اظہار
کہ وہ جوگی جو ہیں سب دزد مکار
نقب دے کر سو وہ چوری کو آئے
کہ اس میں ہم نے جلدی دیکھ پائے
خیال ان کا محل کی سمت کو تھا
کہ ہم نے راہ میں تھا ان کو گھیرا
کہو جیسا ہم ان کے پیش آویں
اسی جا مار ڈالیں یا کہیں لاویں

خبر جس وقت یہ راجہ نے پائی
غضب سے سن کے اس کو تپ چڑھ آئی

برہمن تھے کئی وہ جو مصاحب
تو یہ کہنے لگا ان سے کہ صاحب

کریں جوگی جو دزدی کا ارادہ
سزا ان تیرہ بختوں کی ہے پھر کیا ؟

کہو اس کی جو کچھ ان کو سزا دوں
خیالِ دزدی کا ان کو مزا دوں

انھوں نے دیکھ دیکھ اپنی وہ تقویم
کیا یہ مسئلہ راجہ کو تعلیم[1]

گدا سے ہو جو ایسا کام اظہار
تو پھر اس کی سزا ہیگی سزاوار

سو ان کو لے کے سولی پر چڑھا دو
سوا اس کے انھیں مت کچھ سزا دو

حکم سولی دینے کا واسطے جوگیوں کے صادر ہونا اور رتن سین کا اوپر محرومی دیدار دلدار کے افسوس کرنا اور رونا

کرے گر طشت راز از بام معشوقوں کا عاشق سے
جنابِ عشق سے پھر اس کو حکمِ دار لاتا ہے

میں ہوں ساقی سے دختِ رز کا سائل
سو ہے وہ میری خوں ریزی کا مائل

۱- نسخہ' لکھنؤ : کیا یہ مسئلہ راجہ جی کو تعلیم -

جو مجھ پر فوج غمزے کی تعیں کی
سو میں چوری بھی کچھ ایسی نہیں کی
مگر یاں میں رتن کا ہوں ہوا خواہ
کہ جس کو تہمتِ دزدی لگے آہ
وزیروں سے کہا راجہ نے جاؤ
غرض جتنے ہیں سب کو باندھ لاؤ
بحکمِ راجہ بس دستورِ اعظم
لیے لشکر مسلّح ایک باہم
چلا اودھر کو جیدھر وہ گدا تھے
کہ تا جاتے ہی ان کو باندھ لاوے
مع لشکر ہوئے جب یہ نمودار
کہ اب اس فوج سے جا کیجے پیکار
ادھر تھے ساتھ وہ جتنے رتن کے
بہم کر مصلحت آپس میں بولے
چلی آتی ہے لڑنے کو جو یہ فوج
بسانِ بحرِ جوشاں، موج در موج
وہ اچھا جو یہ ہم کو باندھ لیویں
اذیت جو کہ دینی ہو سو دیویں
سو آگے ہی نہ کیوں پھر جنگ کیجے
بمقدور اپنے ان کو تنگ کیجے
جو کچھ ہونا ہے قسمت میں سو ہوگا
یہ کیجے سامنا تو دشمنوں کا
رتن بولا انہیں، سنتے ہو یارو!
رہِ معشوق ہے یاں دم نہ مارو

نہیں منظور مجھ کو زندگانی
ہے بارِ سر سے تن کو سر گرانی[1]
بہ تنگ آیا ہوں میں بھی زندگی سے
نہ خوش آتا ہے جینا مجھ کو جی سے
رہِ معشوق میں سر دے چکا ہوں
پراسان پھر بھلا مرنے سے کیا ہوں
جو میرے سامنے دیوار و در ہے
پدم کی شکل ہی پیشِ نظر ہے
تصور اس کا بس جاتا نہیں ہے
سوا اس کے نظر آتا نہیں ہے
جو تم کہتے ہو یہ لشکر بہم ہے
سو خلقت بھی مجھے شکلِ پدم ہے
خوشا دم سامنے جو یار آوے
وہ یا تیغِ جفا کو آزماوے
جھکانا سر کو ہی عینِ عبادت
شہادت بلکہ سر تا پا سعادت
پدم ہے وہ، یہ میں راجہ رتن ہوں
وہ میری جان ہے، میں اس کا تن ہوں
زہے قسمت کہ مارا جاؤں میں آج
تو جانوں عشق کی پائی میں معراج
یہ تھی گفتار ان میں بے محابا
کہ اس میں چار سو سے آ کے گھیرا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : کہ سر اب بار تن پر ہے گرانی۔

رہِ معشوق میں کرکے گزارا
انھوں نے مطلقاً سو دم نہ مارا
کتابِ عشق سے تھی ان کی تعلیم
سبق تھا ان رضاجوہوں کا تسلیم
جو آئے وہ مسلح جنگ کو یاں
سو ان کو لے چلے کر زیب زنداں
ہوا یہ ماجرا مشہور ہر جا
کہ تھا جو یاں پہ حلقہ جوگیوں کا
چلے تھے روئے دولت خانہ کے وہ
ملاقی ہوویں تا جانانہ کے وہ
سحر کاہاں عسس نے ان کو پکڑا
غرض دامِ مصیبت میں ہے جکڑا
ز بس تیغِ سیاست سے سراسر
سو مرتے ہیں کوئی دم میں وہ ابتر
ادھر یہ ظاہرا حال رتن سین
ادھر وہ چین عاشق[1] گھر میں بے چین
سنا اس نے جو یہ حالِ پریشاں
برنگِ قطرۂ آنسو بمژگاں
معِ خیلِ فقیراں با دلِ زار
ہوا چاہے ہے اب زیبِ سرِ دار[2]

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : جانِ عاشق۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ بازیبِ سرِ دار۔

گئی یہ بات اس کی جس گھڑی کان
کہوں کیا اُڑ گئے یک بار اوسان
بہم مل مل کے اپنے دستِ افسوس
لگی جلنے برنگِ شمعِ فانوس
اگرچہ تھی ہی دل پر بے قراری
ہوئی اس وقت لیکن زیست بھاری
لبِ بام آ کے جی میں تھی یہ ٹھانی
کہ بس فعلِ عبث ہے زندگانی
بغیر از وصلِ جاناں زیست کس کام
گرادوں آپ کو جیوں طشت از بام
ادھر ٹھانی تھی یہ جی میں پدم نے
شفا بخشِ مریضِ درد و غم نے
اُدھر دربار میں جتنے تھے حضّار
کیا راجہ نے ان کو حکم یک بار
انہیں گن گن کے سولی پر چڑھا دو
مزا خیرات کا ان کو چکھا دو
ہوئے[1] یک جا ہزاروں دار برپا
فلک پر تھا سر تیزی (کذا) جنھوں کا
ہوا اس بات سے عالم خبردار
وہ جوگی یعنی ملکِ غم کے سردار
بحکم رائے گندھرپ سین سو آج
سرِ سولی کے اب ہوتے ہیں سرتاج

۱۔ نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : ہوئیں۔

یہ تھا بس کوچہ و بازار میں شور
یہی لاحق ذات ہو چڑھتے یہ منصور
یہ تنگ آئے تھے یہ بھی زندگی سے
طلب کرتے تھے ملوت اپنی خوشی سے
یقیں تھی صاف ان کے دل میں یہ بات
نہیں ملنے کی وہ دل خواہ خیرات
تو مرئے کیوں نہ[1] اس کی جستجو میں
بھلا ہے جان جاوے آرزو میں
چلے لے کر انھیں جلاد خوں خوار
کہ بس دکھ دیجیے سب کو سر دار
جوں ہی دیکھی رتن نے دار برپا
ہنسا وہ آپ اور سب کو رلایا
وہ ہنستے میں جو اس کے دانت دیکھے
کہ جیسے ناگہاں اک بجلی چمکے
کھڑے تھے وہ جو اس کے گرد سارے
ہوئے بے خود گویا[2] بجلی کے مارے
کوئی رو رو کے اس پر جی جلا کے
یہی کہتا تھا واں آنسو بہا کے
کیا مارا جواں یہ اپنی جان سے
تو گویا حسن جاتا ہے جہاں سے
ہزار افسوس اس کی نوجوانی
یہ آئی کیا بلائے ناگہانی

۱- نسخہ' لکھنؤ : مرے کیونکر نہ۔
۲- نسخہ' لکھنؤ : وہ سب بے خود ہو گئے۔

کوئی بولا کہ اپنی جان دیجے
بن آوے تو رہائی اس کی کیجے
کوئی کہتا نہ جوگی[1] ہے یہ جوگی
یقیں راجہ ہے ہر غم کا بروگی
اٹھائی ہے جو ان نے یہ مصیبت
خدا جانے ہے اس کی کیا حقیقت
کوئی کہتا تھا ہردم کھوج کرکے
یہ بھیس آیا ہے راجہ بھوج کرکے
کوئی بولا یہ شکلِ بھرتری ہے
نہ سمجھو جوگ اس کا سرسری ہے
کوئی بولا کہ گوپی چند ہے یہ
جو قیدِ جوگ کا پابند ہے یہ
کوئی بولا کہاں وہ اور کہاں یہ
مگر ہے عاشقِ بے خانماں یہ
و لیکن ہم کو ہیگا یہ پریکھا
کہ وہ کانوں سنا آنکھوں یہ دیکھا
ہمیں البتہ اے دل اس کا غم ہے
کہ ایسی شکل بھی عالم میں کم ہے
کوئی گر ذات اس کی پوچھتا آہ
یہ کہتا ذات اپنی میں کہوں کیا
ستم کش ، مبتلا ، آوارہ ہوں میں
پریشاں یا دلِ صد پارہ ہوں میں

۱- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : یہ جوگی ۔

غم الفت میں جس کے میں بروگی
پھرا صحرا بصحرا بن کے جوگی
ہوا الفت کا اس کا[1] انتہا آج
کہ ہے اب عشق کی سونی پہ معراج
مجھے بن بوجھے سولی پر چڑھا دو
عذابِ زیست سے یعنی چھڑا دو
نہ ہووے گرچہ بر میں اپنا دل بر
تو پھر ہے زندگی سولی کے اوپر
فلک کو دیکھ وہ شوریدہ احوال
غمِ عشقِ ہدم کا یعنی پامال
کمالِ یاس و مجبوری سے ہر بار
پڑھے تھا حسبِ حال اپنے یہ اشعار
کہ اے چرخِ کہن کج باز صد آہ
قرانِ مشتری دیکھا نہ با ماہ
نہ منہ دیکھا جو اس زہرہ جبیں کا
کہ سر پر سایہ[2] مریخ آیا
پھرا صحرا بصحرا جستجو میں
یہاں آیا میں جس کی آرزو میں
سو اس کی راہ میں سر دے چکا ہوں
بدل صد داغِ حسرت لے چکا ہوں
ہوا سو عشق میرا آج پورا
نہ تھا میں بسکہ الفت میں ادھورا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہوئی اُلفت میں اس کی ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : سرسا ۔

سر و پا[1] بر سرِ راہش فدا شد
کہ ایں بارِ گراں بُد،[2] خوش ادا شد

یہ چڑھنا ہے جو مجھ کو آج بر دار
سو ملکِ عشق کا ہوتا ہوں سردار

ہو میری عاشقوں میں یہ بڑائی
کہ دارِ عشق پر معراج پائی

اگر ہر موئے تن ہووے مجھے دار
ولے پھرنا مجھے ہے ننگ اور عار

یہ سن کر بندگاں بادشاہی
لگا ان میں سے کہنے کوئی واہی

ہو جس کو یاد کرنا یاد کر لے
کہ اس کی یاد سے دل شاد کر لے

جو ہو منظور تجھ کو کر وہ اظہار
کہ بس کھینچتا ہے[2] دم میں ہر سردار

وہ بولا مرگ سے کب مجھ کو غم ہے
مگر جی میرا مشتاق پدم ہے

نہیں اس بن میں مجھے کچھ چین و آرام
مجھے درد زبان ہیگا وہی نام

اسی کی ہوں شراب غم سے مدہوش
سوا اس کے مجھے سب ہے فراموش

۱۔ نسخہ لکھنؤ : باخوش ۔
۲۔ نسخہ مصطفائی : کھینچتے ہو ۔ نسخہ لکھنؤ : موجودہ صورت ۔ پہلے مصرعے میں 'مجھ' کی ضمیر کے پیش نظر 'کھینچتا' زیادہ مناسب ہے ۔

سدا شیو کا لباسِ برہمن میں آ جانا اور گندھرب سین کو
حال رتن سین کا زبانی طوطے کے مفصل سنوانا

پھنسا کر دامِ غم میں عاشقِ بے جاں کو اے 'عشرت'
ذرا دیکھو تو کس کس طرح عشق آپ ہی چھڑاتا ہے

کر اے ساقی یہاں مشکل کشائی
کہ مجھ کو قیدِ غم سے ہو رہائی
پلا وہ مے کہ ہو کے مست سرشار
کہوں حالِ رتن سارا بیاں وار
کہ تھی ان سے یہی گفتار اس کی
سدا شیو نے کہ اس میں آ خبر لی
گروہِ عام میں جس جا رتن تھا
سو پہلے اس نے چھپ کر حال[1] دیکھا
کہ ہے نامِ پدم اس کی زباں پر
نہیں کرتا ہے اس بن ذکر دیگر
ہراسِ مرگ مطلق کچھ نہیں ہے
بظاہر تن یہاں ہے ، دل وہیں ہے
سدا شیو نے سنا یہ کچھ زبانی
کہ جلا دوں کو آیا حکمِ ثانی
بنا کر شکل اس نے برہمن کی
بغل میں اپنے لے کر ایک پوتھی
عیاں دربار میں راجا کے آ کے
سداشیو نے دعا دی دستِ چپ سے
جو بے دستور واں بامھن کو دیکھا
ہوا درباریوں کو اک پریکھا

۱- نسخۂ لکھنؤ : چھپ کے آ کے اس کو ۔

یہ کی لوگوں نے اس کو طعن و نفریں
ہے آدابِ دعا کا کیا یہ آئیں
ہوا رایاں جہاں میں جو مہاراج
اسے دے دستِ چپ سے تو دعا آج
کہا سن کر یہ ان کو برہمن نے
جوابِ تازۂ عمرِ کہن نے
کہ میں نے دست راس اپنے سے یارو
نہیں دی ہے دعا ہرگز کسی کو
میں دائیں ہاتھ سے کیجو یہ بازو
دعا دی ہے تو اس جوگی کو اکثر
مقابل دوسرا ایسا جو دیکھوں
تو البتہ اسیس ایسی اسے دوں
سنی تقریر بامھن کی یہ جس دم
معِ راجہ ہوا حیران اک عالم
کیا پھر ان سے استفسارِ احوال
کہ بارے کر تو ظاہر اس کا کچھ حال
کہا زنّار دارِ باخبر نے
مریضِ درد و غم کے چارہ گر نے
کہ ہے جگ میں یہ ایسا رانۓ نامی
کہ ہیں رایانِ خلق اس کے سلامی
یہ ہے مسند نشین ملکِ چتّور
ہے ثانی اس کا راجوں میں نہیں اور
پدم کے غم کا سو ہو کے بروگی
یہاں آیا ہے بن کے شکلِ جوگی

ہوا یہ خانماں آوارہ ہیہات
یہاں تک آیا با رنج و صعوبات

کہا راجہ نے غصے سے کہ جاہل
بیاں کرتا ہے کیوں یہ کذبِ باطل

نہ تجھ کو اپنے جی کا خوف آیا
کہ حرفِ ناسزا تو نے سنایا

کہاں میں رائے نامی صاحبِ تاج
کہاں جوگی یہ نانِ شب کا محتاج

مجھے کیا حرفِ نسبت اس سے ناداں
زمین و آسماں کا فرق ہے یاں

ہے میری تیغ کی عالم میں بس دھوم
تہِ فرماں ہیں میرے شام اور روم

تجھے گر زیست ہووے اپنی منظور
تو اے ناداں ہو میرے پاس سے دور

ترے سر پر یہ آفت پھر کہیں آئے
کہیں گیہوں میں مل کر[1] گھن نہ پس جائے

کہا اس نے نہیں باور جو تجھ کو
تو وہ طوطا ہے حاضر اس سے پوچھو

حکایاتِ پدم اس کو سنا کے
ہے وہ لایا اسے جوگی بنا کے

۱۔ نسخۂ مصطفائی و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : گر مل کر گیہوں میں گھن نہ پس جائے ۔ موجودہ صورت جو نسخۂ لکھنؤ میں تھی ، زیادہ صحیح اور موزوں معلوم ہوتی ہے ۔

ہوئی سب کی اسی پر رائے محکم
کہ ہاں اچھا اسی سے پوچھیں اب ہم
بلا اس فتنہ انگیزِ جہاں کو
رفیقِ عاشقِ بے خانماں کو
کہا اے راست گو کہہ اس کا احوال
کہ ہے یہ کون درد و غم کا پامال
قسم تجھ کو پدم کے ہے نمک کی
قسم اس کی تجھے خوان چشک کی
جو ہو احوال اس کا کر تو اظہار
دروغ آمیز کیجو کچھ نہ زنہار
کہا سن کر یہ اس فرخندہ لب نے
سراپا سیرِ گلزار طرب نے
کہ اے فرماں روائے ہفت اقلیم
رہے قایم یہ تیرا تاج و دیہیم[1]
جہاں میں روز افزوں تا قیامت
ترا تاج و نگیں رہیو سلامت
حضوری میں پدم کی تھا میں دائم
کمر باندھے ہوئے خدمت میں قایم
کرم اس ملکہٴ فخرِ زماں کا
کہ سب بندوں سے اکثر[2] بیشتر تھا
رہوں تھا رات دن میں اس کے ہمراہ
ہو ہمرہ کہربا کے جیوں پرِ کاہ

۱- نسخہٴ ممتاز المطابع و نسخہٴ نول کشور : تخت و دیہیم -
۲- نسخہٴ لکھنؤ : سبھی بندوں سے مجھ پر -

جدا رکھتی نہ تھی مجھ کو وہ اک دم
زبس فرقت سے میری تھا اسے غم

کہ اک دن ناگہاں وہ سروِ رعنا
ہوئی سمتِ چمن تشریف فرما

وہاں سے بھی غرض وہ غیرتِ باغ
برنگِ لالہ دے گلشن کے تئیں داغ

نہانے کو مع خیلِ پرستار
لبِ دریا گئی وہ دُرِ شہوار

مجھے یاں دیکھ کر تنہا قفس میں
کیا چاہے تھی[۱] گربہ اپنے بس میں

زبس آئی قفس پر وہ ڈپٹ کر
کہ تا لے جائے میرے تئیں جھپٹ کر[۲]

قفس کا در تو اکثر وا رہے تھا
کہ میں چل پھر کے اس میں آ رہے تھا

نہ آئی تھی ابھی اس پر وہ غمّاز
کہ بس میں کر گیا پنجرے سے پرواز

ہوئی اس کی یہ وحشت مجھ کو ہائل[۳]
کہ ناحق ہوگی اک دن جان زائل

اگرچہ دل میں تھی ہیبت سمائی
ولے اک بات دل میں اور آئی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: چہتی تھی۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ: کہ آ لے جاوے۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور: کہ لے جاوے وے تئیں وہ جھپٹ کر۔
۳۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور: مائل (ہائل بمعنی خوفناک۔ دہشت ناک)۔

پدم کی ہے جو یہ حسن و جوانی
سو اس کا ڈھونڈیے ویسا ہی ثانی
خوشی اپنی اسی کے دم تلک ہے
جو مجھ سے ہو تو یہ شرطِ نمک ہے
یہ جی میں ٹھان کر چھوڑ اس مکاں کو
تجسّس میں چلا سیرِ جہاں کو
بہت کی سیر اور عالم کو دیکھا
مقابل اس کا بس میں نے نہ دیکھا
کروں خوبی میں کیا طالع کی اظہار
ہوا صیّاد کا اک دن گرفتار
لیا پھر ایک بامھن نے مجھے مول
دیے صیّاد کو چندے درم کھول
گیا پھر لے کے وہ ہندوستاں[1] کو
نہ ہندوستان بلکہ بوستاں کو
کہوں کیا خوبی اس کشور کی بالکل
ہیں جس کے خار و خس بھی غیرت گل
وہ ہے روئے زمیں پر ملک ایسا
مگر ہووے تو ہو فردوس ویسا

۱- اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ پدم کا شہر جس سے طوطا جدا ہو چکا ہے ، ہندوستان میں نہیں تھا ۔ حالانکہ مصنف اقرار کر چکے ہیں کہ راجہ گندھرب سین (پدماوت کا باپ) ہندوستان کا راجہ تھا اور اس کا پایۂ تخت سرالدیپ تھا :

کہ تھا ہندوستاں میں اک مہاراج

(دیکھیے عنوان : شروعِ داستانِ دلفریب)

جو واں ہے تازگی آب و ہوا کی
بیاں کیا کیجیے قدرتِ خدا کی

ہوائے باغ صحرا سبزہ سیراب
دل و دیدہ کو جس سے راحت خواب

کوئی نقاش گرداں موقلم لے
کسی طائر کی وہ تصویر کھینچے

نہ کھینچنے پائے سر تا پا کہ فی الحال
وہیں تصویر پر لاوے پر و بال

وہاں فیضِ ہوا کا یہ اثر ہے
کہ رشکِ نخلِ طوبیٰ ہر شجر ہے

نواح اس کی کا عالم میں کہوں کیا[1]
برنگِ صفحۂ گلزار صحرا

جہاں تک اس کی وسعت پر نظر جائے
غرض شادابی و سبزی نظر آئے

یہاں تک ہے زبس دل چسپ صحرا
اٹھاوے دل کو کوئی واں سے سو کیا

کہاں تک خوبیاں اور اس کی کہیے
یہی جی چاہے اس صحرا میں رہیے

ہر اک سو سبزہ ، شادابی و وسعت
دل و دیدہ کو جس سے خوب فرحت

اگر ہر موئے تن میرا زباں ہو
نہیں ممکن سرِ مو بھی بیاں ہو

۱- نسخۂ لکھنؤ : نواحِ شہر کا عالم کہوں کیا — یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم مؤخر ہیں ۔

نہ نقشہ واں کا کچھ تحریر میں آئے

نہ واں کا حسن بھی تقریر میں آئے

سوائے شہر ادنیٰ ہیں جو دیہات

وہاں کی بھی[1] نہیں ہو سکتی کچھ بات

وہاں کی بستیاں بھی پیاریاں ہیں[2]

چمن ہے شہر اور وہ کیاریاں ہیں

سو اس کشور میں دیکھا میں نے کر غور

تو ہے اک شہر رنگیں ، نام چتّور

عجب ہی شہر ہے وہ راحت افزا

کہا جاتا نہیں احوال جس کا

کرے کیا کوئی نقشہ اس کا تحریر

کہ ہے اک صفحۂ رنگین تصویر[3]

عجب ہی طرح کا تھا شہر آباد

بسانِ خاطرِ خرّم دلاں شاد

رقم کب اس کی خوبی ہو قلم سے

کہ ہم پہلو ہے وہ باغِ ارم سے

عجائب ، طرفہ تر ، دلکش مکاں سے

و یا[4] دنیا میں اک باغِ جناں ہے

۱- نسخۂ مصطفائی و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : **کچھ** - موجودہ صورت نسخۂ لکھنؤ میں ہے -

۲- نسخۂ مصطفائی و ممتاز المطابع : کہ بس بستی قیامت پیاریاں ہیں - نسخۂ لکھنؤ کی موجودہ صورت زیادہ موزوں ہے -

۳- نسخۂ لکھنؤ : کھنچی ہے صاف وہ جنت کی تصویر -

۴- نسخۂ مصطفائی و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : **گویا** - موجودہ صورت نسخۂ لکھنؤ میں ہے اور نسبتاً زیادہ موزوں ہے -

مصفّا اور رنگین و طرح دار
عجوبہ تحفہ کوچہ اور بازار
شگوفہ قلعہ کا عالم کہوں کیا
بلندی میں گویا عرشِ معلّا
زبس ہے قلعہ کا یہ حسنِ رفعت
کہ ہے روئے زمیں پر قصرِ جنّت
عجب انداز کی ہے اس کی اِفتاد
کہے تو واں کا تھا معمار بہزاد
عمارت یہ بلند اس کی ہے گاگوں
کہ جس کا زینۂ پائیں ہے گردوں
ہر اک رنگیں محل ایسا نمایاں
خجل ہو دیکھ جس کو باغِ رضواں
یہ رنگیں سو بسو چوسر کا بازار
خجل ہو دیکھ جس کو صحنِ گلزار
ہوا اس شہر کی ہے اس قدر سبز
رقم سے جس کے ہووے کلک[1] سرسبز
یہ حسنِ مرد و زن ہے واں نمایاں
گویا آکر بسے ہیں حور و غلماں
کہاں تک اس کی خوبی کی کہوں بات
ہے تحفہ شہر جوں تختِ طلسمات
وہاں کا تاجور با زینت و زین
نہایت دادِ رس راجہ رتن سین

۱- نسخۂ لکھنؤ : چرخ -

اگر ڈھونڈھے فلک مشعل کو لے کر
سخی ایسا نہ پاوے وہ زمیں پر
سخاوت اس کی ہے دل میں زحد بیش
بسا منصف ، نہایت معدلت کیش
یہاں تک ضبط عدل اس کا وہاں ہے
کتاں بھی زیب ِ قد ِ مہ وشاں ہے
یہاں تک زرفشاں ہے اس کا واں راج
سنا گا ہے نہ اس جا نام ِ محتاج
لیا پھر اس نے مجھ کو قصہ کوتاہ
رہا خدمت میں اس کی میں کئی ماہ
آسے چین ایک دن رہتا نہ مجھ بن
ہوئی یہ واردات القصّہ اک دن
محل میں اپنے تنہا چھوڑ مجھ کو
گیا تنہا وہ برائے صید ِ آہو[1]
تھی اس کی مونس جاں ایک رانی
نہ سمجھے تھی کسی کو اپنا ثانی
غرور ِ حسن سے وہ اپنے ناداں
لگی کہنے نہایت ہو کے شاداں
مرقّع ہے جہاں کا جب سے تحریر
کھنچی مجھ سی نہ کوئی اور تصویر
اگرچہ ہیں بہت محبوب صورت
نہیں مجھ سے یہ کوئی خوب صورت

۱- نسخہ لکھنؤ : چمن میں سیر ِ گل کو -

کہا میں نے کہ یہ ہے بات احقر
جہاں میں ایک سے ہے ایک بہتر
میں جس کی بندگی میں تھا مقرر
پرستاریں ہیں اس کی تجھ سے بہتر
خدا نے روپ اس کا یہ بنایا
ہے بہتر تجھ سے اس کے قد کا سایا
سنا ہووے گا تو نے ملک سنگل
سراپا حسن اور خوبی کا دنگل
ز بس قدرت خدا کی ہے ہویدا
کہ ہوتا ہے وہاں سے حسن پیدا
تو کہتی آپ کو جو مہ جبیں ہے
سو ان میں خال خال ایسا کہیں ہے
وہاں کا رائے نامی صاحبِ تاج
جو روم و شام تک لیتا ہے نت باج
ہے گندھرپ سین اس کا نام مشہور
ہیں اس کو جانتے نزدیک اور دور
کہوں کیا اس کا خلق و مہربانی
سخاوت میں ہے وہ حاتم کا ثانی
شجاعت بھی یہ اس کی بس عیاں ہے
کہے رستم کو زالِ ناتواں ہے
ز بس نوشیرواں سا داد رس ہے
غریبوں کا بدل فریاد رس ہے
پدم نامی ہے اس کی ایک دختر
سپہرِ حسن کی تابندہ اختر

پری ہے ، حور ہے ، مہر و قمر ہے
عجب صورت کی کوئی وہ بشر ہے

زبس ہے حسن اس کا یوں نمایاں
کہ جس کو دیکھ ہو تصویر حیراں

سنی رانی نے جو مجھ سے یہ تقریر
ہوئی غرقِ تحیّر شکلِ تصویر

حوالے پھر کیا اپنی ددا کے
کہ اس بے باک کو تو مار جا کے

غرض اس نے نہ مارا اور چھپایا
قضا کے ہاتھ سے مجھ کو بچایا

نہ پایا جب رتن نے مجھ کو گھر میں
ہوا تاریک اک عالم نظر میں

بہت سا جب کہ رانی کو ڈرایا
مجھے پھر اس نے ہر صورت منگایا

کہوں پھر کیا غرورِ حسن رانی
سنا راجہ نے سب[1] میری زبانی

ہوا بے باک سن کر اور بے تاب
کیا موقوف اپنا سب خور و خواب

نصیحت کو جو اس کے پاس آتا[2]
اثر مطلق نہ اس کے دل پہ پاتا

یہاں تک عشق نے اس کو کیا تنگ
کہ اک دن کر حیا و ننگ سے جنگ

۱- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : جب ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : قوف ، آیا — چھپایا ۔

بنا کر شکلِ جوگی ، چھوڑ شاہی
ہوا جیوں گردبادِ دشت راہی

نہ پڑتا تھا زمیں پر جس کا سایا
ہزاروں کوس سو وہ پاؤں[1] آیا

تھا جس کے پاؤں پر رنگِ حنا بار
برہنہ پا وہ تھا اور دشت کے خار

وہ مکھڑا تھا جو اس کا مہرِ تاباں
ہے جیوں آئینہ خاک آلودہ حیراں

تھیں آنکھیں جو برنگِ ترک خوں خوار[2]
ہوگئیں مانندِ نرگس پل میں بیمار

کھنچی تھی اس کو یاں تک ناتوانی
کہ موئے سر سے بھی تھی سرگرانی

رگِ گل جس کفِ پا سے بروں ہے
سو جورِ خار سے وہ غرقِ خوں ہے

طپش سے غم کے ہے ازبسکہ واہی
وہ رنگِ سبز سو ہے سبز کاہی[3]

الٹ کر تخت شاہی ، پھینک کر تاج
ہوا جوگی ندم پر چھوڑ کر راج

کہاں آرام و تسکیں سے اسے کام
کہ جس وحشی کو زلفِ حسن ہو دام

۱- نسخۂ لکھنؤ : کوس تک پیدل وہ ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : تیغ خوں خوار ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

کئی سو ساتھ اس کے راج ہنسی
وہ اس پر جیوں ہوئی وہ اس پہ جوگی

ہر اک تصویر رشکِ مہر و مہ ہے
بہ سِن و حسن ماہِ چاردہ ہے

غرض وہ ان میں شلوِ جوگیاں ہے
جلو میں لشکرِ آہ و فغاں ہے

ہزاروں درد و غم اور داغِ دستہ
جلو میں فوجِ وحشت دست بستہ

غرض یوں لے کے لشکر جوگیوں کا
ترے اس شہر سنگل میں ہے آیا

ہزاروں ساتھ جو اندوہ کیں[1] ہیں
مصاحب اور مشیر و ہمنشیں ہیں

بیانِ واقعی تم کو سنایا
کہ یاں تک ہے وہ اس صورت سے آیا

اب آگے اس کے ہیں گے آپ مختار
جلاؤ یا کہو ڈالے کوئی مار

گندھرپ سین کا رتن سین سے امتحان لینا اور نجومیوں کو مقرر کرکے ساعتِ شادی کا حکم دینا

کرے ہے امتحاں جس وقت خاطر خواہ[2] اے عشرت
تو وصلِ یار کی یہ عشق تقریریں اٹھاتا[3] ہے

۱- نسخہٗ لکھنؤ : اس کے جو ہیں -
۲- نسخہٗ لکھنؤ : یہ بدخواہ -
۳- نسخہٗ لکھنؤ : سناتا - نسخہٗ ممتاز المطابع و نسخہٗ نول کشور : دکھاتا -

پلا ساقی مجھے عشرت کا اک جام
کہ اب تو توسنِ ایّام ہے رام
سناؤں تجھ کو میں بہبود عاشق
کہ ہوتا ہے عیاں مقصودِ عاشق
سنا طوطے سے جب سارا یہ احوال
ہوا ادنیٰ و اعلیٰ شاد و خوش حال
یقیں سب کو ہوا ، ہے صاحبِ تاج
کہ چھوڑ آیا ہے اپنا ملک اور راج
یہ ٹھیرا ہے کہ کیجے امتحاں کچھ
کہ دیکھیں شان شاہی ہے عیاں کچھ
نہایت کج روش تھا ایک گھوڑا
تھا اس نے راستی سے منہ کو موڑا
سوار اس پر جو ہوتا کوئی اک پل
پہنچاتا وہ اس کو منزل اول
اگر راکب کا سایہ دیکھ پاتا
تو لاکھوں ہی لکد اس پر لگاتا
پکڑ کر چھوڑتا اس کو نہ اک پل
عبارت اس سے ہے موذی کا چنگل
لکد زن ، دندگیر و[1] شر فشاں تھا
نہایت بد لجام کج رواں تھا
سو فرمائی اسے اس پر سواری
کہ ہو معلوم قدرِ شہریاری

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : خوب تھا اور ۔

منکا کے اصطبل سے اس کو جب واں
گیا راجہ رتن کو بھی[1] یہ فرماں
ہے اس کا اختر اقبال تاباں
تو البتہ یہ ہوگا زیر فرماں
نہیں اس کا جو تاج و تخت تابوت
تو یہ تخت رواں ہے تخت تابوت
کہ ہے حاضر جو یہ اسپِ[2] قدم باز
دکھا اس کی ہمیں چڑھ کر تگ و تاز
بجا آداب[3] تسلیمات یک سر
رضائے حق کو اپنے ساتھ لے کر
وہ خالی تھا جو اس کا خانۂ زیں
ہوا یہ رونقِ کاشانۂ زیں
عناں لے کر کے فوراً کی جو مہمیز
کہوں پھر کیا میں اس کی جست اور خیز
سبک رو ، جوں صبا گاہے رواں تھا
گہے نظروں سے غائب گہہ عیاں تھا
عناں اس کی جو لی اس نے اچک کر
گیا نظروں میں برق آسا چمک کر
ہوا جب تیز تگ وہ ساختہ رو
کیا شرمندہ پھر حسنِ پری کو

۱- نسخۂ لکھنؤ : پھر - نسخۂ ممتاز المطابع : جب -
۲- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : تخت -
۳- نسخۂ مصطفائی و نسخۂ ممتاز المطابع : بجالا داب - نسخۂ لکھنؤ کی موجودہ صورت زیادہ موزوں ہے -

وہ دوڑا ریختہ پا تو کہوں کیا
گویا گوئے زمیں کو لے گیا تھا
کیا دونوں عناں پر جب کہ کاوا
تو جیوں وہم و گماں تھا بس چھلاوہ
اسی صورت غرض اس کو وہ تادیر
حضور راجہ کے گندھرپ خوب سا پھیر
اتر کر روبرو راجہ کے آیا
کمال کسب سب اپنا دکھایا
ہوا سب کو یقیں یہ صاف دل میں
کہ سرداری ہے اس کے آب و گل میں
ہے اس کو زیب تاج شہریاری
اگرچہ ہے گدایانہ بہ خواری
خوشا روزے و وقتے نیک فرجام
ہمائے دولتہ ایسا آوے در دام
غرض دیکھا جونہی بے داغ وہ ماہ
ہوا راجہ کا مطلب حسب دل خواہ
کہے[1] سے اپنے ہو کے بس پریشاں
بہ دل جمعی ہوا آخر وہ شاداں
غبار خاطر دل سب مٹا کے
ہوا خرم اسے چھاتی لگا کے
اٹھا کر واں سے پھر اس دلربا کو
چلا خوش حال وہ دولت سرا کو

۱- نسخۂ لکھنؤ : گئے -

گئے تھے یا کہ لڑنے کو وہ پرخار
سو ہو کے باغ باغ آئے وہ یک بارہ

گئی تھی فوجِ دشمن جو تمامی
ہوئی سو دوست اس کی اور سلامی

تراله عیش اور شادی کا گاتے
لے آئے سب اسے گاتے بجاتے

عمارت ایک خوش تعمیر اچھی
برائے مسکن و بودن اسے دی

جو ہے دستور شرطِ میزبانی
بجا لایا سو ویسی ہی مہمانی

بلا کر پھر منجم اور برہمن
مقرر کر کے ساعت سعد و احسن

کہا ان کے تئیں اب حسبِ دل خواہ
قرانِ مشتری جیسے ہو با ماہ

سو باہم عقد کر دیں آشکارا
قرینِ ماہ لازم ہے ستارا

برہمن انگلیوں پر کچھ وہ گن گن
معیّن کر کے ساعت نیک اور دن

دعا دے کر رتن کو بادلِ شاد
کہ رہیو تو مرادِ دل سے آباد

کہا پھر رائے گندھرپ سین سے آ
مبارک ہو تمھیں دل کی تمنا

۲۔ نسخۂ لکھنؤ: سو آئے خندہ زن وہ آخر کار۔

دیا راجہ نے ان کو مال اور زر
لباسِ فاخرہ با لعل و گوہر
بلا کر خانِ ساماں کو بہ تکرار
کہا اشیائے شادی سب ہوں تیّار
یہ فرمایا کہ کیجے جلد تدبیر
کہ کارِ خیر میں ہووے نہ تاخیر
کہوں کیا میں کہ دیرِ حکم تھی واں
کہ بس شادی کا تھا موجود ساماں

رتن سین کا باجاہ و تجمل نوشاہ بن کے آنا اور پدماوت کا مضطربانہ کوٹھے پر آ کے سواری دیکھنا اور غش ہو جانا

کرم ہو بادشاہِ عشق کا جس شخص پر ، پل میں
اگر ہووے گدا تو اس کو یہ نوشہ بناتا ہے[1]
پلا دے مجھ کو ساقی جامِ عشرت
بجاؤں دل سے میں شادی کی نوبت
یہ دل ہو جاوے میرا پی کے مسرور
غمِ دیرینہ ہووے جس سے سب دور[2]

۱- نسخۂ لکھنؤ : اُٹھا کر خاک سے گردوں سے نوشہ بناتا ہے
تو چھتر زرفشاں اپنا سر اس کے پر پھراتا ہے
نسخۂ مذکور میں اس شعر کے بعد ایک شعر زائد بھی ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں :
ہوا ہوں ساقیا مشتاق کب سے
تو میرا عقد کر بنت العنب سے
۲- نسخۂ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل شعر زائد ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ہے :
رتن کی ہے یہ شادی کا سرانجام
لگے ہاتھوں اسی میں کر مرا کام

کئی دن پیشتر نوبت رکھا دی
صدائے عیش عالم کو سنا دی
عمارت اور مکاں لاکھوں سجائے
ہر اک جا فرشِ شاہانہ بچھائے
لگا ہونے ہر اک سو راگ اور رنگ
نوازش میں ہر اک جا بربط و چنگ
خزانوں کے دیے در کھول فی الحال
زمانے کو کیا مستغنی الحال
کسی کے دل پہ غیر از لالۂ باغ
جو دیکھا تو نظر آتا نہ تھا داغ
کہوں کیا میں کہ جب وہ روز آیا
رتن کو سب نے پھر دولھا بنایا
پنہایا خلعتِ زیبا و رنگیں
کہ تھا لعل و جواہر سے وہ تزئیں
مرصّع سر پہ رکھا بسکہ وہ تاج
کہ جس میں صرف[1] ہفت اقلیم کا باج
بندھا سہرا جب اس کے موتیوں کا
نہیں تقریر میں آتا کہوں کیا
کہے تھا ایک عالم کر نظارے
کہ بس منہ پر فدا ہوتے ہیں تارے
سراسر اس میں وہ مقیّش کے تار
کرن خورشید کی جیسے نمودار

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ملک ہفت۔

گلے میں ہار موتی کا نمایاں
پڑا سینے میں[1] عکسِ سلکِ دنداں
جواہر بس سراپا زیبِ تن تھا
کہ وہ کل آپ بھی راجہ رتن تھا
ہزاروں اس کے ہم دم تھے جو آئے
انھیں تھے خلعتِ زیبا پنھائے
سواری کو دیے اسپِ قدم باز
کہ خاطر خواہ ہو جن کی تگ و تاز
ہزاروں پالکی ، فیل و عماری
جواہر جن پہ تھے صرف تیاری[2]
ہزاروں رتھ مرصّع اور مطلّا
تھے کلسے جن کے مہر و مہ سے زیبا
مرصّع تھے جو چوکی میں کئی تخت
سبک وزن اور قیمت میں گراں رخت
جب ان میں ایک پر بیٹھا وہ آ کے
چنور جھلنے لگا[3] بالِ ہما کے
چڑھا کوئی شتابی پالکی پر
چلا کوئی چڑھ کے اپنی نالکی پر
کوئی فیلِ سیہ پر جلوہ گر تھا
کہیں تو[4] ابر کے اوپر قمر تھا

۱- نسخۂ لکھنؤ: ہنسے میں۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: تھا صرف نثاری۔
۳- نسخۂ لکھنؤ: ہونے لگے۔
۴- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور: کل لو۔

کسی نے ہے سواری رتھ کی بنالی
کہ ہیکل یہ سواری دیوتا کی
کوئی گھوڑے پہ چڑھ کے غیرتِ ماہ
رکابِ دولتِ نوشہ کے ہمراہ
اسی صورت سے ادنیٰ اور اعلیٰ
کر اپنی وضع اور خوبی دوبالا
پرے باندھے کھڑے ایدھر آدھر یار[1]
چلے کب یعنی سرو کبک رفتار[2]
منجم بولے چلیے اے مہاراج!
کہ ہے سعد یہ قرانِ مشتری آج
چلی بس سنتے ہی اس کی سواری
چمن کو جس طرح بادِ بہاری
گلوں کی ٹٹیاں لاکھوں نمودار
شگفتہ سر بہ شہدوں کے وہ گلزار
وہ آتش بازی کا[3] عالم کہوں کیا
کہے تو شب براتی تھا تماشا
ہر اک گلرو کے ہاتھوں میں تھے ہتھ پھول
کہ جس سے اور گل بلبل گئی بھول
فلک فرسا ہوائی وہ نمودار
برنگِ نالۂ عاشق شرر بار

۱- نسخۂ لکھنؤ: یک طرف کو یار۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: نوشہ سرو رفتار۔
۳- نسخۂ لکھنؤ: وہ آبِ شار۔

بھچنیے اور انار ایسے[۱] شرر خیز
بسانِ آہِ عاشق شور انگیز

گئے روشن فلک تک جو انگارے
رکھا ہے نام تب سب نے ستارے[۲]

ہزاروں آتشیں طاؤس رقصاں
خجل ہو جس سے طاؤسِ گلستاں

نہیں دیکھا کبھی عالم یہ در خواب
جو تھی ہر مہروش کے ہاتھ مہتاب[۳]

وہ عالم چادروں کا تھا نمایاں
ہزاروں رنگ سے پھولا گلستاں[۴]

یہ چھپکوں کا بھی ہرجا[۵] چھچھہ تھا
کہ پریوں کا بھی شور و قہقہہ تھا

وہ آتش بازی کا چھٹنا وہ چکّر[۶]
کہ تھا اک کرۂ آتش مدوّر

چراغوں کی دو رستہ گوشے میں باڑ[۷]
کنول روشن ہزاروں[۸] سیکڑوں ، جھاڑ

۱- نسخۂ لکھنؤ : بہت چھوٹے انار اس جا -
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -
۳- نسخۂ لکھنؤ : کی جان بیتاب -
۴- نسخۂ لکھنؤ : اس شعر کے بعد مندرجہ ذیل شعر زائد ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں :

کروں کیا ہاتھیوں کی جنگ تقریر
سراپا آتشیں ، دیووں کی تصویر

۵- نسخۂ لکھنؤ : نہ چھپکوں کا ہی ہرجا -
۶- نسخۂ لکھنؤ : وہ آب شار مہتابی کا چکر -
۷- نسخۂ لکھنؤ : ٹٹیاں کاڑ -
۸- نسخۂ لکھنؤ : کئی -

مبادا کم ہو مشعل یا کہ روغن
فلک نے اپنی کی[1] مہتاب روشن
ستارے تھے نہ گردوں پر نمایاں
فرشتوں نے کیے روشن چراغاں
برات ایسی چلی آراستہ جب
ہوا گلزار گویا راستہ سب
اسی صورت غرض با شوکت و شان
کہے تو تھا عجب چلتا گلستاں
سراپا حسن کی تصویر بن کے
جو دولھا پہنچا یوں در پر دولھن کے
تماشائی جو اس جا تھا اک عالم
صدا آئی انھوں سے خیر مقدم
لگا بس دیکھنے اپنا پرایا
کہ ہے راجہ رتن دولھا بن آیا
محل میں عیش و عشرت ہر طرف تھی
غمِ حسرت دلوں سے برطرف تھی
ہمدم کی تھیں جو ہمزادانِ محرم
ستارے ماہ کے جوں گرد باہم
کہا سب نے کہ اے سروِ گل اندام
ذرا چل دیکھ بھی تو بر لبِ بام
برات آئی ہے تیری جس طرح سے
نہیں دیکھی کسی نے اس طرح سے

۱۔ نسخہ لکھنؤ : فلک نے بھی کیا ۔

چلو آؤ چلیں دیکھیں تماشا
یہ عالم پھر خیال و خواب ہوگا
گدائی میں جسے دیکھا تھا واہی
سو دیکھو اس کی شانِ بادشاہی
مگر سچ بات ہے یہ[1] یا کہ ہے لاف
کہ ہوتا ہے گہن کے بعد مہ صاف
دولھن بن کی اسے گرچہ حیا تھی
پہ یہ مشتاق، مشتاقِ لقا تھی
تماشے کو چڑھی بس وہ گل اندام
معِ انجم مہ آیا بر لبِ بام
عجب ہی لطف سے وہ ماہ پارا
ز بس غرفے سے کرتی تھی نظارا
لگی کہنے یہ اپنے ہمدموں سے
انیسوں، رازداروں، محرموں سے
کہ وہ مہرِ سپہرِ عزّت و جاہ
محبت اور دیارِ عشق کا شاہ
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے
وہ اس خلقت میں کس جا جلوہ گر ہے
کہا سب نے جو وہ تختِ رواں ہے
سو اس پر وہ شہِ بختِ جواں ہے
بغور آ دیکھ اس کو وہ پری وش
کہوں کیا میں کہ فوراً ہوگئی غش

۱- نسخۂ لکھنؤ: اجی یہ بات سچ ہے۔

تماشائی ، براقی کر فراموش
لگہ کے ساتھ ہی جاتے رہے ہوش

ہوئیں حیراں وہ اس کے ساتھ والیں
کہ جیوں محو تحیّر نقشِ قالیں

کوئی آنسو سے اپنے منہ کے تئیں دھو[1]
لگی کہنے یہ سایہ ہو گیا ہو

کوئی بولی کہ نازک یہ جواں ہے[2]
یہاں تک تاب چڑھنے کی کہاں ہے

کوئی تشخیص کر بولی کہ ہیہات
محیطِ دل ہوئے اس کے بخارات[3]

کوئی بولی عروسِ لو یہی تھی[4]
لگی ہووے نظر شاید کسی کی

کوئی جو دردِ الفت سے تھی آگاہ
کسی سے یوں کہے تھی کھینچ کر آہ

پس از مدت نظر دلدار آوے
تو ممکن ہے نہ عقل و ہوش جاوے؟

۱- نسخۂ لکھنؤ : کوئی اُلفت سے اس کے منہ کو بس دھو -
۲- نسخۂ لکھنؤ : لہی - (دونوں مصرعوں میں) -
۳- نسخۂ لکھنؤ : کوئی با دردو غم بولی کہ ہیہات
کوئی افسوس کر ملنے لگی ہات
۴- نسخۂ لکھنؤ : یہی لہی -

پراساں دل میں تھی یہ اپنے ہر ماہ[1]
مبادا کوئی ہو جاوے نہ آگاہ

خبر مادر ہو اس کی یا پدر ہو
تو بدنامی ہمیں با یک دگر ہو

بہم کرتی تھیں آپس میں یہ تقریر
کہ کیجے جلد ہشیاری کی تدبیر

کسے تھے وہ جو اس کے بندِ پشواز
کسی نے جلد آکر کردیے باز

کسی نے منہ شتابی اس کا دھویا
لگی کرنے کوئی آ ہائے شوہا

لگی سہلانے کوئی دست اور پا
گلاب اس پر کسی نے آ کے چھڑکا[2]

کسی نے باد کش جلدی بلایا
کسی نے لخلخہ اس کو سنگھایا[3]

ز بس ہر اک تھی حیراں گرم تدبیر
ہوئی ہشیار اتنے میں وہ تصویر

۱۔ نسخۂ مصطفائی و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : وہ ماہ ۔
اس سے اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید 'وہ' کا اشارہ پدماوت کی طرف ہے
جس سے شعر بے ربط ہو جاتا ہے ۔ موجودہ صورت میں جو نسخۂ
لکھنؤ میں ہے ، "ہر" پدماوت کی سہیلیوں سے متعلق ہے اور مضمون
کے سیاق و سباق میں زیادہ موزوں ہے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : کسی نے لخلخہ اس کو سنگھایا ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

بجا جس وقت اس کے ہوش ہائے
کہے تو سب کے پھر اوسان آئے[1]
کہا سب نے یہ کیا تھا کہیے[2] احوال
کہ تیرا ہو گیا اک بار یہ حال
جو ہوش آئے بھی تجھ کو تو بھی دلگیر
عیاں ہے تجھ پہ درد و غم کی تاثیر
یہ جا کچھ جائے درد و غم نہیں ہے
محل میں عیش ہے، ماتم نہیں ہے
لگی کہنے وہ ہوں میں کیونکہ خرسند
کہ اب مہمان ہوں یاں کی دمِ چند
گیا اب اور ہی کے ہاتھ میں ہاتھ
ہمارا اور تمھارا ہو چکا ساتھ
یہ آتا ہے جو لاکھوں عزو شاں سے
سو اب لے جائے گا ہم کو یہاں سے
جدائی ایک تو ہوگی تمھاری
اور اس سے دیکھیے صحبت ہماری
ہوا در پیش ہم کو واں پہ چانا
نہیں ممکن جہاں سے پھر کے آنا
نئی خلقت، نیا شہر اور نیا گھر
برار آوے گی صحبت ان سے کیونکر

۱- نسخۂ لکھنؤ: غرض جس وقت اُس کو ہوش آیا
تو پھر اُلفت کا سب کو جوش آیا

۲- نسخۂ لکھنؤ: کہو تو۔

اسی گھر جانتے تھے ہم رہیں گے
انھوں میں سدا باہم رہیں گے

نہ اس کے حیف بھی اوسان آئے
پڑیں گے یعنی اب بس میں پرائے

چلے جائیں گے اس جا کام ناکام
جہاں کا آ سکے نامہ نہ پیغام

یہی رہ رہ کے دل اندوہ گیں ہے
کہ ہم میں وصف بھی کوئی نہیں ہے[۱]

ہو جس سے خاطرِ خاوند خرم
نہ ہووہیں بے ہنر مشہور واں ہم

کہے گی واں کی خلقت یوں زباں سے
کہ یہ زن بے ہنر آئی کہاں سے[۲]

زبس رہ رہ کے مجھ کو یہ ہی ڈر ہے
کہ یہ میکا تھا وہ خاوند کا گھر ہے

یہاں جس طرح سے گزرے سو بہتر
وہاں بہتر ہی سے گزرے تو بہتر

یہ کہہ کر ہمدموں سے وہ پری زاد
گلے لگ روئی با صد آہ و فریاد

لیے ہمراہ اپنی محرمِ راز
آگر آئی محل سے پھر وہ طناز

بچھے تھے فرشِ شاہانہ جو ہر جا
ہوا نوشہ سو ایدھر جلوہ فرما

۱۔ نسخہ لکھنؤ : کہ ہم صحبت وہاں کوئی نہیں ہے۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلے تین شعر ندارد۔

ز بس فرشِ مکلّل ہر طرف تھے
براتی ان پہ بیٹھے صف بصف تھے
وہ خیمے بادلے کے بس جھلاجھل
تمامی کی قناتیں ، فرش مخمل
نہیں مسند کی کچھ تعریف ہوتی
ٹکے جھالر میں جس کے گرد موتی
بھرے جس حسن سے رنگیں وہ تکیے
یہ جی چاہے انھیں کو بیٹھے تکیے[1]
وہ نوشہ جب کہ بیٹھا اس پہ آ کے
دبا مسند مصاحب بیٹھے جا کے
وہ روشن ہر طرف شیشے کے فانوس
رتن کو ہووے گرمی جس کی محسوس[2]
ہزاروں طرح کے رنگیں پُر از نور
بلوریں جھاڑ ان پر شمع کافور
ہزاروں رنگ کے شیشے بھرے تھے
بصد زینت وہ کوٹھوں پر[3] دھرے تھے
کہ ان کا ہو جدا عالم نمایاں
رکھے تھے آڑ میں شمعِ چراغاں
کہوں کیا روشنی کی یہ جھلک تھی
کہ روشن جس سے قندیلِ فلک تھی

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : نہ ہرگز گرمی ہووے جس سے محسوس ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : لبِ بام ہر طرف گو یوں ۔

وہ بیٹھے تھے براتی بادلہ پوش
ہوں مہر و ماہ جن کو دیکھ بے ہوش
گلے میں کرتیاں گل کی[1] طرح دار
کہوں کیا بزم میں پھولا تھا گلزار
سبھوں کے پاندان آگے دھرے تھے
کہ بس وہ حسن و خوبی میں بھرے تھے
لئے رنگیں وہ نازک چوکھڑے تھے
انوکھی وضع کے بس وہ گھڑے تھے
سلیقے سے رکھے تھے اس میں چن چن
طلائی ۔ نقرئی سپاری و بن
معطّر عطر سے ہر گلبدن تھا
کہ حیران جن کی خوش بو سے بدن تھا
ادھر نوشہ کے تھی یہ روبرو سیر
کہ بس تھے جمع اہلِ کعبہ و دیر
محل میں تھی ادھر یہ دھومِ اور دھام
کہ مصروفِ طرب تھی[2] ہر گل اندام
کہ تھی سہرہ کوئی دولھن کا گاتی
کوئی لے ڈھول تھی ہر دم بجاتی
کوئی دولھن کی آرایش میں مشغول
کوئی بانٹے کسی کو پان اور پھول

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہار پھولوں کے ۔ نسخۂ مصطفائی : کرسیاں ۔ موجودہ صورت نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور میں ہے ۔ ممکن ہے نسخۂ مصطفائی میں کتابت کی غلطی ہو ۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ : تھا ۔

ہؤا اتنے میں کھانا بسکہ تیّار
بچھایا لا کے دستر خوانِ گلزار
چلمچی[1] ، آفتابہ لے کے آئے
تھے جن پہ رنگ رنگ جواہر کے لگائے
سراسر ہاتھ سب کے بس دھلا کے
چنا موقع سے خاصہ پھر منگا کے
طلائی لقرۂ رنگیں سبھی ظرف
جواہر تھا کیا ان کے اوپر صرف
طعامِ خاصہ ان میں بھر کے آیا
سلیقے سے ہر اک کے آگے رکھا
وہ پوری اور برنج و شیر و شکّر
رکھے آگے منگا کے سب سراسر
جلیبی ، برفی و نقل و بتاسا
جنھیں دیکھے سے جی چاہے کہ کھا جا
وہ شیرینی لطیف اور چند در چند
بیاں میں جس کے ہوتی ہے زباں بند
ہزاروں وضع کے کھانے خوش آئیں
بسا خوش ذائقہ ، شیرین و نمکیں

۱۔ نسخہ' لکھنؤ : سلفچی ۔ (چیلچی ۔ بفتحتین و سکونِ بای فارسی و بعدہ' جیم فارسی بمعنی طشتے کہ دراں دست شویند و این ترکی است ۔ مردم از ناواقفی چلمچی گویند ۔ از نصاب ترکی نوشتہ شد و بعضی بکسر اول و فتح ثانی نوشتہ ۔ غیاث) چلمچی، سلفچی کی نسبت اصل لفظ کے زیادہ قریب ہے ۔

جو اک لقمہ کوئی اس میں سے کھاوے
زباں پر لذتیں لاکھوں اٹھاوے
مربے ہر طرح کے چاشنی دار
نگاہِ ناظراں جن پر مگس وار
اچار ایسے جو ان کو دیکھ پاوے
تو منہ میں پانی ہر اک کے بھر آوے
ہزاروں قسم کے میوے رکھائے
کہ وہ تازہ ولایت سے تھے آئے
یہ سب تھا پر نہ تھے واں راگ گاتے
کہ راجہ راگ بن تھے کچھ نہ کھاتے[1]
کیا جب نوشِ جاں اس نے نہ کچھ واں
ہوئی انگشتِ حیرت لب بدنداں
براتی اور مصاحب تھے جو بیٹھے
سبھوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھینچے
برہمن دست بستہ ، روبرو آ
لگے کہنے کہ موجب اس کا فرما
دقیقہ کوئی ہم سے کم ہوا ہے
کہ جس باعث سے تو برہم ہوا ہے
ہے کیا مطبوعِ خاطر شرب یا اُکل
نہیں پایا ہے جس نے روبرو دخل
و یا کھانا نہیں ہے حسبِ دل خواہ
نہیں ہے اشتہائے صاف اے شاہ

۱۔ نسخہ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

جو فرماؤ منگاویں ہم ابھی زود
وہ کیا ہے جس سے دل تیرا ہو خوشنود
ہوا وہ درفشاں اپنی زباں سے
کہا جلدی گروہِ بیدخواں سے
کہ اے آگاہِ علمِ بید خوانی
عیاں سازندۂ رازِ نہانی
یہ عقدہ مجھ کو ہے درپیش لاحل
طعام اول ہے یا ہے راگ اول
درِ دل راگ سے ہوتے ہیں مفتوح
کہ آتی جسم میں ہے راگ سے روح
ملے ہیں آدمی کو چار لذات
ہیں چاروں کی مقرّر چار اوقات
دہن ، بینی و چشم و گوش اے یار
رکھی ہیں جسم میں یہ لذتیں چار
طعام و خاصہ ہے قوت زبانی
ہے بینی کی بھی خوشبو میہمانی
جو دیکھا لذتِ جسمی ہے معلوم
زمیں پر[1] گوش شنوا کیونکہ محروم
جوابِ باصواب اس کا جو پاویں
تو ہاں البتہ کھانا ہم یہ کھاویں
انھوں نے عرض کی اس سے کہ اے ماہ
مقرر سالکوں نے کی ہیں دو راہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : رہیں پھر -

جو راہِ علمِ ظاہر پر ہیں قایم[1]
نہ دیویں ان کو رخصت راگ کی ہم
نہیں ہے سالکوں کو راہ یہ خوب
کہ سن کر اس سے ہو جاتے ہیں مجذوب
ہوئی کیفیت اس کی جب کہ معلوم
تو پھر حکمِ کتابت سے ہے محروم
نہیں کچھ خوب ہے اس کی سماعت
کہ موقوف اس سے ہوتی ہے عبادت
جو باطن میں ہیں مستِ جامِ الفت
انھی کو چاہیے اس کی سماعت
ہے عشقِ حقیقی کا جو پیالا
ہو اس کی اس سے کیفیت دوبالا
کہ بس ان کی وہی ہے منزلِ وصل
بغیر از راگ ہے ان کے تئیں فصل
کیا جس واسطے تھا ترک آرام
ہوا سو اب تمھارا آخر انجام
شبِ فرقت گئی وصلِ سحر ہے
ہوئی طے راہِ دوری ، اب یہ گھر ہے
تمھارے واسطے اقسام اقسام
ہے اکل و شرب ہر جا بہرِ آرام[2]
چھٹی تن سے تمھارے خاک دوری
ہوئے اب تم نہا دھو شکلِ نوری

۱- نسخہ لکھنؤ : جو ہینگے علمِ ظاہر پر مقدم ۔
۲- نسخہ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

مگر یہ جو تمھارے ساتھ ہیں یار
اگر ان کو ہو اس کا شوق سرشار[1]

کہو ان سے الگ جا اس مکاں سے
کریں شاداب دل رقصِ بتاں سے[2]

کمی سرکار میں اس کی نہیں ہے
ہر اک مہ رو یہاں زہرہ جبیں ہے[3]

قریب اس کے جو یاں خیمہ عیاں ہے
مہیا راگ کا اسباب واں ہے[4]

غرض یہ بید خوانوں نے سنایا
وہ کھانا اس نے پھر خوش ہو کے کھایا

فراغت جب ہوئی کھانے سے حاصل
ہوئے حسب الطلب پھر گھر میں داخل

ادھر ان کے مصاحب اور ہم دم
بحکمِ بید خواناں ہو کے باہم[5]

سماع و رقص کی آ کر ہوا میں
گئے اس خیمۂ راحت فزا میں

مکاں پایا عجب رنگین دل کش
ہر اک رونق فزا اس میں پری وش

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ شعر اور اس سے آگے مسلسل ۲۶ اشعار ندارد ۔

قرینے سے مہیا واں ہر اک شے
رباب و بین و طنبور و دف و نے
کسی زہرہ جبیں کے پاس قانون
فرشتہ بھی جسے سن کر ہو مجنون
کوئی مہ رو لیے اک دائرہ ہاتھ
کسی سے کہتی تھی کیجو مرا ساتھ
کسی کے جلترنگ اک ہاتھ میں ہے
وہ لے اڑتی ہے گویا راگ کی لے
کمانچہ اور سارنگی بنا کر
موافق ان کے سب باتیں[1] ملا کر
ستاروں کے ملا کر تار اک بار
بنا کر ٹھاٹھ کر رکھتے ہیں تیّار
مہابت خاں نے سر طبلوں کے کھینچے
کہ وہ جانِ فلک[2] گردوں سے اینچے
مجیروں کی لیے وہ جوڑیاں ہائے
کہ جھنکار ان کی گوشِ زہرہ تک جائے
وہ منہ چنگیں رکھے منہ پر پری زاد
منے سے جن کے دل کرتا ہے فریاد
وہ عود و چنگ موسیقار اور بین
کہ دل عالم کا لیویں سربسر چھین
جہاں میں جو غرض سازِ طرب تھا
کہوں کیا میں مہیا واں ہی سب تھا

۱۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : تربیں ۔
۲۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : جائے فلک ۔

جو اربابِ نشاط القصّہ واں ہیں
سرورِ خاطرِ پیر و جواں ہیں
مصاحب آئے واں جس دم رتن کے
گئے خیمے میں کھل تختے چمن کے
بہم کر مشورت آپس میں یہ خوب
سنے جس جس کو ہو جو راگ مرغوب
انھوں میں جو کہ تھے دیرینہ دانا
پسند آیا انھیں گانا پرانا
کلانوت اچھے اچھے ان میں چھانٹے
وہ اہلِ جھنڈ اور بربند بانٹے
پسند آیا انھیں جو گیت سنگیت
تو کی جاری قدیمی رسم اور ریت
تک اور دھرپت پسند آئی انھیں واں
کیا اپنی جُدی محفل کا ساماں
خوش آئی جن کے تئیں قانوں کی بانی
جمی ان کی بھی بزمِ شادمانی
خیال آیا جنھیں ٹپے کا دل میں
کہ تھی اک چلچلاہٹ آب و گل میں
انھوں کے سر جدا عالم نشے کا
جدا اک سمت کو جلسہ جمایا
لگا ہونے انھوں کے آگے جو راگ
زمانے سے گئے رنج و تعب بھاگ
رکھے تھے سب درست اپنے جو کر ساز
لگے گانے ملا کر ساز و آواز

اڑی مل کے سُروں سے وہ دھواں دھار
صدا سے بھر گیا گردونِ دوار
کھڑے ہو کر بجایا راگ جس دم
آ کھاڑا دل سے ساری خلق کا غم
کروں کیا اس سما بندی کی تقریر
کہ ساری بزم تھی اک بزم تصویر
جو بیٹھا تھا سو بیٹھا رہ گیا تھا
کھڑا تھا جو کہ سو حیراں کھڑا تھا
کہ تھی دونی قیامت با سم و تال
کیا تھا ضبطِ دل کو جس نے پامال
اسی صورت ہزاروں رنڈیاں تھیں
وہ پریاں بزم کے اندر عیاں تھیں
قیامت رقص میں آ کر کے در جوش
اڑا رکھے تھے ساری بزم کے ہوش
کسی جانب وہ لونڈے برج ہاسی
دلوں سے دور کرتے تھے اداسی
وہ میٹھی میٹھی لے ، سورٹھ کی تانیں
نکالے لیتی تھیں قالب سے جانیں
ادائیں ان کی وہ غارت گر جاں
قیامت جاں ولے آفت غضب آں
ستم ان کا تھا وہ ٹھوکر لگانا
کہ بس پامال ہوتا تھا زمانا
وہ پاؤں کی ٹھمک کیجے بیاں کیا
کہ تھا ہر اک آپچ میں ناز برپا

عجب ان کی لگاوٹیں بھینکیاں[1] تھیں
دلوں کے پار ہوتی برچھیاں تھیں

اٹھا کر ہاتھ آنا بانے رے ہائے
بھلا کیونکر نہ دل ہاتھوں میں[2] پس جائے

بیاں کیجے کہاں تک اور ساماں
میاں[3] کی روح بھی پکڑے تھی واں کاں

اگر بے خود وہ جلسہ دیکھ پاتا
نکل جاتا وہ ہو کر باؤلا سا

نظر آتی جو خسرو[4] کو وہ صحبت
بلا تشبیہ کہتے ''ہے کرامت''

میاں وہ سور[5] بھی گر دیکھ پاتا
کنہیا کا وہ سب جھمکا بھلاتا

زہے بزم و زہے رقص بتاں ہے
کہ بے خود واں پہ ہر پیر و جواں ہے

اکھاڑا واں پہ اندر کا خجل ہے
نکیسا باربد بھی منفعل ہے

رتن کے یاروں نے یوں شب گزاری
سنو پھر اب محل کی چہل ساری

۱- بھنی برچھیاں ۔
۲- نسخہ ممتاز المطابع : ہاتھوں سے ۔
۳- میاں : غالباً میاں تان سین مراد ہے ۔ اکبر کا درباری گویا ۔
۴- امیر خسرو : مشہور شاعر ، انشاء پرداز و موسیقار ۔
۵- شاید سور داس مراد ہے ، مشہور ہندو موسیقار ۔

آدھر نوشہ گیا تھا جب محل میں
تھیں رسم و آئینے کیا کیا محل میں
تماسی کا جو گمگیرا کھڑا[1] تھا
کہے تو اک فلک زریں بنا تھا
یہ جھالر موتیوں کی تھی نمایاں
کہے تو جیوں شعاعِ مہرِ رخشاں
بچھا اس کے تلے تختِ مربع
بنا سونے کا با کارِ مرصع
بچھی مسند رکھے تکیے ز بس نرم
صفا سے جس کی مخمل کے تئیں[2] شرم
طلائی اک سبوچہ[3] لا رکھا واں
گویا جس میں بھرا تھا آبِ حیواں
غرض جا کر یہ بیٹھا تخت اوپر
پرستاں میں گویا آیا ہے اندر[4]
کہوں کیا اس گھڑی کی جائے عش عش[5]
بٹھائی لا کے جس دم وہ پری وش
ادا ہونے لگیں رسمیں جو طرفین[6]
ہوا حاصل دلوں کو راحت و چین

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : بنا ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : ہو مخمل کو بھی ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : گھڑا ۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ : غرض بیٹھا یہ جا کر تخت پر واں
جہاں بیٹھی تھیں گرد و پیش پریاں
۵۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ گھڑی وہ جائے دلکش ۔
۶۔ نسخۂ لکھنؤ : رسوم ہونے لگیں جس دم کہ طرفین ۔

دولھن دولھا کی دی جب[1] گانٹھ باہم
کھلے دل سب کے ہو کر شاد و خرم
ستارے برہمن نے چند گن کر
پڑھے اشلوک جو تھے واں مقرر
دولھن دولھا نے مروارید کے ہار
گلے ڈالے ہیں یک دیگر طرح دار
بہم ہو ایک جا وہ مہر اور ماہ
کئی پھیرے پھرے[2] با عزت و جاہ
دولھن نے لے کے ہاتھوں میں وہ پانی
اشارہ کر ز حسنِ زندگانی[3]
دیا پھر اس نے اس کو آب بھر کر
مبارک یعنی میں ہوں تیرے سر پر
غرض ہاتھوں میں دولھا کے دیا وہ
بجاں مقبول اس نے لے لیا وہ[4]
اجابت ہو چکی ان کی وہ جس دم
ہوا ادنیٰ و اعلیٰ شاد و خرم
شہِ زریں کلاہِ چرخِ چارم[5]
ہوا رونق فزائے تختِ عالم

۱- نسخۂ لکھنؤ : بندھی دولھا دولھن کی ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : دیئے ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : نوجوانی ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔
۵- نسخۂ لکھنؤ : جس دم ۔

عروسِ لیل با صد حشمت و جاہ
چھپی لے خیلِ نجم اپنے ہمراہ
بدم جائے دگر ہوئی درآمد[1]
رتن دولت سرا سے کر برآمد[2]
سریرِ بادشاہی کے اوپر آ[3]
بصد خوبی ہوا جب[4] جلوہ فرما
جہیز ایسا دیا اعلیٰ جہاں سے
بروں تحریر اور[5] افزوں بیاں سے
ہزاروں فیل منگلوں سے سبک رو
کئی لکھ اسپِ تازی خوش تگادو
شتر ایسے یہ جن کی عزّ و شاں ہے
ستونِ آسماں کوہِ رواں ہے
ہزاروں پالکی لاکھوں ہی چنڈول
خراجِ ہفت کشور جن کا ہو مول
کہوں کیا میں وہ ملبوسِ شہانہ
بھرا جس سے یہ صندوقِ زمانہ
نہ تھی بس واں پہ قدرِ سیم اور زر
بجا اس کے دبے تھے لعل و گوہر

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: ہوئی اک اور جا رانی درآمد۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ: ہو برآمد۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ: بادشاہی پر وہ بیٹھا۔
۴۔ نسخۂ لکھنؤ: وہ۔
۵۔ نسخۂ لکھنؤ: سے۔

پرستاریں ہزاروں وہ پری وش
کہ جن کو دیکھ کر ہووے پری غش
غلامِ مہروش وہ چند در چند
بخدمت روز و شب حاضر کمر بند
ہزاروں نافہ ہائے مشکِ تاتار
کئی من زعفران البار البار[1]
گلاب و عطر کے شیشے وہ لاکھوں
معطّر جس سے مغزِ دوستان[2] ہوں
سپر تیغ و کمان کے لاکھوں صندوق
ہزاروں طرفہ لاہوری وہ بندوق
کمانِ چاچ اور نیزے[3] ختن کے
ہزاروں تحفہ جات اپنے وطن کے
طلائی، نقرئی، چینی، سبھی ظرف
کئی ان پر جواہر تھے ز بس صرف
مقرر کر مکاں اک نیک منزل
جہیز اس کا کیا واں لے کے داخل
نہیں تحریر میں آتا کہوں[4] کیا
خسر کے جب کہ وہ مجرے کو آیا
بآئینِ ادب وہ سروِ رعنا
بجا لایا غرض آداب سارا

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : بوستاں۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : ترکش۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : لکھوں۔

تو گندھرپ سین نے آگے بلا کے
بہت سا رو رو اور چھاتی لگا کے
کہا اے راحتِ جاں نورِ دیدہ[1]
بہ تن مانندِ جاں منزل گزیدہ
دل و دیدہ ہوئے روشن مرے آج
مبارک ہو یہ تجھ کو تخت اور تاج
جو دیکھا ہم نے اپنے دل میں کر غور
تمھارا دور ہے بس ملک چتّور
حاصل کیجے سنگلدیپ کا تاج[2]
کہ ہے یہ بھی تمھارا ملک اور راج
رتن نے دست بستہ عرض کی تب
کہ ہے لطف و عنایت آپ کی سب
اگر ہر موئے تن میرا زباں ہو
ثنا تو بھی تمھاری کب[3] بیاں ہو
یہ تم نے کی ہے میری پرورش یاں
کہ جیسے مور پر لطفِ سلیماں
جلاتی تھی مجھے جو نارِ دوری
بنایا خاک سے تم نے سو نوری
ہوا تھا بسکہ میں بدتر ز حیواں[4]
کیا صد شکر تم نے مجھ کو انساں

۱- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : اور دیدہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : باج ـــــ تخت اور تاج -
۳- نسخۂ لکھنؤ : کب -
۴- نسخۂ لکھنؤ : بھرنے میں حیوان -

بنایا قطرے کو جوں بحرِ عمّاں
کیا ذرے کو تم نے مہرِ تاباں
در دولت یہ تیرا اے یگانہ
ہے میرا اور مسجودِ زمانہ

مکانِ چتکھنڈہ میں رتن سین کا آنا اور شرابِ وصالِ پدماوت سے لذت و سرور پانا

میسر جس کو وصلِ یار ہو اے دل سو دنیا میں
برنگِ عندلیبِ فصلِ گل ٹک چین پاتا ہے[۱]

کدھر ہے ساقیِ سرمست ، خود کام
مئے عشرت سے مجھ کو بھردے اک جام
لکھوں تعریف یاں حسنِ حسیں کی
ثنا بعد اس کے پھر اس کے مکیں کی
مکیں یعنی پدم رشکِ چمن کی
شبِ وصل اس کی اور راجہ رتن کی
کہ جب کر عذر خسرو سے وہ راجہ
مکانِ خاص میں اپنے پھر آیا
جو بیٹھا آ کے وہ سروِ خوش آئیں
رفیقوں یاروں نے لذریں دکھائیں
گیا وہ روز ، آئی وصل کی شب
کہ اس بِن تلخ جاں تھا وہ شکرلب

۱- نسخۂ شیرانی : شعر ندارد ۔

مقرر تھا مکاں اک ہفت منزل
برنگِ چرخ چڑھنا جس پہ مشکل
نہ پہنچے جس پہ ہرگز وہم چالاک
کہ تھی وہ ہفت منزل ہفت افلاک
عجب رنگیں منقش تھا بنایا
جواہر جس پہ تھا ہر جا لگایا
مصفّا خشت ہیرے سے تھی اس کی
گلاب و عطر آگیں آب گل تھی
یہ قلعی موتیوں کی تھی سراپا
در و دیوار جیسے موج دریا
ہوا یوں[1] صندلی فرش اس زمیں کا
کہ عالم تھا وہ لوحِ صندلیں کا
برنگِ آئنہ رخشندہ شفاف
جو دیکھے اس کو دیکھے آپ کو صاف
مکاں ایسے ہی سب منزل بمنزل
جواہر اس میں تھے یا تھے لگے دل
تمامی بادلہ کا جا بجا فرش
رہے جس سے منور منزلِ عرش[2]
بلوریں میر فرش ایسے نمایاں
فلک پر قطب جیسے ہو درخشاں
دکھاتی اس کو منزل اور مکاں سب
گئیں القصہ لے اس کو وہاں سب

۱- نسخۂ لکھنؤ : کیا یہ ۔ نسخۂ ممتاز المطابع : ہوا ہہ ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

گیا جب منزلِ مقصود پر واں
نہ دیکھی لیک[1] مہوش جلوہ گر واں

کہ بہرِ اشتیاقِ عاشقِ زار
وہ ہمزادیں جو تھیں اس کی طرح دار

اسی جا اک مکاں میں شاد و خنداں
کیا تھا اس کی بس نظروں سے پنہاں

مگر عالم جو دیکھا اس مکاں کا
ہوا شوق طپش اس کو دوبالا

کہ روشن تھا ز بس یہ حسن اور نور
جہاں کا نور، نورِ شمع کافور

جواہر کی جھلک جیوں برق کی کوند
نظر کو آتی تھی جس سے چکاچوند

فرشتہ بھی جسے ہو دیکھ شیدا
کہ تھا دیوار و در سے حسن پیدا

یہی دیکھے نظر جاوے جہاں تک
مرصّع اور منقّش اور مشبّک

زمیں تھی سب مصفّا اور رنگیں
نہ اس کو احتیاجِ فرشِ قالیں

تمامی بادلہ جس پر بچھا تھا
زمیں کا روپ کیا کہیے کہ کیا تھا

چھپر کھٹ وہ مرصّع کار نایاب
نگہ کو جس کے دیکھے آئے تھا خواب

۱- نسخۂ لکھنؤ: ایک۔

بچھی محفل کی جس پر صاف توشک
کہ نرمی سے نہ تھی کچھ جس میں تو شک

یہ چادر اس پہ پھولوں کی بچھی ہے
کہ اک گل کی نہ چھوڑی ہے رگ و پے

کھنچی چادر کسی کس نے وہ اس پر
ٹکے تکموں میں جس کے لعل و گوہر

کہ گل تکیے کہ گل تکیے تھے کیا تھے
تھے گل اس سے تو گل تکیے صفا تھے

اوتچی اور جھلاجھل تھے تمامی
جہاں کم خواب کو حکمِ غلامی

وہ گردا گرد ان کے لعل و گوہر
نظر کیجے تو کب ٹھہرے ہے ان پر

زمرد کے تھے سب جوڑ ان کے قلاب
سراسر لعل کی استادی نایاب[1]

کہوں کیا میں کہ وہ رنگین پائے
خدا جانے کہاں سے ہاتھ آئے

بیاں کیجے چمک اور کیا صفائی
کہ وہ چھتری تھی ہیرے کی بنائی

چمک میں وہ غلاف پردہ جیوں برق
سراپا وہ چھپر کھٹ مطلعِ شرق

۱- نسخۂ لکھنؤ: یہ اور اس کے بعد کا شعر مقدم مؤخر ہیں۔

بچھی اک سمت کو مسند مغرّق
سراپا لعل و گوہر میں مغرّق[1]
ہر اک تکیہ جو وہ اس پر رکھا تھا
بجائے پنبہ حسن اس میں بھرا تھا
زمرد کا جو ترشا پیکدان تھا
رکھا مسند کے کونے پر عیاں تھا
رکھا تھا اس پہ اک ململ کا رومال
جیوں آبِ پیکداں رنگ اس کا تھا لال
رکھا اس کے برابر ایک تنبول
خراجِ ہفت کشور جس کا ہو مول
لگے آئینے آدم قد بہر رنگ
کہ جن کو دیکھ ہوں اہلِ حلب دنگ
تصاویر اور گلدستے بہر طاق[2]
سدا جن پر فدا ہو چشمِ عشاق
ہؤا مسند پہ بس وہ جلوہ فرما
تمنّا وصل کی لیکن دوبالا
جو اس کی ہمدمیں تھیں سرو قامت
سراپا ناز اور شورِ قیامت
وہ کرتیں چھلیں خاطرخواہ آ کے
بہم ہنستیں تھیں کچھ باتیں بنا کے

۱- نسخہٴ لکھنؤ: بچھی مسند مغرق یک طرف تھی
لگے اس میں سراسر لعل و موتی

۲- نسخہٴ لکھنؤ: بشکل ابروے خوباں در و طاق

جو یہ کہتا تھا ان سے مسکرا کے
کہ آئیں تم اسے کس جا چھپا کے
کوئی کہتی کہ ہو دولھا کے تئیں شرم
کوئی کہتی کہ لو جی آپ ہیں گرم
کوئی کہتی کہ تو جوگی جتی ہے
پدم سے کیا تجھے وہ لکھ پتی ہے
کوئی کہتی یہ اس سے ہو کے خوش‌حال
کریں ہم اس سے تیرا[1] عرض احوال
چھپاتیں بس اسے چھلوں میں سارا
کہ لیل القدر آئے آشکارا
پدم کو اس مکاں سے محرمِ راز
رتن کے پاس لائیں پھر بصد ناز
عجب صورت سے آئی وہ پریوش
کہ جس کو[2] دیکھا آیا اس کے تئیں غش
کہوں کیا میں وہ مکھڑا غیرتِ بدر
وہ موئے سر برنگِ لیلۃ القدر
قیامت پٹیوں میں مانگ تھی واہ
شبِ دیجور میں عاشق کی جیوں راہ
وہ مابین السما میں[3] کہکشاں ہے
و یا ظلمات کا رستہ عیاں ہے

۱۔ نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : پھر یہ ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : جس نے ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ مابین آسماں میں ۔

وہ ڈھیلے پیچ اور جعدِ معطّر
زبس خوشبو میں جیسے مشک عنبر
نظر چوٹی یہ[1] اس کی پیٹھ پر آئے
کہ لوح صندلین پر سانپ لہرائے
مباف سرخ زریں یہ نمایاں
گھٹا کے ساتھ جیسے مہرِ رخشاں
نہیں ہیں زلف دو ہیں مست بے ہوش
کہ چلتے ہیں سدا وہ دست بر دوش
وہ یا ہیں نردبان حسن برپا
کہ تا عاشق کی نظرِ ناشکیبا
وسیلہ سے انھوں کے منہ تلک آئے
اگر لغزش بھی کھاوے تو ٹھہر جائے
جبیں وہ لوح سیمیں میں کہوں کیا
قیامت چین مثلِ موجِ دریا
کماں یا تیغ ابرو ہیں کہ کیا ہیں
ہلال نوک محرابِ دعا ہیں
وہ مژگاں تیر ہیں یا خنجرِ تیز
سنانِ نیزہ یا حبشیِ[2] خوں ریز
دو بادامِ سیہ یا چشمِ جادو[3]
ہے صیّادِ جہاں آنکھیں کہ آہو

۱- نسخۂ لکھنؤ : چوٹی پہ - نسخۂ ممتاز المطابع : چوٹی سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : بسان نیزۂ حبشی -
۳- نسخۂ لکھنؤ : جامِ جادو -

عذارِ صاف رشکِ فکرِ بلبل
قیامت گوش ، مثلِ خندۂ گل
یہ بینی حسن و خوبی میں ہے یکتا
الف ہے منشیِ وحدت نے کھینچا
دہن غنچہ کہ نقطہ یا گماں ہے
دلِ عاشق سے پوچھو تو[1] کہاں ہے
وہ اس کے لعل لب ایسے غیاں لال
ثنا میں جن کی ہے میری زباں لال
مسی مالیدہ لب وہ ، اور دنداں
تہِ ابرِ سیہ برقِ درخشاں
ذقن وہ مغزِ خوبی[2] چاہِ بابل
نہ نکلے جس میں گر کے پھر کبھو دل
نکہ اس چاہِ غبغب پر جو جاوے
ملک کے منہ میں بھی پانی بھر آوے
جو آہو گردن اس کی دیکھ پاوے
سر اپنا پھر نہ خجلت سے اٹھاوے
ڈھلے سانچے میں خوبی کے بر و دوش
خیال عاشقاں جیسے ہم آغوش
برابر اور گول[3] اس کے وہ بازو
کہ جن سے رنگ گل ہو ہم ترازو

۱- نسخۂ لکھنؤ : بولا تو ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : قصر خوبی ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : بھرے اور گول گول ۔

قیامت صاف وہ نازک کلائی
نہ دل کو جس کے بن دیکھے کل آئی
حنا بستہ کف اس کے صاف خوش رنگ
شفق میں مہر جن کو دیکھ ہو دنگ
سرِ انگشت مثلِ غنچہ اے یار
گل و بلبل ہوں جن کے عاشقِ زار
حبابِ چشمہ خوبی وہ پستاں
ہو یا ہیں دو انارِ باغِ رضواں
یہ ابھرے ہیں کہ جب ان پر نظر آئے
تو غیر از ان کے سب دل سے اتر جائے
وہ اودی بھٹنیوں کا ہے یہ جوبن
کہ شرمندہ ہو جن سے رنگِ سوسن
یہ ہیں بس چھاتیوں پر وہ دکھائیں
کہ درجِ حسن پر مہریں لگائیں
شکم وہ دور جس سے حرف سختی[۱]
قیامت صاف اک صندل کی تختی
صفائے چشم رشکِ فکرِ بلبل
کمر نازک زیادہ از رگِ گل
کمر کا اور سرین کا تھا یہ عالم
کہ دو موتی ہیں اک رشتے میں باہم
ہے اب مقراض خوبی قاطع ہوش
و یا یک غنچہ لشکفتہ خاموش

۱۔ نسخہ لکھنؤ: حرف سنجی۔

صفا زالو[1] کی اس کی یہ قیامت
کہ آوے دیکھ آئینے کو حیرت
وہ سیمیں ساق مثلِ شمعِ کافور
بلوریں یا ستوں ترشے ہیں پر نور
وہ ایڑی گول اور رنگین بالکل
کنول کا پھول یا گیندے کا ہے گل
وہ فندق اور کف اس کی یہ رنگیں
کہ ہو سرسبز جن سے باغ آئیں
قدم تک سر سے لے کر بادلہ پوش
کہ مہر و ماہ کے بھی جائیں اڑ ہوش
بھری یہ مانگ موتی سے سراسر
شبِ یلدا میں جیوں مانند اختر
وہ ٹیکا اس کی پیشانی پہ آفت
بہم مہر و مہ آثارِ قیامت
یہ آویزے[2] وہ گوہر کے خوش آئیں
سحر دم جس طرح سے عقد پرویں
وہ نازک کان میں جو بالیاں ہیں
جھکی پھول اور پھلوں سے[3] ڈالیاں ہیں
چمکتے تھے یہ تک جگنو کے سارے
گلے میں ماہ کے گویا ستارے

۱۔ نسخۂ ممتاز المطابع : رالوں ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ ابروئے ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : پھولوں کی جیسے ۔

زمرّد کی وہ ہیکل اس قدر سبز
قدم تک حسن زیور جس سے سر سبز
بیاں کیا کیجے مروارید کے ہار
خراجِ ہفت کشور درِ شہسوار
غضب بھج‌بند ، آفت نورتن تھے
بہم دل لینے کو یکجا دو تن تھے
وہ نازک پہنچیاں[1] اور طرفہ توڑے
کہ خوبی ان کے آگے ہاتھ جوڑے
وہ رنگیں اور سبک مینے کے چھلے
ہر اک چھلا دلِ عاشق کو چھل لے
جڑاؤ وہ کڑے ، توڑے۔ طرحدار
بصد منت پڑے پاؤں میں وہ یار
اگرچہ تھا یہ زیور زیبِ قامت
پہ کی خلخال نے برپا قیامت
ستاروں کی بھری وہ جفتِ پاپوش
کہ اُڑ جاویں فلک کے دیکھ کر ہوش
وہ اس عالم سے کافر جبکہ آئی
نظر آئی رتن کو اک خدائی
چرائے سب بدن اور[2] منہ چھپا کے
غرض مسند پہ بیٹھی جب وہ آ کے
لحاظ و شرم سے بیٹھی وہ خاموش
شرابِ عشق سے لیکن بدل جوش

۱- نسخۂ لکھنؤ : چیلیاں -
۲- نسخۂ ممتاز المطابع : چلی آئی سب اپنا -

نہ آپس میں اشارے اور نہ تقریر
گویا[1] خاموش دونوں شکلِ تصویر
پرستاریں وہ دانائے زمانہ
گئیں سٹ واں سے لے ہر اک بہانہ
انیسیں خرم اس کی وہ خوش آئیں
بٹھا کے آن کو اٹھ کر سو[2] خوش آئیں
نہ دیکھا غیر کوئی اس کے جب ساتھ
رتن نے پا کے تنہا اور لے ہاتھ
قدم پر سر کو رکھ آنسو بہا کے
طپش دل کی آپے اپنی دکھا کے
کیا تقریر اس سے اپنا احوال
جو گزرا حادثہ تھا ماضی و حال
کہ تیرے غم نے تھا جوگی بنایا
یہاں تک چھوڑ کر ہوں راج آیا
کہوں ان کی سو کیا اے ماہرو بات
جو دیکھیں روز و شب تجھ بن صعوبات
پھر آ کے طوطیٔ تنگِ شکر نے
مریضِ غم کے یعنی[3] چارہ کر نے
غرض سب حرف حرفاً کر کے تکرار
سنائی داستانِ عاشقِ زار

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ تھے ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : دولوں کو ہو وہ ۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ : مریض درد و غم کے ۔

رہا ہوں جس طرح سے یاں پہ مغموم
سو ہے وہ تجھ پہ ظاہر اور معلوم
کہوں کیا سن چکی جب یہ زبانی
تو بولی وہ گلِ باغِ جوانی
کہ اپنا کیا کہوں میں تجھ سے احوال
سنا ہی ہوگا اس طوطے سے سب حال
یہ سن کر حال تیرا ہو کے بیتاب
نہایت مضطرب مانندِ سیماب
بہانہ کر پرستش کا صنم کے
یہاں سے باغ میں جا واں پہ آ کے
ہوئی عاشق میں تجھ کو دیکھ اس جا
کیا تجھ پر فدا میں نقد دل کا
پہ تو[1] ایسا ہوا بے ہوش اک بار
کہ آنا ہوش واں تھا سخت دشوار
فدا کو تجھ اوپر میری نگہ تھی
حیائے ہمرہاں پر سدِّ رہ تھی
وگرنہ ہار میں دیتی گلے کا
کہ وہ آئین و رسمِ عقد سب تھا
تری چھاتی کو صندل میں لگایا
پہ تو ایسا ہی سویا پھر نہ جاگا
وہاں سے ہو کے میں ناچار آئی
دلِ بے کل سے لیکن کل نہ پائی

۱- نسخۂ ممتاز المطابع : تو پھر -

بظاہر تھی حیا و ننگ و ناموس
کہ جلتی تھی برنگِ شمعِ فانوس
نہ کھانا خوش مجھے تھا اور[1] نہ پینا
کہ تیرے غم سے تھا دشوار جینا
ہم جب کہہ چکے حالِ دلِ زار
کہ نکلے ہائے دل سے درد کے خار
بصد ناز و ادا مسند پر آٹھ کے
چھپرکھٹ میں گئے آرام لینے
گرادیں چلمنیں جو تھیں خوش اسلوب
کہ بعضی جا پہ ہے پردہ بہت خوب
کہوں کیا اس گھڑی کا تم سے عالم
کیے کیا کیا مزے دونوں نے باہم
ہم دونوں وہ مصروفِ طرب تھے
کہ بس سینہ بسینہ لب بلب تھے
کہوں کیا یک دگر وہ مثلِ بلبل
ہم چنتے تھے عیشِ وصل کے گل[2]
بزانو مستعد ہو کر وہ مائل
کر اپنے دست اس مہ کی حمائل
بنا طوقِ کمر وہ ساقِ سیمیں
ہوا بس سلسلہ جنباں خوش آئیں
ہؤا پُرجوش جب ابرِ گہر بار
کیے زیبِ صدف بھر درِ شہوار

۱- نسخۂ لکھنؤ: کچھ مجھے بھاتا۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: ہم بھنے کئی غم کی گرہ کھل۔

غرض ہو باغ باغ اور شاد و خرّم
بھرے اس غنچے میں قطراتِ شبنم
جو تھا وہ رازِ مخفی دُرِ ناسفت
بسانِ دو ہلالِ نو بہم جفت
بھرے اس درجِ سربستہ میں گوہر
کہ جیوں برجِ حمل میں جائیں اختر
نہالِ آرزو تھا دور از آب
ہوا بارے وہ تازہ اور سیراب
بیاں کیا کیجے اس دم حال کیا تھا
بہم دونوں میں صد ناز و ادا تھا
کسی کا رنگ جیوں مہتاب فق تھا
کسی کا رنگِ رو، مہرِ شفق تھا
کسی کے بند جامے کے گئے ٹوٹ
کسی کے موئے سر ہا تک پڑے چھوٹ
ملا دل دل سے تن سے تن ملا تھا
تھی لیل القدر یا[1] دن عید کا تھا
کہوں کیا سیکڑوں دل کی امنگ سے
فراغت کرکے اٹھے جب پلنگ سے
کھلے دل وصل سے ہو شاد و خرّم
تو پھر مسند پہ بیٹھے آ کے باہم
بہم تقریر و ایما اور اشارات
رہے تا صبح دم حرف و حکایات

۱- نسخہ لکھنؤ: شبِ قدر ایک اک۔

بر آیا بس کہ ان کا کوکبِ وصل
کہ بعدِ روزِ ہجراں تھی شبِ وصل
دولھن دولھا نے خاطر خواہ پائی
کہ تھی جس کے لیے محنت اٹھائی
کیا تھا ترک جس کے واسطے راج
ہوا سو آخرِ کار اس کا سرتاج
جو تن من خاک میں اپنا ملاوے
تو مطلب جیوں زرِ گم گشتہ پاوے

**بیدار ہونا صبح کو ان دونوں آفتابِ حسن و جمال کا
اور بسر کرنا عیش و کامرانی میں ماہ و سال کا**

فلک بر عکس و ظالم ہے بڑھا کر روز ہجراں کو[1]
شبِ وصلِ صنم بس بات کہنے میں گھٹاتا ہے
دے اے ساقی مجھے جامِ لبا لب
کہ توڑوں میں خمارِ شب کی تئیں اب
دولھن دولھا کو سوتے سے اٹھاؤں
جو آرایش ہو ان کی پھر بناؤں
ہوا بس مہ گریزاں مثلِ سیماب
بر آیا نیرِ مشرق جہاں تاب
برآمد ہو رتن دولت سرا سے
رہا سو اور اک خلوت میں آ کے

۱- نسخۂ لکھنؤ: بڑھا کر روزِ ہجراں کو فلک برعکس ہے ظالم - نسخۂ ممتاز المطابع: فلک برعکس عالم ہے - نسخۂ شیرانی: شعر ندارد -

پدم کے پاس آئیں محرمِ راز
شریر و شوخ ، دلبر اور طنّاز
یہ دیکھا رنگ اس آراستہ کا
گلِ باغِ حیا نوخاستہ کا
کہ بادامِ سیہ اس کی خوش آئیں
برنگِ نرگسِ شہلا ہے رنگیں
عجب ہی شکل اس کی ہو گئی ہے
کہ رنگِ سرخِ تن ، اب چنپئی ہے
جو ملبوسِ عروسی زیبِ تن ہے
سو لے کر سر سے پا تک پُر شکن ہے
کہیں مسکی ہے انگیا ، بند ہیں باز
کسی جا سے کُھلی چل چین پشواز
جو ٹوٹے موتیوں کے ہار تھے سب
پڑے ہیں گرد مہ کے جیسے کوکب
جبیں پر تھی جو افشاں وہ نمایاں
سو بیکا روئے فرش[1] اب اس سے افشاں
بیاں کیا کیجے اس کی زلف و کاکل
پریشاں ہیں سراسر مثلِ سنبل
ہوئے بوسے سے وہ اس کے لب اور گال
برنگِ غنچہ و مانندِ گل ، لال
مگر در بر اسے کھینچا تھا بس تنگ
کہ تن سے اس کے بستر پر چُھوا رنگ

۱- نسخہ لکھنؤ : سو ہے روئے زمیں -

غرض یوں نازنیں تھی سر سے تا پا
کہ شب باشی میں گل جاتا ہے مرجھا
یوں خمیازہ سے بس جاتا ہے منہ کھل
نسیمِ صبح سے غنچہ ہو جیوں گل
اٹھا کر ہاتھ انگڑاتی تھی وہ ماہ
گویا لیتی تھی بحرِ حسن کی تھاہ
یہ دیکھ اس کی مصاحب اور ہمدم
کنائے سے غرض آپس میں باہم
کوئی گا کر سہاگ اس کو سناتی
کہوں کیا میں کہ گھونگٹ میں ہنساتی
کوئی منہ دیکھ اس کو مسکراتی
مقابل کوئی آئینہ دکھاتی
فدا ہو کر کوئی اس نازنیں پر
جاتی تھی کوئی ٹیکا جبیں پر
کوئی کہتی ذرا تو اپنا منہ کھول
تجھے میری قسم اے غنچہ لب بول
تھی سرگرمِ شرارت ہر پری رو
ولے وہ شرم سے تھی سر بہ زانو
وہ ماں اس گل کی جس دم پاس آئی
تو دیکھ اس کو نہ پھر پھولے سمائی
بدن اس کے پہ بعضا جو نشاں تھا[1]
کہوں کیا میں سہاگ اس کا عیاں تھا

۱- نسخہ لکھنؤ میں ردیف "تھے"۔

بنا کر پینڈیاں میوے کی وہ گول
اور اس کے ساتھ بانٹا سب کو لتبول
سوا اس کے جو رسمیں اور بھی تھیں
کہوں کیامیں غرض اک اک وہ سب کیں
دولھن کو لے گئیں حمام میں سب
کہ برجِ حوت میں جھوں آئے کوکب
دیا غسل اس طرح اس گلبدن کو
کہ جیسے آب سے تازہ چمن ہو
بدن پر تھا یہ بس پانی کا عالم
کہ برگِ گل پہ جیوں قطراتِ شبنم
ٹپکتے تھے یہ قطرے موئے سر سے
سحردم جس طرح سے ابر برسے
کھلے بالوں میں چہرہ یوں نظر آئے
گھٹا میں جس طرح بجلی[1] چمک جائے
گرا بالوں سے جو پانی زمیں پر
کہے تو تھا وہ عطرِ مشک و عنبر
نہائی بس کے جتنے پانی میں تھی
ہوا پانی وہ سب عطرِ سہاگی
ز بس خوشبو سے وہ حمام سارا
بیاں کیا کیجے شیشہ عطر کا تھا
نہا دھو کر وہ توشہ خانہ[2] میں آ
لباسِ نو عروسی اور منگوا[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : گھٹا سے جیوں مہ تاباں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : جامہ خانہ ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : سلوا ۔

کر اس کو سر سے پا تک زیبِ قامت
بنی گویا سراپا اک قیامت
رکھا بس کشتیوں میں لا کے زیور
کہ کیجے زیبِ تن ہووے جو خوشتر
غرض پوشاک و زیور زیبِ تن کر
سرِ لو پھر بنی کی شکل بن کر
ز بس آئی نکل یوں واں سے یک بار
قمر جیوں برجِ آبی سے نمودار
ہوئی آراستہ ایدھر وہ مہ رو
دی[1] آرایش ادھر خلوت سرا کو
کہ جو فرش و فروش اس جا بچھا تھا
اٹھا کر اس کا تھا اندر بچھایا
پلنگ اک سونے کا دلچسپ لا کے
بچھایا ان کی آسایش کو جا کے[2]
قرینے سے وہ مسند تھی بچھائی
مکاں کی شکل جنّت کی بنائی
جو تھا اسباب اس خلوت کا درکار
کیا سب موقع موقع جا کے تیّار[3]

۱- نسخہ مصطفائی و دیگر : کی - موجودہ صورت نسخہ لکھنؤ میں ہے اور زیادہ موزوں ہے -
۲- نسخہ لکھنؤ : اس شعر کے بعد ایک شعر زائد ہے :
مرصع اک پلنگ سونے کا لا کے
بچھایا ان کی آسائش کو جا کے
۳- نسخہ لکھنؤ : رکھا سب موقع موقع جا کے اک بار

غرض اسباب جب سب کچھ بنایا
پدم کو اس مکاں میں پھر بٹھایا
تھی واں رونق فزا وہ غیرتِ شمع
پتنگ آسا مصاحب گرد سب جمع
ولے اس بِن تھا اس کے دل میں یہ سوز
ملے کب مجھ سے وہ ماہِ دل افروز
تصور میں اسی کے وہ پری رو
تھی بس خاموش بیٹھی سر بہ زانو
کوئی ہمدم جو بولے تو وہ بولے
نہیں تو شرم سے منہ کو نہ کھولے
غرض تھیں ہمدمیں اس کی جو چالاک
دیے ہر اک کو زیور اور پوشاک
جواہر کی ہزاروں کشتیاں دیں
کہ وہ اس کی رفاقت میں بجاں تھیں
رتن یاں غسل فرما، پہن خلعت
کہ تھا وہ رشکِ مہ اک مہرِ طلعت
مصاحب اس کے بھی ہمراہ جو تھے
سو گھوڑے اور جوڑے سب کو بخشے
سبھوں کو پھر طعام و خاصہ کھلوا
ہوا سمتِ محل تشریف فرما
گھڑی اک بیٹھ کر اپنے خسر پاس
پھر آیا جس مکاں میں اس کی تھی ساس
سلام و کورنش تسلیم اے یار
جو ہیں آدابِ راجانِ جہاں دار

بجا لایا مودب ہو کے یک یک
کہ اس کو دیکھ کر سب منہ رہے تک
وہاں پھر آیا وہ رشکِ پری زاد
جہاں تھی وہ صنم حسنِ خدا داد
عجب عالم میں عالم اس کا دیکھا
کہے تو ہو گیا آنکھوں کو سکتا
یہ سر سے تا قدم تھا حسنِ زیور
نظر خورشید کی ٹھہرے نہ جس پر[1]
لباسِ نو عروسانہ وہ رنگیں
کہ جس سے حسن دہ چند اور تمکیں
نہ تھی کچھ احتیاجِ حسنِ زیور
ہر اک اعضا تھا اس کا جس سے بہتر
صفائی تن نہ میلی ہو نگہ سے
نگہ زیور سے پہلے پاؤں ہوجے[2]
غرض آ کے یہ بیٹھا پاس خاموش
کہ اس کے اڑ گئے تھے دیکھ کر ہوش[3]
ولے اس کا بھی یہ عالم بنا تھا
کہ تھا یہ حسن کا شعلہ سراپا
پدم کو شرم تھی گو ہمدموں کی
ولے گھونگھٹ سے دزدیدہ نگہ تھی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: یہ مصرع اس سے تیسرے شعر کے مصرع ثانی سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ: شعر ندارد۔
۳۔ نسخۂ لکھنؤ: شعر ندارد۔

یہ مکھڑا اس کا گھونگٹ سے نمایاں
کہ جیوں ابرِ تنک میں مہرِ تاباں
یہ دیکھ اس کی وہ ہمزادانِ با ہوش
کہ ہونے سے ہمارے ہیں یہ خاموش
نہ آپس میں اشارہ اور نہ تقریر
بہم بیٹھے ہیں دونوں شکلِ تصویر
طعام و خاصہ دونوں کو کھلا کے
چلی آئیں انھیں تنہا بٹھا کے
مکاں خالی انھوں نے جبکہ پایا
بیاں کیا کیجے ان میں پھر ہوا کیا
کیے جو جو مزے دونوں نے باہم
کہا جاتا نہیں بولیں سو کیا ہم
اسی صورت رہے پھر روز و شب وہ
بہم خوش حال مصروفِ طرب وہ
اٹھائے جس لیے تھے درد اور رنج
ملے سو چین و راحت کے انھیں گنج
جنھوں نے ساتھ اس کا تھا لبایا
انھیں بھی دھوم سے پھر واں بیاہا
غرض اک سال اس جا یوں رہا وصل
کہ کس کس چین سے گزرے انھیں[1] فصل
کہ جب ہنگامِ سرما سر پہ آیا
بہم دونوں نے کیا کیا چین پایا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : گزری ہر اک ۔

وہ رہتی کو ہر اک خلوت سرا گرم
بچھے وہ فرشِ مخمل جابجا نرم
لباسِ پنبئی اقسام اقسام
سبھوں کے زیبِ قامت بہرِ آرام
ہر اک پوشاک تحفہ ریشمی تھی
کہوں کیا میں کہ واں کس کی کمی تھی
ہزاروں پارچے اپنے وطن کے
نئی پرداز کے چین اور دکن کے
دوشالے کھینچے نقشوں کی وہ تصویر
ہوں جن کو دیکھ حیراں اہلِ کشمیر
ز بس رنگین شالی ہر رزائی
جنھوں کی ملک سرما میں دہائی
رتن نے یہ دیا اپنوں سبھوں کو
پدم نے اپنی محرم ہمدموں کو
گئی سردی ہوا گرمی کا موسم
بیاں کیا کیجیے اس کا تم سے عالم
کہ خاطر خواہ خسخانے سجائے
تلے اُن کے یہ تہ خانے بنائے
کہ جن کو دور سے یہ دیکھ پاوے
دل و دیدہ کو بس آرام آوے
یہ فرش صندلیں ہر جا بچھایا[1]
کئی من جس میں عطرِ خس لگا تھا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: بچھا تھا ــــ لگا تھا۔

بچھائے شمع تہ خانوں کے اندر
لگائے جابجا تھے لعل و گوہر
رہیں روشن وہ مثلِ شمعِ کافور
حرارت جن کی آب و رنگ سے دور
گلاب ایسا بھرا حوضوں میں تھا سب[1]
کہ جامِ چشمِ عاشق جیوں لبالب
وہ فواروں کے ہردم جوش بھرنے
وہ چھٹنا چادروں کا اور جھرنے
جو دیکھے سو کہے ہے یہ طلسمات
کہ یاں باہم ہیں جاڑے اور برسات
ہزاروں جا یہی عالم مکاں کا
گویا نقشہ تھا وہ باغِ جناں کا
رہے اس جا غرض وہ خرّم و شاد
بسانِ حور و غلماں شاد آباد
تو سنّل میں دولھن دولھا کے جو تھے
انھوں کو بھی مکاں ایسے ہی بخشے
ہؤا برسات کا موسم نمایاں
کیا ایدھر انھوں نے اور ساماں
مکانوں میں بچھائے فرشِ رنگیں
کہ جن کے عکس سے ہو عرش رنگیں
بلندی میں مکاں جو تھے ہوادار
کیے رہنے کو اپنے پھر وہ تیّار

۱- نسخہ' لکھنؤ : نہروں میں بس سب -

چھتیں ، پردے لگائے سرخ ہر جا
کہ ہے برسات میں عالم یہ بھاتا
برسنا مینہ کا ، عالم گھٹا کا
نہیں تحریر میں آتا لکھوں کیا[1]
کہ ہے کالی گھٹا اودھر کو چھائی
جھڑی یاں مینہہ نے ہھکی لگائی
ہری رویوں کی ایدھر سبز پوشاک
برنگِ برق ہر اک چست و چالاک
وہ خانہ باغوں میں جو سیر کرنا
وہ بالا خانوں سے گاہے اترنا
کروں کیا واں کا عالم تم سے اظہار
کہ تھی کس لطف سے بس سیرِ گلزار
گلستاں سبز تر فیضِ ہوا سے
زباں کو تازگی جس کی ثنا سے
خیابانِ چمن یہ سبز و شاداب
طراوت سے ہو جس کی چشم سیراب
درختوں کی وہ سبزی ، سرخ وہ گل
گویا لعل و زمرد کے ہیں بالکل
جدھر دیکھوں زمیں سرسبز یک دست
جھکا چاروں طرف ابرِ سیہ مست
ترشح گاہ کم ، کہ شورِ باراں
صدائے رعد باہم ، برق رخشاں

۱- نسخہ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم مؤخر ہیں ۔

ہوائے سرد خوش بُو اور ملائم
اُڑا دے دل سے بس یک لخت جو غم
چمن میں جا بجا رنگیں ہنڈولے
کہ جی میں آپ کو نت حسن تولے
برنگِ لالہ بنگلہ وہ سراپا
اور ان پر موقع موقع کارمینا
بناتی ان کے پردے سرخ رنگیں
سراسر گرد جن کے کارِ زریں
ہزاروں جانور دستاں سرا کے
لٹکتے گرد ان بنگلوں کے پنجرے
غلاف ان کے ہزاروں رنگ در رنگ
کہ نیرنگِ فلک ہو دیکھ کر دنگ
صدائے طوطیانِ سرخ منقار
برنگِ تیر بس چھاتی کے ہو پار
فصیلوں پر بہم طاؤس رقصاں
صدا سے جن کے گونجے ہے گلستاں
پپیہوں کی صدائیں وہ پیا پے
کہ پی پی کی بندھی ہے ان کی اک لے
سیہ بادل میں بگلوں کی قطاریں
کہیے تو آبِ حیواں کی ہیں دھاریں
مکاں لاکھوں بلند و پست ایسے
انیس و ہمدم دولہا دولہن کے
رہے ان میں بہم سب سیر کرتے
دمِ خدمت گزاری آن کا بھرتے

جدھر دیکھو قدم تک سر سے لے کر
کسی کی چھچھی[1] پوشاک اکثر
کوئی پہنے ہے اودی، سرخ پوشاک
اور اس میں آب جیسے برقِ چالاک
کسی کا رنگ ملبوس سنہری
کسی کی زرد پوشش شوخ گہری
کسی کا ہے لباسِ سبز دھانی
کہ جس سے سبز ہو باغِ جوانی
باہں عالم ہدم کی سب یہ ہمدم
رہیں خدمت میں حاضر شاد و خرّم
دولھن دولھا جہاں چاہیں رہیں واں
کہ تھے سب آن کی خاطر باغ و بستاں
بہم دولھا دولھن نے ہر سحر شام
کیے کس کس طرح سے چین و آرام
مجھے رہ رہ کے یاں حیرت ہے آتی
کہ ظاہر ایسی ہے قدرت خدا کی
کسی کو خوش تھی سیرِ باغ اور گل
کسی کو باغِ گل ہے داغ اور گل
کسی جاگہ بہارِ بوستاں ہے
کسی کو پھر وہی عالمِ خزاں ہے
یہی عالم بھی ہر شام و سحر ہے
کوئی خنداں ہے، کوئی نوحہ گر ہے

۱- نسخہ لکھنؤ: بسنتی چنبئی۔

اسی میں یہ جو ہے برسات آئی
کہیں بارش کہیں آتش لگائی
بیاں کیا کیجے اس مجمل[1] کی تفسیر
ہے اس احوال کی یہ جائے تقریر

لاکمت رانی کا یادِ رتن میں صحرا کو جانا اور
اپنا حالِ پُر ملال بھنگم نامی طائر کو سنانا

وہ ہنستا مسکرانا اس کا جس دم یاد آتا ہے
تو پھر وہ یاد آنا ہچکیاں لے لے رُلاتا ہے

الا اے ساقیِ یارِ غریباں
انیس و ہمدمِ آفت نصیباں
پلا دے مجھ کو وہ اک جام لبریز
ہو جس سے آتشِ دل اور بھی تیز
بس اب یاں سے دبیرِ طبع اپنا[2]
لکھے ہے داستانِ وحشت افزا
کہ یعنی ہو کے جوگی جب وہ راجا
لیے ہمراہ لشکر جوگیوں کا
ہوا تھا سوئے سنگلدیپ رخصت
اٹھا کر یار کی[3] دل سے محبت
یہاں تھی اک جہاں پر بے قراری
تھی جیوں دریا سبھوں کی اشکباری

۱- نسخۂ لکھنؤ: مبہم -
۲- نسخۂ لکھنؤ: طبع زیبا -
۳- نسخۂ لکھنؤ: اٹھا گھر بار کی -

ولے رانی کا اس کے کیا کہوں حال
کہ اس کا تھا یہاں تک تنگ احوال
کہ اس نے مثلِ گل اپنا گریباں
کیا تھا چاک لے کر تا بداماں
جگر تھامے ہوئے غمگین و بے تاب
پھرے تھی لوٹتی مانندِ سیماب
یہ تھی پُرجوش اس کی چشمِ گریاں
کہ ہر گوشے میں اس کے لاکھ طوفاں
کبھی وحشت میں آ باہر نکلتی
اٹھا کر خاک کا ہے منہ پہ ملتی
کبھو زانو پہ سر رکھ کے وہ ناچار
کسی جا بیٹھ رہتی شکلِ بیمار
کبھی منہ ڈھانپ اپنا وہ روتی
تڑپتی اور بلکتی ، جان کھوتی
کبھی دیوانہ ساں بکتی وہ دل گیر
کبھی خاموش رہتی مثل تصویر[1]
کبھی مقنع سے اپنا منہ چھپا کے
بیاں کرتی تھی یوں آنسو بہا کے
جلا کے مجھ کو غم سے مثل دھونی
گئے جوگی منڈھی کیوں کر کے سونی
نہ دیکھا نہ سنا ہے جوگ ایسا
کہ جوگی چھوڑ دے جوگن کو تنہا

۱- نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس کے بعد کا شعر مقدم مؤخر ہیں ۔

بسانِ آئینہ وہ خاک لے کر
بھبھوت اپنے ملے تھی تن کے اوپر
کبھو بے تاب ہو کر در پہ آتی
جگر تھامے ہوئے پھر گھر میں[1] جاتی
بسانِ مہر جلتی تھی وہ بے تاب
برنگ ماہ ہر شب بے خور و خواب
اسی غم سے کہ تھی[2] حیران و نالاں
ہوئی شامِ وطن شامِ غریباں
اسے ازبس کہ دے کر غم گئے تھے
کہوں کیا میں کہ جوگی رم گئے تھے
غرض اس کی جدائی میں شب و روز
گزرتی تھی نہایت باغم و سوز
خیال اک دن یہ اس کے جی میں آیا
کہ دل بہلاؤں اپنا باغ میں جا
تصوّر دل میں کر قدِّ رتن کا
تماشا دیکھیے سروِ چمن کا
عذار و لعل نوشیں یاد کر اب
گل و غنچہ سے کہیے دل کا مطلب
نظر آتی نہیں چشمِ رتن سین
تو دیکھوں چشمِ نرگس کو میں بے چین
جو یاد آوے گی وہ زلف پریشاں
تو سنبل پر کروں گی جان قرباں

۱- نسخۂ لکھنؤ : پھر پھر ہے ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : گھڑی ۔

چمن میں جا کے اپنی داستاں میں
کروں سب جا کے سوسن سے بیاں میں
یہ جی میں ٹھان کر وہ غیرتِ باغ
برنگِ لالۂ گلشن لیے داغ
محل سے آئی گلشن میں خراماں
کیے مانندِ گل ٹکڑے گریباں
زبس غم سے وہ سرگرمِ فغاں تھی
کہے تو عندلیبِ بوستاں تھی
غرض آئی تھی بہلانے کو وہ دل
ہوئی سو آ کے دونی مرغِ بسمل
قد اس کا یاد کر وہ رشکِ شمشاد
ہوئی سو اور بھی واں گرمِ فریاد
جو دیکھیں سو بسو نہریں وہ جاری
تو پھر کرنے لگی وہ اشک باری
کسی سائے تلے ہو کر نکلتی
چنار آسا کفِ افسوس ملتی
قریبِ سرو[1] پھر پھر کے جو آتی
تو لاکھوں سرو آہوں کے نباتی[2]
پھرے تھی باغ میں بس جابجا وہ
بسانِ قمریاں کُو کُو سرا وہ
یہ آہیں کھینچتی تھی وہ مشوّش
فلک پر پہنچتی تھی جس کی آتش

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : سبزہ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : تو لاکھوں اشک لوہو کے بہاتی۔

یہ گرمی اُس کی آہوں سے تھی پیدا
کہیے تو باغ سارا جل گیا تھا
جلے تنہا نہ کچھ گل اور شجر تھے
کبابِ سوختہ ہر جانور تھے
گئی اس دم جو واں سے سوئے صحرا
نسیمِ سرو واں کی راحت افزا[1]
حرارت اس میں تھی بس یہ سمائی
کہ جس نے آگ صحرا کو لگائی
برنگِ غنچہ ہو گلشن سے دل تنگ
چلی صحرا کی جانب کر کے آہنگ
بگولے کی طرح وہ مضطرب حال
پھرے تھی بس غمِ اُلفت کی پامال
یہ آتش اُس کی آہوں سے تھی پیدا
کہ جس سے دشت سارا جل گیا تھا
ہوا سرکش جو دودِ آہ اُس کا
سو اب تک ہے سیہ گردوں سراپا
سوائے سیلِ اشکِ چشمِ گریاں
طپش سے اس کے دریا خشک تھے واں
چنار آسا کفِ افسوس مل مل
جلاتی آتشِ غم سے وہ جنگل
جو تھے وحش و طیور اس دشت میں واں
شرارِ آہ سے تھے اس کے بریاں

۱- نسخۂ لکھنؤ: شعر کے مصرعے مقدم مؤخر ہیں۔

انھوں میں ایک طائر باد پیما
بھنکم نام، تھا اس جا پہ بیٹھا
نہایت دیکھ اس کو مضطرب حال
لگا یوں کرنے استفسارِ احوال
تو اے دل سوختہ ہے کون آئی
کہ آتش تیری آہوں نے لگائی
تجھے کس کا الم ہے اے غم اندوز
کہ پیہم کھینچتی ہے آہِ جاں سوز
خدا کے واسطے اے ماہ پیکر
بتا کس کا ہے تیرے داغ دل پر
تو اے خانہ نشیں ہے دشت پیما[1]
بنایا کس نے کہہ یہ حال تیرا
تو اے لیلیٰ روش باروئے کلگوں[2]
ہوئی آوارہ کیوں مانندِ مجنوں
ہے جیوں فرہاد کس کے غم سے غمگیں
جو یوں کھوتی ہے اپنی جانِ شیریں
تجھے گردوں نے کیا آفت دکھائی
جو تو نے اپنی یہ حالت بنائی
کسی ظالم نے تجھ کو یا ہے لوٹا
جو تجھ سے ہے ترا گھر بار چھوٹا
کسی کی ہے تو عاشق اے پری زاد
کہ اس کے غم سے ہے تو جاں ناشاد

۱۔ نسخہ لکھنؤ: بادہ پیما۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ: مہ روئے کلگوں۔

کوئی پردیس کو تیرا گیا ہے
طلب اس کی تجھے اب جابجا ہے

مجھے احوال اپنا کہہ تو سارا
بجا لاؤں جو مجھ سے ہو سکے گا

کلامِ طائرِ دل سوز سن کر
فدا کر آنسوؤں کے اس پہ گوہر

لگی کہنے کہ اے مرغِ وفادار
کہوں کیا تجھ سے اپنی حالتِ زار

ز بس ناگفتنی ہے حال میرا
نہ مجھ سے پوچھ کچھ[1] احوال میرا

وہ آتش ہے مرے سینے میں[2] سوزاں
بیاں کیجے تو ہو اک خلق بریاں

یہ آتش کیونکہ میرے دل کی جاوے
مگر اللہ ہی اس کو بجھاوے

کروں شکوہ میں کیا بختِ سیہ کا
بدولت جس کی ایسا روز دیکھا

یہ حالت اپنی جو مجھ پر عیاں ہے
سو باعث اس کا میری ہی زباں ہے

زباں ہے میری، میری دشمنِ فال
کہ یاں تک جس سے پہنچا میرا احوال

۱- نسخہ لکھنؤ : کہہ -
۲- نسخہ لکھنؤ : پہلو میں -

یہ میری ہے کہانی کر اسے غور
کہ اک ہے شہر اس جا[1] نام چتّوور
عجب نقشے کا وہ دلکش مکاں ہے
نمونہ جس کا اک باغِ جناں ہے
وہاں کا ایک راجہ ہے رتن سین
جہاں کے دل کو جس سے راحت و چین
سراپا حسن میں رشکِ پری زاد
غرض حسنِ مجسّم ہے خدا داد
کوئی ثانی نہیں اس ماہ[2] رو کا
زبس ہے حسن و خوبی میں بھبھوکا
فراغت سے تھا اس کا ملک میں راج
کوئی بستی میں اس کی تھا نہ محتاج
کہ ناگہ ایک دن واں اک برہمن
بظاہر دوست پر باطن میں دشمن
لیے ہمراہ اپنے ایک طوطا
بہت خوش رنگ زیرک اور دانا
وہ طوطا تھا قیامت بس کہ طرّار
نہایت دل فریب اس کی تھی گفتار
ہوا بس سن کے راجہ اس کا مشتاق
کہ طائر ایسے کم ہوویں بہ آفاق
دیا اس برہمن کو مال اور زر
غرض شاداں ہوا طوطے کو لے کر

۱- نسخۂ لکھنؤ : رنگیں -
۲- نسخۂ لکھنؤ : شمع رو کا -

ز بس وہ طائرِ شیریں نوا تھا
رتن کا بس مصاحب وہ بنا تھا
نہ اک دن دیکھتا اس کو رتن سین
تو ہوتا تھا نہایت سخت بے چین
ہوا موقوف اس پر اس کا جینا
کہ اس بن خوش نہ تھا کھانا و پینا
ہوئی اک واردات اک روز ناگہ
محل میں چھوڑ اس طوطے کو وہ ماہ
ہوا تھا سوئے صحرا عازمِ صید
کہ ہے بس دل کشا نخچیر کی قید
قفس یاں طائرِ شیریں نوا کا
کہوں کیا میں کہ اک جانب رکھا تھا
میں اس کی رانیوں میں بس تھی ممتاز
بصد عیش و طرب رہتی سر افراز
سو اس دن میں نے اپنے تئیں سنوارا
زمیں پر جیوں پری کا ہو اتارا
نہا دھو کے بنی ایسی میں اس روز
کہ جیسے کوئی دولھن ہو دل افروز
لباسِ فاخرہ کر زیبِ قامت
مرصّع پوش سر تا پا قیامت
منگا کر آئنہ با روئے شاداں
ہوئی میں حُسن اپنا دیکھ حیراں
غرورِ حُسن میں آ کر میں یک بار
لگی طوطے سے کرنے جا یہ تکرار

کہ اے شیریں نوا و دشت پیما
کہیں دیکھا ہے کوئی تو نے مجھ سا
سنا کرتے تھے سنگلدیپ کو ہم
کہ واں کا حسن ہے آشوبِ عالم
برابر میرے کوئی ہے وہاں پر ؟
جو تو نے دیکھا ہوا[1] مجھ سے بیاں کر
یہ سن کر وہ پرندہ غارتِ ہوش
ہوا جیوں طائرِ تصویر خاموش
نہ چپ رہنا ہوا مجھ کو گوارا
کہا میں نے اسے پھر یہ دوبارا
جواب اس بات کا دے جلد مجھ کو
وگرنہ مارتی ہوں اب میں تجھ کو
یہ سن کر ہنس پڑا وہ فتنہ انگیز
ہوئی میں مثلِ آتش اور بھی تیز
لگا تب کہنے جس کے پاس میں تھا
ترے منہ سے ہے بہتر پاؤں اس کا
نہیں ہے کوئی جگ میں اس کا ثانی
تجھے کیا نسبت اس سے اے دوانی
یہ سن کر آ گیا میرے تئیں عرق[2]
کہ بس بحرِ ندامت میں ہوئی غرق
ندامت اک طرف یہ مجھ کو سوجھی
کہے راجہ سے گر یہ بات اس کی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : اگر دیکھا ہو تو ۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ سن کر پاؤں سے لے کر میں تا فرق ۔

اسے من کر یہ اپنی جان کھووے
تو بس یاں قول جامی راست ہووے

"نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

در آید جلوۂ حسن از رہِ گوش
ز جاں آرام برباید ز دل ہوش"

نکل جاوے جو جوگی ہو رتن سین
تو پھر معلوم ہیگا[1] راحت و چین

یہ جی میں سوچ کر میں نے[2] خفا ہو
کہا فی الحال پس اپنی ددا کو

کہ اس کم بخت فتنہ گر کو فی الحال
کسی گوشے میں جا پاؤں سے مل ڈال

اگرچہ دائی سمجھاتی مجھے تھی
ولے بھڑکی تھی اک آتش غضب کی

مرے آگے سے لے دائی نے جا کر
حویلی میں رکھا اس کو چھپا کر

کہا مجھ سے کہ اس کو مار ڈالا
بلائے خانہ کو گھر سے نکالا

رتن باہر سے جس دم گھر میں آیا
نظر کے سامنے طوطا نہ پایا

۱- نسخۂ لکھنؤ : سب کا - نسخۂ ممتاز المطابع : ہوگا -
۲- نسخۂ لکھنؤ : اپنے -

اُڑا فی الفور[1] اس کا طائرِ ہوش
ہوا دریائے غم یک بار پُرجوش
کچھ اپنے دل ہی دل میں سوچ راجا
لگا کہنے کہ 'ہیرامن' ہوا کیا
کہا میں نے کہ وہ کم بخت طوطا
مرے آگے بدی تیری کرے تھا
مجھے بھی کچھ کہے تھا ناسزاوار
سو ہاں میں نے اسے ڈالا یہاں مار
یہ کہنا کیا تھا بس ہو پُر غضب وہ
لگا کہنے بصد رنج و تعب وہ
کہ طوطے کو مرے جلدی منگاؤ
وگرنہ ہے جہاں واں تم بھی جاؤ
جو 'ہیرامن' کو پاؤں گا نہ میں زار
تمھیں جیتا نہ چھوڑوں گا خبردار
سنے کلمات جوں ہی سخت اس سے
کہے 'تو اڑ گئے تھے میرے طوطے
کہا تب میں نے راجہ سے کہ اے ماہ
میں دیکھی تھی تمھاری الفت و چاہ
منگا دیتی ہوں میں طوطا تمھارا
ہوا معلوم ہم سے ہے وہ پیارا
گئی تب دائی کے گھر میں[2] میں دلریش
کہا سب واقعہ آیا جو درپیش

۱- نسخۂ لکھنؤ : فی الحال -
۲- نسخۂ لکھنؤ : پاس دائی کے -

وہ بولی ، سن مری غم گیں کہانی ؟
کہا تھا تم سے میں آگے ہی رانی
کہ یہ طوطا ہے بس راجہ کو مرغوب
نہیں غصے میں اس کا مارنا خوب
مری اس بات میں اب کیا ہے تقصیر
بتاؤں کیا تمھیں میں اس کی تدبیر
پھر آخر رحم کھا دائی نے مجھ پر
کہا جیتا ہے طوطا ، خوف مت کر
غرض وہ لا دیا طوطا ددا نے
بچایا جان سے مجھ کو خدا نے
رتن نے پھر تو اس طوطے سے پوچھا
کہ اے آرامِ جاں کیا تجھ پہ گزرا
کہا ہو نا کمت نے جو، کہ تجھ سے
بلا وسواس ظاہر کر تو مجھ سے
کہوں کیا قصہ کوتہ میں دوبارا
کہا راجہ سے اس نے حال سارا
پدم کی خوبیاں ساری سنائیں
غرض گھر کھونے کی باتیں سجھائیں[1]
پدم کے عشق نے آنکھیں دکھائیں
جو میں سوچی تھی باتیں پیش آئیں
غرض جب عشق اس کے دل میں آیا
تو اس نے آپ کو جوگی بنایا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : بتائیں۔

جہاں اک ساتھ میں جوگی ہوا ہے
طلب میں اس کی جب سے وہ گیا ہے
گیا سنگل کو وہ جوگی ہو جب سے
نہیں معلوم کچھ احوال تب سے
وہ آوارہ ہے جب سے مثلِ مجنوں
میں اس کے غم میں سو جوگن ہوئی ہوں
بھنگم نے سنا یہ حالِ مارا
زمیں پر اپنی سر کو ووہیں مارا
کہا اچھا کہ[۱] نامہ لکھ، میں جاؤں
جوابِ نامہ تیرا اس سے لاؤں
زبانی اس کے لاؤں سب میں پیغام
کہ دل کو ہو ترے صبر اور آرام

ناگمت کا نامہ رتن سین کے واسطے لکھوانا اور اپنا
بروگ بارہ ماسہ میں سنانا

کسی صورت سے نامہ اس کو پہنچا دے یہ کہتی ہے
جو کوئی ناگمت کے حال پر کچھ رحم کھاتا ہے
دے اے ساقی مجھے وہ جامِ مینا
جسے پی کر لکھوں خط ناگمت کا
من آس طائر سے دل سوزی کی تقریر
کیا یہ نامۂ جاں سوز تحریر
رفیقِ دستگیرِ جانِ ناشاد
رتن! شاداں سلامت دائما باد!

۱- نسخۂ لکھنؤ : تو ..

پس از عرضِ نیاز و صد تمنا
برائے روشنت بادا ہویدا!
کہ اے تاراجِ تو ہوش و قرارم
پریشان کردہ ای تو روزگارم
گیا ہے جب سے تو اے راحت جاں
نہیں آرام و تسکیں مجھ کو اک آں
برنگِ لالہ ہوں میں داغ بر دل
ہے دردِ دل سے دم لینا بھی مشکل
ترے بِن اے گلِ باغِ جوانی
پھروں ہوں[1] مثلِ بلبل میں دوانی
جو یاد آوے ہے تیرا سرو قامت
تو مجھ پر ہوتی ہے برپا قیامت
جدائی کا ترے جب سے ہے آزار
ہوئی جیوں نرگسِ گلشن میں بیمار
نظر آتا ہے تجھ بِن جو مجھے باغ
ہزاروں دل پہ پڑتے ہیں مرے داغ
نہیں میں دیکھتی ایسا وہ گلزار
کہ ہووے دل نہ میرا جس سے پُرخار
فزوں ہے دم بدم اب بے قراری
بسانِ آب جُو ہے اشک جاری
لیے پھرتی ہوں میں وہ چشمِ پُرخوں
ہر اک قطرہ ہے جس کا رشکِ جیحوں[2]

۱- نسخۂ ممتاز المطابع : پھری ہوں۔
۲- نسخۂ لکھنؤ میں تواق : چشمِ حیراں ـــ رشک ہے خواں۔

گیا تو بن کے جب سے شکلِ جوگی
میں جوگی ہوں ترے غم کی بروگی
کوئی کرتا بھی ہے کام اس طرح کا
کیا اے بے مروّت تو نے جیسا
گئے جوگی ہزاروں ساتھ جیسے
مجھے بھی ساتھ لے جاتا تو[1] ویسے
خیالِ غیر سے واں تو ہم آغوش
یہاں میں مرگ سے ہوں دوش بر دوش
ہے تو ہمراہ اوروں کے بہ گلزار
میں خارِ رشک سے مجروح، افگار
کیا تو نے مجھے دل سے فراموش
یہاں میں یاد سے تیری ہم آغوش
وہاں تو غیر سے با روئے خنداں
میں یاں تجھ بن سدا با چشمِ گریاں
طبیبِ غیر واں تو، یاں میں بیمار
حبیبِ غیر تو، میں عاشقِ زار
تو بزمِ غیر میں آس جا قدح نوش
شرابِ غم سے تیری یاں میں بے ہوش
ہوا اغیار کا تو تاجِ سر واں
سراپا مثلِ مجنوں یاں میں عریاں
انیسِ وقت میرا ہے الم یاں
جلیسِ بزم تیرا کون ہے واں
ہوا ہے جب سے تو اودھر کو راہی
میں ہوں جیوں گردبادِ دشت راہی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: لے جاتا مجھ کو بھی ہمراہ۔

خدا جانے تجھے کس نے لبھایا
کہ تو نے دل سے مجھ کو یوں بھلایا

بارہ ماسہ

کہوں کیا جب اساڑھ آیا شتابی
پڑی دل پر مرے برقِ خرابی
کہ ان روزوں میں پردیسی ہیں آتے
سفر سے آ کے صورت ہیں دکھاتے
صدائے رعد ہر سُو ، ابر برسے
ولے تجھ بن کہوں کیا جی ہے ترسے
چمک بجلی کی تھی[1] مجھ کو ڈراتی
تھی جان و دل میں اک آتش لگاتی
نہ آیا اس مہینے میں بھی تو پاس
رہی ساون میں تو بھی آنے کی آس
کہ شاید اب بھی آ جاوے تو آوے
شرارِ درد و غم میرا بجھاوے
رہی میں منتظر اس میں شب و روز
برنگِ برقِ سوزاں وحشت اندوز
تھیں جو سکھیاں ہمارے ساتھ والیں
پہن کرتا لباسِ سرخ آئیں
ہماری چشم نے رینی چوآئی[2]
سو اشکِ سرخ میں پوشش رنگائی

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : ہماری چشم کی رینی چو آئی -

ہنڈولوں پر چڑھیں جھولیں سب عورات
ولے تجھ بِن میں ڈانواڈول ہیہات
پہنچتی آڑ کے تیرے پاس خوش حال
اگر پاتی کسی صورت پر و بال
گرج کر جب کہ بھادوں سر پر آیا
کہوں کیا میں کہ کیا کیا دکھ دکھایا
گئی وہ دل سے تھی جو آس باقی
نہیں ہے اب یہاں ہونا ملاق[1]
گھٹا کالی اور اس میں برق رخشاں
فقط میں اور شبِ تاریکِ ہجراں
نظر چاروں طرف کرتی تھی رو رو
ولے دیکھا نہ میں نے آہ تجھ کو
کہوں کیا میں پپیہے کی صدائیں
دل و جاں میں مرے آتش لگائیں
صدا طاؤس کی کہیے نہ کیا تھی
تری فرقت میں اک آتش فزا تھی
اگرچہ آہ بھادوں خوب برسا
بجھی دل کی نہ میری آگ اصلا[2]
کنوار آیا گھٹا عالم میں چھائی
گویا فوجِ الم نے کی چڑھائی
صدائے کوکلا ، آوازِ کوئل
پکاریں جوں نقیبِ فوج ہرول

۱- نسخۂ لکھنؤ : کہ اس عالم میں ہوتا نہ ملاق -
۲- نسخۂ لکھنؤ : اگرچہ خوب برسا ماہِ بھادوں
بجھی کچھ بھی نہ میرے دل کی کچھ دوں

صدائے رعد ہردم یوں سناتا
کبھی تو طبلِ جنگی ہے بجاتا
لہ برسیں تھیں وہ بوندیں اور اولے
گھٹا مارے تھی مجھ پر تیر و گولے
چمک بجلی کی تھی ہردم ڈراتی
کبھی تو ہے گھٹا رنجک اڑاتی
دھنک تھی یا کماں تھی وہ نمایاں
کرے جو غم زدوں پر تیر باراں
جلاتی تھی ادھر کو برقِ رخشاں
مقابل تھی ادھر یہ آہِ سوزاں
صدائے رعد سے وہ تیر و بھالا
ادھر بارانِ اشک اور آہ و نالا
رہی برسات میں مجھ میں لڑائی
ولیکن تجھ کو میری سدھ نہ آئی
یہی کہتی تھی مل‌مل کے میں نت ہاتھ
کہ ہوتا موسمِ برسات بھر ساتھ
سو میرا غم کرے دل میں نہ آیا
کہ ایسا دور جا پردیس چھایا
و یا اس دیس میں جیدھر تو ہیکا
نہیں برسات کا موسم یہ ہوتا
نہیں ہوتی وہاں برسات کی دھوم
گھٹا آتی نہیں ہے واں مگر جھوم
پپیہے واں نہ بولے ہیں نہ طاؤس
نہ واں جگنو چمکتے ہیں صد افسوس

نہ ایدھر کی تجھے یا تو ہوس ہے
کسی کے پا تو در بندِ قفس ہے
بھلا اک عذر یہ بھی درمیاں تھا
کہ پانی لے زمیں تا آسماں تھا
نہ آیا سو تو کاتک میں بھی اے ماہ
رہی میں رات دن تکتی تری راہ
کہ تجھ بن سرد راتیں اور اجالی
تھی اے مہرو مجھے ہر رات کالی
وہ ٹھنڈی باد اور وہ چاندنی رات
ترے بن بدتر از دوزخ تھی ہیہات
ہوا حاصل نہ جب دیدار تیرا[1]
جہاں تھا میری نظروں میں اندھیرا
جہاں میں پھر ہر اک تہوار آیا
و لیکن تو نہ اے دلدار آیا
دوالی خلق میں ہر جا نمایاں
سراپا داغ میں سروِ چراغاں
اسی صورت غرض آ گھن بھی آیا
بڑھا کے رات جس نے دن گھٹایا
کٹے تھا گرچہ دن بھی مجھ کو مشکل
ہوئی دشوار کٹنی رات تل تل
ہوئی عالم کو سردی زیرِ افلاک
ولے تو بھی میں جل جل ہو گئی خاک

۱- نسخہ لکھنؤ: اس تھا مجھ کو میسّر تیر تیرا۔

ہؤا چلے کا جاڑا جب دوچنداں
ہوئی تجھ بن میں دونی اور سوزاں
کہوں کیا حیف ہے افسوس افسوس
کہ آ کھن دن گیا اور ساتھ یوں پوس
تری چھاتی سے میں لگ کر نہ سوئی
سدا روتے ہی اپنی عمر کھوئی
لگی جب برف پڑنے ماہ[1] آیا
سو اس نے اور بھی دونا جلایا
سبھوں نے پنبئی پوشش بنائی
مجھے غم نے ترے آتش لگائی
ہوئی جل جل طپش سے غم کی میں راکھ
مرے دم سے تھا ماہ و پوس بیساکھ
بسنت آئی[2] ہوا شاداں اک عالم
ولے دونا ہوا تجھ بن مجھے غم
بسنتی خلق نے پوشش ولگائی
پہ میں نے زرد سب صورت بنائی
شگوفہ دیکھ کر ہر جا شگفتہ
سلگتی دل میں تھی آتش نہفتہ
ہوا پھاگن کا جب ایام برپا
جلا آتش سے میری دشت سارا

۱- نسخہ لکھنؤ : مالگھ - شاید متن میں ''ماہ'' کا تلفظ پنجابی لہجے میں مانہہ کے مطابق ہے -
۲- نسخہ لکھنؤ : بسنت آیا -

سبھوں نے جگ میں تھی ہولی مچائی
مجھے غم نے ترے ہولی جلائی
ہر اک جا رنگ عالم میں تھا اور راگ
دل و دیدہ میں میرے خون اور آگ
عبیر اور قمقمے رنگ کے اڑاتے
مجھے مطلق نہ تجھ بن خوش تھے آتے
ہوئی جب چیت کی آمد نمایاں
ہلے پھولے سبھی برگِ درختاں
کشیدہ خط گلِ طغرا بہ طغرا
ز جرم کوہ تا میدان غبرا
ہوئے ٹیسو شگفتہ بن میں سارے
درختوں پر گویا پھولے انکارے
نہالِ انبہ پر پھر بور آیا
نہ تو سنگل سے پھر چتّور آیا
غرض بیساکھ میں بھی تجھ کو ترسی
کہ تھی مجھ پر فلک سے آگ برسی
یہ جلتی آتشِ غم سے تھی جاوید
کہ میری آگ سے جلتا تھا خورشید
ستارے عرش پر پھینکے یہ روشن
شرارِ آہ سے میرے ہیں روزن
طپش میری کہیں پہنچی ہے اک تل
سو اس سے ہے قمر کے داغ بر دل
جلا آتش سے میرے کوہ و صحرا
ہوئے سب خشک دجلہ اور دریا

جلایا چیت نے تو خوب آ کر
نہ آیا جیٹھ کا لیکن برادر
لگیں اٹھنے جو میری گرم آہیں
مسافر کی ہوئیں مسدود آہیں
ہوا بھی گرم اور سورج کا یہ روپ
ہے ٹھنڈی چھانو تجھ بن بدتر ازدھوپ
خدا جانے ترا کس جا ہے مسکن
ولے میں تو پڑی پھرتی ہوں بن بن
غرض جب لکھ چکی سوزِ نہانی
سوا اس کے کہا کچھ کچھ زبانی

فراق نامہ ناکمت کا پہنچنا رتن سین کے پاس اور تیاری سفر کی ہول دینا اس کا چتور کی طرف بے اندیشہ و وسواس

رہے بھولے ہوئے کس شہر بیگانہ میں اے عشرت
چلو اب ملکِ مالوفہ کی پھر[1] رغبت دلاتا ہے

بھلا ساقی مئے الفت کا اک جام
کہ آیا خانۂ اصلی کا پیغام
گدائی کر چکے اور بادشاہی
پر اب بہتر ہے ہونا گھر کو راہی
بھنگم نے لے اس نامہ کو فی‌الحال
تو بس پرواز کو کھولے پر و بال
پس از مدت وہ طے کر کوہ و صحرا
نواحِ شہرِ سنگلدیپ پہنچا

---

[1] - نسخۂ لکھنؤ : کو دل ۔

کروں کیا حسن اس صحرا کا تحریر
برنگِ صفحۂ رنگین تصویر[1]

رتن بھی اتفاقاً سوئے صحرا
پئے تسخیرِ آہو واں تھا نکلا

جو تھے اشخاص آئے اس کے ہمراہ
جدا ہو ان سے وہ یک بار ناگاہ

اسی سائے تلے آ کر لیا دم
کہ بیٹھا تھا جہاں آ کر بہنگم

وہیں تھے اس شجر پر طائرِ چند
ہوا سے واں کی خرّم اور خرسند

بہنگم سے وہ بولے نیک فرجام
کہ اے بھائی ہوئے تم کیوں سیہ فام

کہاں جاتے ہو اور آئے کہاں سے؟
نشاں دو ہم کو تم نام اور مکاں سے

کہا اس نے کہوں کیا تم سے احوال
کہ میرے گھس گئے اڑتے پر و بال

ہے مغرب سمت ملک ہند مشہور
کہوں کیا میں کہ یاں سے ہے بہت دور

۱- نسخۂ لکھنؤ میں مندرجہ ذیل دو اشعار اور بھی ہیں جو دوسرے کسی نسخے میں نہیں ہیں :

تھے اس صحرا میں چند اشجار باہم
لیا ٹک اس مسافر نے وہاں دم
چلا آتا تھا منزل سے وہ ناکام
لیا یک دم شجر پر بیٹھ آرام

ہے واں اک شہر رنگیں نام چتّور
ز بس سرسبز ہے فردوس کے طور
ہے مالک اس کا اک راجہ رتن سین
کہ وہ عشقِ پدم سے ہو کے بے چین
الٹ وہ خاک پر سب تخت اور تاج
بنا کر شکلِ جوگی، چھوڑ کر راج
غرض ایدھر کو وہ غم کا ستایا
تجسّس میں ہے پدماوت کے آیا
خدا جانے وہ لیلیٰ اس نے پائی
و یا جوں قیس ناحق خاک اڑائی
نہیں معلوم تب سے اس کا احوال
کہ وہ غمگیں ہے اب تک یا ہے خوش حال
وہاں جو ناگمت اس کی ہے رانی
ہے اس کی تلخ اس بِن زندگانی
سو اس کے سوز ہجراں سے وہ بیتاب
نہایت مضطرب ہے مثلِ سیماب
غمِ دوری سے اس کی وہ جگر خوں
ہوئی آوارہ بن کے شکلِ مجنوں
نہ اس کو رات دن ہے چین و آرام
کہ بس رونے سوا اس کو نہیں کام
کہوں کیا اس کا سوزِ جانِ مضطر
ابھی پڑتے ہیں تبخالے زباں پر
کہ اک دن ناگہاں وہ مضطرب حال
بجان و دل غمِ الفت کی پامال

طپاں آتش سے غم کی برق آسا
وہاں آئی کہ جس جنگل میں میں تھا
یہ آہیں کھینچتی تھی وہ مشوّش
کہے تو ہو گیا سب دشت آتش
درخت و برگ و بار و کاہ و جنگل
دمِ گرم اس کے سے اکثر گئے جل
نظر آتا ہے میرا جو تمھیں حال
سو میرے جل گئے اس دن پر و بال
جو دیکھا اس کو مثلِ مرغِ بسمل
کہوں کیا میں کہ میرا جل گیا دل
غرض پوچھا میں اس کا ماجرا سب
سمجھ دل سوز ان نے بھی کہا سب
جو اس نے حال اپنا کہہ سنایا
کہوں کیا میں کہ مجھ کو[1] رحم آیا
کہا میں نے کہ اچھا، لے میں جاؤں
خبر اس کی میں بنتا[2] ہے تو لاؤں
سو یارو اس نے اک نامہ لکھا ہے
مرے بازو میں دیکھو یہ بندھا ہے
خدا جانے کہ وہ بے رحم و بے درد
ملے گا کس جگہ ہوں میں جہاں گرد
کہوں کیا تم سے اس کی حالتِ زار
کوئی دم کی ہے مہماں اب وہ بیمار

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: تو میرے دل کو اس دم۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ: جو ملتا۔

نہ کھاتی ہے وہ غمگیں اور نہ پیتی
بیاں کیا کیجے مرتی ہے نہ جیتی
سنا جب یہ رتن نے حال سارا
غمِ الفت نے پھر اک جوش مارا
کہا اس طائرِ تنگ شکر سے
رفیقانِ وطن کے نامہ بر سے
کہ اے طائر میں تیرا ہم وطن ہوں
وفا سے دور ترا[1] راجہ رتن ہوں
وہ نامہ دے مجھے اے نیک فرجام
کہ مجھ کو بھی نہیں ہے اس بن آرام
مرا مطلب بر آیا حسبِ دل خواہ
سو اب ہم تم چلیں گے جلد ہمراہ
غرض دے کرکے وہ نامہ رتن کو
اڑا یہ کہہ کے پھر اپنے وطن کو
مجھے صحبت سے اس کی ہے زبس داغ
نہ ہو جس کو تمیز کوئل و زاغ
اسے ہرچند راجہ نے بلایا
ولے وہ تیز پرّاں پھر نہ آیا
کہوں کیا میں کہ اک دکھ دے گیا وہ
قرار و تاب و طاقت لے گیا وہ
رتن آتا تھا یا تو شاد شاداں
پھرا اس دن جو گھر کو تو پریشاں

۱- نسخہ لکھنؤ : دور پر -

بدن سنگل میں دل در ملکِ چتور
ہوا خط پڑھ کے اس کا اور ہی طور

پریشاں حال تھا از بس[1] رتن سین
ہوا خرد و کلاں ہر ایک بے چین

کہا یہ راے گندھرپ سین نے آ
ہوا مغموم کیوں اب دل تمھارا

رہو تم میری آنکھوں میں مرے پاس
کہ یہ، اندر! ہے تم سے بزم، کیلاس[2]

جو اے نورِ بصر تو یاں نہ ہوگا
ہمیں ہوگا جہاں اندھیرا سارا

رتن نے عرض کی اے صاحبِ تاج
رہے قایم تمھارا ملک اور راج

کروں کیا میں ادائے شکر تیرا
کہ یاں مطلق نہیں مقدور میرا

اگر ہر موئے من گردد زبانے
نباید از تو گفتن[3] داستانے

اگر ہر بالِ تن[4] پر سو زباں ہو
یہ تیرا شکر مجھ سے کب ادا ہو

عناصر جب تلک میرے بہم ہیں
تو میرا سر ہے اور تیرے قدم ہیں

۱- نسخۂ لکھنؤ: پریشاں بس کہ جب دیکھا۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: کہ اے اندر ہے تجھ بن بزم کیلاس۔
۳- نسخۂ ممتاز المطابع: یہ تو رانم ز ہر یک۔
۴- نسخۂ لکھنؤ: موئے تن۔

رہوں کا دور یا نزدیک میں یاں
ولے تا زیست ہوں تیرا ثناخواں
ولے ہے میری اس میں اب یہ بہبود
کہ یاں سے جاؤں میں چتّور کو زود
خبر لایا ہمارا آج قاصد
بنی عم اپنے ہیں بعضے جو حاسد[1]
انھوں نے واں کیا ہے فتنہ برپا[2]
سرِ کشور ہر اک کے دل میں آیا[3]
سوا اس کے علاء الدین[4] سلطاں
کیا چاہے ہے سب کو زیرِ داماں
جہاں آباد واں سے متّصل ہے
ہمارا حکم اس کا خارِ دل ہے
جو فرماؤ تو میں جلدی سے جاؤں
جو ہو بیدار فتنہ تو سلاؤں
جو دیکھی رائے محکم سب نے اس کی
تو راجہ کو سبھوں نے مصلحت دی
خلش ہوتی نہیں آپس میں زیبا
کہ بھیدی گھر کا ڈھا دیتا ہے لنکا

۱- نسخۂ لکھنؤ: خبر دی ہے ہمیں قاصد نے کاسد
بنی عم اپنے ہیں بعضے جو حاسد
۲- نسخۂ لکھنؤ: قہر برپا -
۳- نسخۂ لکھنؤ: ہر اک ہے دل میں لایا -
۴- نسخۂ لکھنؤ: علی الدین -

سوا اس کے جو کچھ حب الوطن ہے
کہ واں کا خار بھی اس کو چمن ہے
اسے رخصت کرو جاوے یہ دلدار
اگر ہے زندگی آوے گا سو بار
کہا راجہ نے اچھا ، خیر ، بہتر
کرو ہمراہ ان کے فوج و لشکر
جو ہو اسباب ان کا سب منگا دو
کہ تا ہووے نہ کچھ تکلیف ان کو
بلا کر اہلِ تقویم و برہمن
کہا دیکھو تو ساعت سعد و احسن
ستاروں کی بتاؤ نیک ساعات
رجال الغیب کا سیرِ مکافات
انھوں نے دیکھ کر تقویم فی الفور
کہا کر نجمِ سعد و نحس پر غور
سفر کیجے گا ان روزوں میں یا سیر
تو پہنچے رنج ، پر ہو جان کی خیر
رجال الغیب کا ہیگا یہ احوال
کہ وے گردش میں رہتے ہیں مہ و سال
سفر جس کے تئیں درپیش آوے
مقابل ان کے لازم ہے نہ جاوے
ارادہ سمت مغرب کے[1] اگر ہو
تو چوتھی بارھویں ہرگز نہ جاؤ

۱- نسخہ لکھنؤ : کا -

بری ہیں یہ بھی تاریخیں منحو تم[1]

نہ جاؤ[2] نوزدہ اور بست و ہفتم

سفر مشرق کی جانب کو جو آوے

تو ہفت و چاردہ کو واں[3] نہ جاوے

جو ہو بالیسویں اور تئیسویں[4] یار

ہے سمتِ شرق جانا سخت دشوار

اگر کیجے کبھی عزمِ جنوبی

نہیں ہے تین و گیارہ بیچ خوبی

اٹھارہ اور چھبیس اے خرد ور

جنوبی سیر کو کہتے ہیں بدتر

جو ہے سمتِ شمائل سے تو مانوس

تو آٹھ اور پندرہ ہیں سخت منحوس

تجھے کچھ بھی فراست حق نے ہے دی

نہ جانا تیس[5] اور انتیس میں بھی

جنوب اور غرب میں ہے جو کنارا

ہے نیرت نام اس کا آشکارا

نہ جانا دوسری ، سترھویں اور دس

بری پچیسویں بھی ہے ، نہ جا بس

۱- نسخۂ لکھنؤ : بتاریخ چہارم دوازدہ ہم -

۲- نسخۂ لکھنؤ : ہیں باہم -

۳- نسخۂ لکھنؤ : میں ہاں -

۴- نسخۂ لکھنؤ : الیسویں -

۵- نسخۂ لکھنؤ : تین -

شمال و غرب میں وہ ہے جو نائب
نہ جاؤ اس طرف اے رائے صاحب
ہو بیس اور تیرھویں تاریخ یا پنج
ادھر البتہ ہے قاصد کے تئیں رنج
شمال و شرق کا اوسط نمایاں
کہے ہے خلق جس کا نام ایسان
چھٹی اکیسویں یا بست و ہشتم
اُدھر جاوے تو وہ کرتا ہے رہ گم[1]
جنوب و شرق کے مابین اظہار
ہے اگنی نام سن اس کو بیان وار
نویں یا سولھویں یا بست و چارم
اگر ہووے نہ جانا اس طرف تم[2]
سوا اس کے کہوں میں اور یہ صاف
اگر چاہو کہ کیجیے سیرِ اطراف
نہ جا شنبہ دو شنبہ شرق اے ماہ
نہ یکشنبہ نہ جمعہ غرب کی[3] راہ
سہ شنبہ چار شنبہ ہیں شمالی
نہ جانا تو اُدھر اے لا اُوبالی
اگر ہووے تجھے عزمِ جنوبی
بروز پنجشنبہ کیا ہے خوبی

۱- نسخۂ لکھنؤ: اگر ہووے تو جاتے ہیں ادھر کم۔
۲- نسخۂ لکھنؤ: وہ با پہلی ہو، جاؤ مت ادھر تم۔
۳- نسخۂ لکھنؤ: عشرے کی۔

یہ ان کا ہے حساب اے صاحبِ نام
ہے گردش ہی سے ان کو روز و شب کام
جدھر کو آپ عزمِ سیر کیجے
رجال الغیب کا دن دیکھ لیجے
اگر ہو پشت پر جانا تو ہے خوب
کہ بن آتا ہے سب کاموں کا اسلوب
اگر ہو سامنے ان کا گزارا
تو بہتر ہے کرے ان سے کنارا
جو ان کے راست چپ[1] قاصد کی ہو سیر
اگرچہ اس میں شر بھی ہے ولے خیر
غرض باتیں منجّم سے یہ سن کر
دن اور تاریخ اچھی کر مقرّر
محبت دل سے سنگل کی اٹھا کر
ہوئے رخصت سبھوں سے گھر میں جا کر
پدم نے بھی کہا ہرچند مت چل
کہ ہے رہنے کو بہتر ملک سنگل
صلاحِ کار تو یوں ہے ہماری
اور آگے جو کہ ہو مرضی تمھاری
محبت اس ملک کی اپنے اٹھالا
جہاں جاؤ گے، ہم کو ساتھ جالا[2]

۱- نسخۂ لکھنؤ: راس و چپ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ مطبع المطابع و نسخۂ نول کشور: ہر دو اشعار ندارد۔

نہ مانا اس نے ، آخر کی تیاری
کہ اب یاں سے اٹھے قسمت ہماری[1]
کیا پردیس میں بس خوب آرام
اب آیا خانۂ اصلی کا پیغام
ہوئی رخصت پدم جب محرموں سے
انیسِ درد اور ان ہمدموں سے
لگے مل مل کے آپس میں وہ رونے
گہر آنسو کے پلکوں پر پرونے
کہ میں تم میں رہی اور ساتھ کھیلی
ہوئی اک دم نہ میں تم سے اکیلی
سو اب قسمت میں ہم کو واں ہے جانا
نہیں ممکن جہاں سے پھر کے آنا
ہماری آخری ہے یہ ملاقات
کہ پھر دیدار کو ترسوگی دن رات
دعا سے ہم کو اکثر یاد کیجو
سنا یا کچھ کہا ہو ، بخش دیجو
نہ کیجو نامے کا شکوے سے مذکور
کہ ہے سسرال سے میکا زبس دور
کہ حائل درمیاں ہیں ہفت دریا
نہیں واں سے کوئی ایدھر کو آیا

۱- نسخۂ لکھنؤ و نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : ہر دو اشعار ندارد ۔

غنیمت سمجھو یہ ملنا ہمارا
کہ یہ دم میں خیال و خواب ہوگا
سنی جب اس کی ہمزادوں نے یہ بات
کہ اس دم ہے دمِ آخر ملاقات
گلے لگ لگ کے سب نے زار نالاں
کیا آنکھوں سے برپا ایک طوفاں
پدر مادر جدائی سے بدل خار
بسانِ عندلیبِ سوختہ زار
برادر اور خویش و اقربا سب
بہم گریان و نالاں آہ بر لب
غرض کرتا تھا ہر اک آہ و زاری
کہ آ حاضر ہوئی در پر سواری
پدم رخصت ہو مادر اور پدر سے
کہوں کیا میں کہ گھر میں یک دگر سے
سبھوں سے مل کے اور آنسو بہا کے
جوہیں چنڈول میں بیٹھی وہ آ کے
کھڑے تھے جو وہاں بادیدۂ تر
کیے اشکوں سے واں گوہر نچھاور
پرستارانِ ہمدم وہ پری وش
کہ جن کو دیکھ کر ہووے پری غش
مصاحب سب رلن کے ایدھر اودھر
جلو میں ماہ کے جیسے ہوں اختر
نشاں و نوبت و نیل و عماری
کہے تو عہد کی جیسے تیاری

برہمن کے بھیس میں سمندر کا دان مانگتے ہوئے آنا
اور رتن سین کا اسے خیال میں نہ لانا اور دریا میں
صدمے اٹھانا اور پدم کا بہتے بہتے ایک تختے پر
لبِ دریا آ جانا

ہوا بحرِ جہاں میں[1] عشق جس کا آشنا اک دم
تو اُس پر موجِ غم سے آفتیں کیا کیا[2] اٹھاتا ہے

پلا ساقی مجھے جام اک شتابی
کہ آتی ہے کوئی دن کو خرابی

رتن ہوتا ہے اب دریا کا راہی
بیاں اس کی کروں ساری تباہی

وہ لے اسباب سب باہر بیاں سے
چلا القصّہ رخصت ہو وہاں سے

پس از قطع منازل چند در چند
لبِ دریائے شور آئے وہ خورسند

سمندر شکل باہمن کی بنا کے
رتن کے سامنے فی الفور آ کے

لگا کہنے یہ اس سے اے مہاراج !
دے اپنے مال سے مجھ کو زکوۃ آج

کہ ہوتی ہے زکوۃِ مال بہتر
غرض ہے مال داروں پر مقرر

۱- نسخۂ لکھنؤ : حیا میں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : نالہ ۔

سدا ہوتی ہے اس سے دولت افزوں
گھٹے ہرگز نہ تل ہو حد سے افزوں[1]
کہا راجہ نے چل ہے دان کیسا
لٹا دوں گھر نہیں فیاض ایسا
لیا آیا ہے تو دانی کہاں سے
کہ دوں لاکھوں روپے تجھ کو یہاں سے
یہ سن کر گفتگوئے کوتہ اندیش
گیا وہ خیرخواہ و عافیت کیش
ادھر لے لشکر و بنگاہ ساری
انھوں نے کی جہازوں میں سواری
چڑھے کشتی میں رکھ ڈولی و چنڈول
جہازوں کے دیے سب بادباں کھول
غرور اپنا بنا کے خضر و ہادی
چلے جس وقت یہ در جوشِ شادی
نہ سمجھے پر غور اتنا وہ نادان
کہ ہے حرفِ تکبّر عین طوفان
گئے جب نصف دریا کر کے طے راہ
ہوئی بادِ مخالف پھر تو جاں کاہ
اٹھا اک سمت سے طوفانِ پُرجوش
گئے اڑ ناخدا کے دیکھ کر ہوش
پکارا وہ پٹک کر دوربیں کو
کرو اب یاد رب العالمیں کو

۱- نسخہ" لکھنؤ : بل ہو گنج قاروں -

وہ طوفاں کیا تھا تھا اک حشر برپا
کہ دریا میں تھا ہر سو شور و غوغا
کہوں کیا میں کہ تھا ایسا ہی اندھیر
جہازوں کو کیا جس نے زبر زیر
سرِ طوفان ہر اک¹ موجِ دریا
کہ جس سے کشتیاں تھیں زیر و بالا
جہازوں میں جو تھا اسبابِ شاہی
معِ راجہ ہوئی سب پر تباہی
ہوا اسبابِ لشکر بسکہ غرقاب
نہ پایا کچھ نشاں جوں دُرِ نایاب
ہوا کی ٹھوکریں لاکھوں ہی سہہ کر
جہاز ان کا گیا اک سمت بہہ کر
ادھر کو روز و شب اک دیو واہی
کیا کرتا تھا اکثر صیدِ ماہی
سر اس کے پانچ اور بانہیں بھی تھیں دس
کس و ناکس کو کھاتا تھا وہ ناکس
صدا منہ سے تھا وہ آتش اگلتا
کہ اپنی آگ میں تھا آپ جلتا
بیاں کیا قد کروں اس کا کہاں تک
زمیں سے کوہ آسا آسماں تک
وہ موئے سر پریشاں سربسر تھے
کہے تو کوہ پر باہم شجر تھے

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہر یک ۔

بھیکن نام ، سر تا پا سیہ فام
لگہبانیِ لنکا اس کا تھا کام
نظر آیا جہاز ان کا اسے واں
تو ان کو دیکھ پھر وہ ہوکے رقصاں
چلا ان کی طرف کو ہوکے ہس گرم
کہ ہاں آج مدت میں غذا نرم
نکالے دانت باہر منہ سے سارے
دکھاتا آنکھیں روشن جوں انگارے
یہاں تک شکل سر سے لے کے تا پاؤں
یہی کہتا ہوا جی میں کہ کھا جاؤں
قریب ان ماہ رویوں کے وہ آیا
کہ جیسے ابر کا انجم پہ سایا
رتن کے روبرو آ کر وہ مکار
نیاز و بندگی کر خوب اظہار
لگا کہنے زبس شیریں زباں سے
کہاں جاتے ہو اور آئے کہاں سے
جدھر جاتے ہو یہ رستہ نہیں خوب
کہ اس جاگہ پہ ہیں لاکھوں گئے ڈوب
یہاں میں راہ سے ہوں خوب آگاہ
دکھاتا ہوں[1] سدا بھولوں کو میں راہ
مجھے دی ہے یہی خدمت خدا نے
لگاؤں یعنی بھولوں کو ٹھکانے

۱- نسخۂ لکھنؤ : بتاؤں ہوں -

تمھیں میں جلد یاں سے پار کردوں
ولے محنت میں اپنی بھی ابھی لوں
کہوں کیا میں جو شفقت اس کی پائی
سبھوں کی جان میں کچھ جان آئی
مثل کہتے ہیں کیا اعلیٰ و ادنیٰ
کہ ہے اہلِ غرض مجنون ہوتا
رتن بولا کہ اچھا خیر آ لے
جہاں تک لے سکے یاں سے اٹھا لے
گزرنا ہو ولے یاں سے تو آساں
کہ ہیں ہم نیم جاں سے بس ہراساں
سلامت گر ہوئے دریا سے ہم پار
سدا مانیں گے ہم احسان ترا یار
کہا اس نے اجی یہ مت کہو تم
بلا وسواس آگے کو چلو تم
فدا تم پر مرا یہ جان اور دل
کیے دیتا ہوں اب آسان مشکل
چلے ہمراہ اس کے شاد و خرم
کہ امید ہم پار اتریں گے بیک دم
رفیق آسا جو اس دریا میں آیا
زہے قسمت کہ ہم نے خضر پایا
نہ سمجھے پر غرور اپنا وہ ناداں
چلے باتوں پر اس کی شاد شاداں
لیے کشتی کو وہ دیو آدمی خوار
جدھر دریا میں تھا گرداب تہ دار

آدھر کو لے گیا رستہ بھلا کر
کہ تا کھا جاوے ان کو واں پہ جا کر
غرض گرداب میں کشتی جو آئی
برنگِ چرخ گردش خوب کھائی[1]
رتن بولا کہ اتنی بے وفائی
خدا سے ڈر نہ کر یہ ناخدائی
دغا ایسی بھی کرتا ہے کوئی یار
نہ ہو اے آشنا بے کانہ کردار
وہ بولا تب یہی ہے کام میرا
یہی مکر و فسوں ہے دام میرا
مری قسمت سے یہ کشتی ہے آئی
کہ تم سے ہے غذائے لرم پائی
تمھیں اس واسطے لایا ہوں میں گھیر
کہ ہوں گا آج مدت میں شکم سیر
کھڑا ہنس ہنس کے اور ہو شاد شاداں
بہم کہتا تھا ان سے ہو کے رقصاں
قضا را ایک طائر آ گیا واں
بجا ہے اس کو کہیے کوہِ پراں
اگر وہ دیو ہی کو[2] دیکھ پاتا
کسی کو اس کے ہوتے پھر نہ کھاتا

۱۔ نسخہ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد ایک شعر زائد ہے جو دوسرے نسخوں میں موجود نہیں :

الھیں گردابِ آفت میں پھنسا کر
لگا ہنسنے الھوں سے دور جا کر

۲۔ نسخہ لکھنؤ : تنہا ۔

کہیں ہیں راج بھنگی اس کو اکثر
نہایت تیز پر اور کوہ پیکر
بھیکن پر گرا یہ سچ ہے یا جھوٹ
کسی پر جوں گرے ناگہ فلک ٹوٹ
کہوں کیا تھے جو کشتی میں وہ محبوب
گیا اک ایک کا بس دیکھ جی ڈوب
جو کی جنگل میں لے کر اس نے پرواز
کبوتر کے تئیں لے جائے جوں باز
گئی کشتی ہوا سے اس کی بس ٹوٹ
گئے تختوں کے باہم وصل سب چھوٹ
پڑی کشتی پہ جب آ کر تباہی
ہوئے تختے ہر اک جانب کو راہی
کوئی ڈوبا کہیں ، کوئی بہہ گیا تھا
کوئی تختے سے لپٹا رہ گیا تھا
تباہی جب کہ اس کشتی پر آئی
رتن سے اور پدم سے ہوئی جدائی
جو دو تختوں پہ دونوں دو طرف کو
ہوئے رخصت بہم آپس میں رو رو
سنی اس نے نہ اس سے پھر کبھی کچھ
خبر باہم نہ دونوں کی رہی کچھ
پدم کا اس میں تختہ بہتے بہتے
نہیب موج دریا سہتے سہتے
تلاطم سے گیا بہہ اک طرف کو
کہ تھا نزدیک جس سے ایک ٹاپو

جزیرہ وہ عجب[1] فرحت فزا تھا
نمونہ کہیے جنت کا بنا تھا
وہاں کا تاجور تھا خود سمندر
سو اس دم اتفاقاً اس کی دختر
لبِ دریا برائے سیر ناگاہ
گئی تھی لڑکیوں کے ساتھ وہ ماہ
پدم کا اس میں تختہ آ گیا واں
ہوئی وہ لڑکیاں سب دیکھ حیراں
کنارے سے رہی تھوڑی وہ جب[2] دور
کوئی بولی پری ہے اور کوئی حور

پدم کا حال بیٹی کی زبانی گوش زد بادشاہ سمندر کے ہو جانا اور سمندر کا پھر لباسِ برہمن پہن کر رتن کو اطمینانِ پدم کے لیے تلاش کر لانا

کہوں کیا ناخدائے عشق کی باتیں کہ یہ ظالم
بہا کر کشتیِ عاشق کو ساحل پر لگاتا ہے

پلا اک جام اے ساقیِ سرشار
کہ بحرِ غم سے ہوں میں تیر کے پار
سخن کی ناؤ ساحل پر لگاؤں
رتن کو اور پدم کو پھر ملاؤں
ہوا نزدیک وہ حسنِ خدا داد
تو کیا دیکھے کہ ہے اک آدمی زاد

۱۔ نسخہ لکھنؤ : اک وہاں ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : وہ جب تلک ۔

بولے بہتر پری سے حسنِ انسان
لگی تختی پہ جوں تصویرِ بے جاں

کہوں کیا رنگ اس رشک پری کا
طپش سے غم کی بس نیلوفری تھا

کہا ان لڑکیوں نے دختِ شہ کو
کہو تو لیں نکال اس رشک مہ کو

بقیدِ زندگی ہے یا ہے بے جاں
ملے گا اجر اس کا ہوگا[1] احسان

کہا اس نے کہ میں بھی جانتی[2] ہوں
اسے جلدی سے لے آؤ میں دیکھوں

غرض وہ ہمدمانِ دخترِ شاہ
گئیں اس مہروش کے پاس جوں ماہ

لیا وہ کھینچ تختہ تھا جو بہتا
کہ وہ تختہ بہ از تختِ پری تھا

زبس اس مہروش کو چند دختر
لے آئیں جیسے دریا میں سے گوہر

گئے اڑ دیکھتے ہی سب کے پھر ہوش
کہ سر سے پا تلک ہے بادلہ پوش

وہ سر سے پاؤں تک تھی غرقِ زیور
نگہ کیجے تو کم ٹھہرے ہے اس پر[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : ثواب ہوگا بہر صورت اور -
۲- نسخۂ لکھنؤ : چاہتی -
۳- نسخۂ لکھنؤ میں اس شعر کے بعد ایک شعر زائد ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ہے :

کوئی بولی نہیں معلوم کیا ہے
کوئی بولی کہ اسرارِ خدا ہے

کوئی بولی کہ یہ ہے دخت شاہی
کہ آئی اس کی کشتی پر[1] تباہی
غرض اس کی حفاظت خوب سے کی
کہ وہ خود رفتہ بھی اپنے میں آئی
پڑی تھی یا تو بے خود بے سر و پا
کہ اس میں یک بیک کر چشم کو وا
کمالِ دردِ دل سے آہ بھر کے
لگی کہنے رتن ہائی بلا دے
سنا جو نام اوروں نے رتن کا
ہوا معلوم حال اس گل بدن کا
کہ یہ مشتاق ہے دریا کی راہی
پڑی ہے اس کی کشتی پر[2] تباہی
رتن خاوند اس کا ہے طرح دار
کہ ہے جس پر یہ دل سے عاشق زار
وہ سوداگر تھا یا راجہ تھا یا شاہ
کہیں جاتا ہو اس کو لے کے ہمراہ
ہے دریا میں مصیبت ان پر آئی
ہوئی دونوں میں سو باہم جدائی
کہا اس عاشقِ بے خانماں سے
سنا نامِ رتن جس کی زباں سے

۱- نسخۂ لکھنؤ : کہیں کشتی ہوئی اس کی ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : مقرر اس کی کشتی ہوئی ۔

کہ اے خورشید رُو رشکِ ستارا
ذرا آ ہوش میں یاں دل ہے پارا[1]
ترا کیا نام اور کس جا وطن ہے
کہاں تو ہے کہاں تیرا رتن ہے
تجھے تو ہم نے دریا سے نکالا
کہ تو بہتی تھی اک تختے پہ تنہا
نہ تھا از بس کہ تجھ میں ہوش یکدم
تری خدمت کریں ہیں دیر سے ہم
کبھی کیا ہم دعا و ہم دوا سے
شفا چاہی تری ہم نے خدا سے
غرض سوچی یہ جس دم وہ جگر خوں
رتن سے واقعی اب میں جدا ہوں
خدا جانے وہاں کیا اس پہ گزرا
کہیں کو یہ گیا ہے یا کہ ڈوبا
کمالِ درد و غم سے بھر کے پھر آہ
ہوئی بے خود یہ کہہ کر ان سے وہ ماہ
نکالا تم نے اور کی سرفرازی
کیا احسان اور بندہ نوازی
ولے یہ عرض ہے تم سے کہ مجھ کو
اسی دریا میں مجھ کو[2] پھر بہا دو
نہیں ہے زندگی کچھ مجھ کو مطلوب
ڈبو دینا ہی میرا ہے بہت خوب

۱- نسخۂ لکھنؤ : اے ماہ پارہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : لے کر -

کوئی ممکن ہے میں تنہا رتن سے
جدا ہو کر جیوں رنج و محن سے
سنی اُس شیفتہ کی جو زبانی
کہ تھی غم کی سراسر اک کہانی
ہوئی حالت یہ اس کی[1] زار و گریاں
کیا رو رو کے برپا ایک طوفاں
اٹھا کر واں سے پھر اس خستہ جاں کو
لے آئیں شاد شاد اپنے مکاں کو
ولے یہ غم تھا ہر اک کل بدن کو
کہ اب ڈھونڈھیں کہاں اس کے رتن کو
خدا جانے کہیں ڈوبا وہ جا کے
کہیں یا لے گئیں لہریں بہا کے
غرض اس غم سے غمگیں دخترِ شاہ
پرستاروں کو لے کر اپنے ہمراہ
پدر کے پاس جا کے اس نے فی الحال
کیا اس کا مفصّل عرض احوال
کہ میں ساحل پہ بہرِ سیرِ دریا
گئی، ہمدم سے تھی گرمِ تماشا
کہ اس میں ایک صورتِ غیرتِ ماہ
نظر دریا میں آئی دور ناگاہ
قریب آئی جو تختے پر وہ بہتی
نہیبِ صدمۂ امواج سہتی

۱- نسخۂ لکھنؤ: ہوئیں حالت یہ اس کی -

آسے دریا سے فوراً مثلِ گوہر
نکلوا کر میں لائی ہوں مکاں پر
دوا کی اس کی میں نے جب کی تدبیر
بہ ہوش آ کر ہوئی وہ مثلِ تصویر
ہوا دریافت وہ رنج و محن ہے
کہ شوہر اس کا اک راجہ رتن ہے
غرض اس کی یہ ہے قسمت کی خوبی
کہ کشتی ان کی ہے دریا میں ڈوبی
سو یہ جب ہوش میں اپنے ہے آتی
تو یہ کہہ کے ہے غش میں ڈوب جاتی
رتن سے یا کوئی مجھ کو ملا دو
نہیں دریا میں پھر مجھ کو بہا دو
میں اس غم سے بہ تنگ آئی ہوں جاں سے
کہ لاؤں ڈھونڈھ کر اس کو کہاں سے
تمھارے لوگ بہتر ہے کہ جاویں
موا جیتا کہیں پاویں تو لاویں
سنا بیٹی سے قصہ اس نے جس دم
موثر دل پہ فوراً ہوگیا غم
یہاں بعضے کہیں ہیں بلکہ اکثر
نہ تھا یہ بادشاہ تھا خود سمندر
یہی باہمن کی صورت آپ بن کے
گیا تھا دان لینے کو رتن سے
غرور اس نے جو دولت کا کیا تھا
جوابِ تلخ تر اس کو دیا تھا

اسے کھولا نہ تھا اس کی تو جاں کا
چکھانا تھا مزا لیکن زباں کا

بحکمِ خالقِ مختار داور
کہ اس کو کبر زیبا ہے مقرر[1]

غرور ان کا الٰہی کو سب دکھایا
بڑا بول ان کا ان کے آگے آیا

غرض یہ قصہ بیٹی سے وہ سن کر
برہمن وضع پھر ہو کر سمندر

تجسس کو گیا اس خستہ جاں کی
کہ دیکھی جس نے یہ دولت زباں کی

لبِ دریا پہ دیکھا جا کے اک سو
کہ وہ آوارۂ غم مثلِ گیسو

نہیبِ موج[2] سے ساحل پر آیا
گویا ہے دور سے منزل پر آیا

ولے اس کو نہ تھا معلوم اصلا
بر آیا میں کہ یا مطلب بر آیا

یہ جی میں فکر کر وہ رشکِ مجنوں
کہ یارب میں نہایت سخت جاں ہوں

بایں صورت ہوا دریا کا راہی
اڑے قسمت سے میرے مرغ و ماہی

فلک نے مجھ کو دریا میں بہایا
نہ ڈوبا نہ کسی مچھلی نے[3] کھایا

۱- نسخۂ لکھنؤ : کہ موزوں ہے اسے ناز و تکبر ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : میانِ موج ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : کسی نے مجھ کو ۔

سب آفت واسطے جس کے اٹھائی
ہوئی اس سے بھی آخر یوں جدائی
ہدم ہاتھوں سے میرے یوں ہوئی فوت
نہ آئی مجھ کو آئی موت کو موت
بغیر از دوست ہے اب زیست دشمن
یہ سر بس ہیکا تن پر بارِ گردن
جہاں ڈوبے جہازِ بادِ پیا
ہزار افسوس واں میں بھی نہ ڈوبا
سو اب مرنے کی اور ہی فکر کیجے
بن آوے جس طرح سے جاں دیجے
نہیں بن اس کے اب مجھ کو گوارا
گزر جانے سے سر کے ہی گزارا
یہ جی میں ٹھان کر وہ غیرتِ ماہ
دلِ پُر داغ سے وہ کھینچ کر آہ
کمر سے کھینچ کر اک خنجرِ تیز
برنگِ برگِ بیدِ سبز خوں ریز
یہ چاہے تھا کہ اک دم میں وہ سفاک
کرے تا سینہ بس اپنا شکم چاک
کرے پُر خوں سراسر تیز خنجر
دکھائے عاشقی کے اپنی جوہر
کہ اس میں وہ برہمن پاس آ کر
سراسر فیض یعنی خود سمندر
لگا کہنے کہ سن اے مردِ ناداں
نہیں رکھتی ہے اپنا کچھ بدل جاں

عبث ناحق ہے اپنی جان کھوتا

لہو اپنے سے کیوں ہے ہاتھ دھوتا

یہ تیرا حسن اور یہ نوجوانی

غنیمت جان اپنی زندگانی

تجھے ایسا یہاں کس کا الم ہے

جو اے مغموم یوں تو چشم نم ہے

مکاں یہ کس نے ہے تجھ کو دکھایا

نہ آتا ہے نہ کوئی یاں ہے آیا

تو یاں آیا ہے اڑ کر یا کہ بہہ کر

اور آیا ہے تو پھر کیوں ہے مکدّر[۱]

بیاں کر اپنی کچھ قسمت کی زشتی

کہیں اس میں تری ڈوبی ہے کشتی؟

کوئی دلبر ترا یاں بہہ گیا ہے

جو اس سے یاں تو تنہا رہ گیا ہے

میں ہوں یاں بحر و بر سے خوب آگاہ

کہ ہے معلوم مجھ کو رسم اور راہ

تو میں اس کو جہاں سے ڈھونڈ لاؤں

ہو زندہ یا کہ مردہ پھر ملاؤں[۲]

عبث ضائع نہ کر تو اپنی جاں کو

یہاں سے اٹھ کے چل میرے مکاں کو

رفیق ایسا رتن نے جب کہ پایا

تو پھر اس خستہ جاں میں ہوش آیا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ : لا ملاؤں ۔

بیاں کی سب حقیقت اپنے غم کی
رفاقت اپنی اور فرقت بدم کی
اگرچہ اس کو تھا معلوم سب حال
ضرور اس طرح پر سنتا تھا احوال
غرض اپنے مکاں میں اس کو لایا[1]
نہایت عزّ و حرمت سے بٹھایا
کہا اے نوجواں آج ایک گلفام
نہالِ گلشنِ خوبی بدم نام
بہی جاتی تھی اک تختے کے اوپر
اسے دریا سے ہم آئے سو لے کر
یہ وہ خود رفتہ لت غش میں رہے ہے
یہ ہوش آکر کبھی تو یہ کہے ہے
خداوندا ! رتن سے یا ملا دے[2]
یا قیدِ زندگی سے ٹک چھڑا دے[3]
کہاں تک اس کے غم کی کیجے تشریح
رتن کے نام کی ہے اس کو تسبیح
سنا نامِ بدم جوں ہیں رتن نے
نویدِ وصلِ جاں یعنی کہ تن نے
ہوا بے خود سنا نامِ بدم کو
دل و جاں سے بھلایا درد و غم کو

۱۔ نسخۂ لکھنؤ میں ردیف : کر ۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ : تو ملا دے ۔

۳۔ نسخۂ لکھنؤ : ویا دامِ اجل ہی میں پھنسا دے ۔

گرا پاؤں پہ پھر وہ مژدہ گو کے
نہایت مضطرب بے تاب ہو کے[1]
لگا کہنے وہ پھر با چشمِ گریاں
کہ اے مشفق میں تیری جاں کے قرباں
میں جس کے واسطے آفت سہی ہے
سو میری ہمدم و مونس وہی ہے
رتن ہوں میں اسی کا عاشقِ زار
مری محبوب ہے وہ رشک گلزار
سنا احوال یہ اودھر پدم نے
دلِ پُرخوں مریضِ درد و غم نے
اسے یا تو وہ بے ہوشی و غش تھا
ہوا یا سنتے ہی اس کو افاقا
و لیکن دل میں کہتی تھی بصد یاس
کہ تب جانوں وہ جب[2] آوے مرے پاس
کہا تب لڑکیوں نے کھا کے سوگند
کہ تو اے رشکِ مہ ہو اب تو خرسند
ہوئی صبحِ وطن تیری اے بی بی!
رتن آیا، گئی شامِ غریبی
ہے مطلب تو نے خاطرخواہ پایا
یہ فرماؤ کہ اب دوگی ہمیں کیا
لگی کہنے کہ لونڈی ہوں تمہاری
فدا یہ جان تم پر ہے ہماری

۱- نسخۂ لکھنؤ : گل و بلبل کے باہم وصل جو کے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : تب مانوں گی وہ -

فدا تم پر سدا میرا دل و جاں
جیوں گی جب تلک مانوں گی احسان
ہوئیں وہ لڑکیاں بھی شاد و خرّم
ہوئی سب دور دل سے کلفت و غم
رتن سے جب پدم نے وصل پایا
سنا احوال باہم اور سنایا
رہے چندے اسی صورت وہاں پر
ہوا جب رفتہ رفتہ جمع لشکر
جو یار اُن کے سمندر نے بہائے
اسی صورت وہ سب لا کر ملائے

رتن کا پدم کو لے کر باساماں و شکوہ چتور میں آنا اور اہلِ شہر کا شاد و خرم ہو جانا

یہ خوش خبری صبا[1] چتّور کو لے جا شتابی سے
رتن اب پھر کوئی دن کو[2] یہاں تشریف لاتا ہے

پلا اے ساقیِ فرخندہ فرجام
کہ بر آیا دلِ ناکام کا کام
شتابی می کشی کی کر تیاری
کہ ہوتی ہے رتن کی اب سواری
سمندر سے وہ رخصت ہو چکا ہے
وطن کی سمت کو اپنے چلا ہے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ مژدہ اے صبا۔
۲۔ نسخۂ لکھنؤ : رتن یعنی کوئی دن میں ۔

سمندر نے کیا رخصت رتن کو
کہ تا راہی ہو وہ اپنے وطن کو
پھر اک مالا دیا روشن چوں اختر[1]
ہر اک موتی خراجِ ہفت کشور
ہزاروں دُرج پُر از لعلِ رخشاں
فدا جن پر سدا جانِ بدخشاں
دیا فیلِ سفید اور اک شتر مست
بلندی جس کے آگے کوہ کی پست
نہایت بے تکاں اس کا چلاوا
سبک رو جوں خیال و وہم دانا
جو ہو روئے زمیں پر گرم رفتار
دھمک سے ہو نہ چیونٹی بھی خبردار
دیا اک اسپِ تازی وہ سبک رو
بروں تقریر سے جس کی تک و دو
جو ہو راکب کے دل میں فکر مہمیز
تو وہ مرکب ہو گرم جست اور خیز
ہزاروں تحفہ جات اس کے سوا اور
کئی اقسام کے اچھے نئے طور
غرض دے کر کے اسبابِ زمانہ
کیا سمتِ وطن اس کو روانہ
لیے ہمراہ اپنے شانِ شاہی
ہوئے راہِ تری سے پھر یہ راہی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : خوش آب و گوہر۔

غرض شاداں پس از قطعِ منازل
کیے سب کام خاطر خواہ حاصل
ہوئے وارد وہ اپنے ملک میں جب
کیا منزل پہ ڈیرہ ایک دو شب
ہوئے چتّور کو قاصد روانہ
کہ آتا ہے رتن رائے زمانہ
ہوئے خورد و کلاں سب خرّم و شاد
کہ اب حق نے کیا چتّور آباد
اکابر شہر کے سب عام اور خاص
گئے آگے باستقبال و اخلاص
توسّل میں جو اس کے اقربا تھے[1]
کوئی شاداں تھے اور کوئی خفا تھے
گئے لینے ادھر ادنٰی و اعلٰی
ہوئی یاں شہر کی خوبی دوبالا
زحد قلعہ، ہو مردم نے خرسند
کیا سب شہر کو بس آئینہ بند
ہوئے گرمِ تماشا مرد اور زن
خزاں دیدہ ہوا بازار گلشن
سواری شہر میں اس کی جب آئی
کہوں کیا میں کہ تھی شان خدائی
کہ آگے سب سے تھی پیادوں کی اک فوج
کہے تو قلزمِ ہستی کی ہے فوج

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : وہ جو ذی رحم اس کے واں بہم تھے
کوئی شاداں تھے اور کوئی بہ غم ہے

پھرے لاکھوں سواروں کے برابر
سراسر اسپ سب کے غرقِ زیور
نشان ، نوبت ، مراتب اور ماہی
جلو میں حاضر اس کے شانِ شاہی
غلاموں کے وہ دستے چند در چند
ہراک خدمت میں جیوں جوزا کمربند[1]
جہاں کو اپنا سب عالم دکھاتے
سواری سے بڑھے آگے تھے آتے
اسی صورت سے جو دستہ ہے آیا
تماشائی کہیں اس میں ہے راجا
ہوئی اس میں[2] سواری بھی نمودار
کہ جس کی سیر بہ از سیرِ گلزار
نقیب و چوب دارانِ خوش آواز
جدا ان کا سواری میں اک انداز
پکاریں ہیں کہ باگیں سب لیے آؤ
تفاوت اور ادب سے ہاں بڑھے جاؤ
صدا نوبت کی وہ دھیمی سہاتی
عجب ہی چین سے کانوں میں آتی
وہ نقّارے پہ لگنا چوب کا یوں[3]
کہ گونجے تھا صدا سے جس کی[4] گردوں

۱- نسخۂ لکھنؤ : بخدمت روز و شب حاضر کمربند ۔
۲- نسخۂ ممتاز المطابع : 'اس میں' ندارد ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : وہ نقاروں کی تھی آواز دوں دوں ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : جن کی ۔

ہوا عشرت کدہ بس اک زمانہ
کہ وہ گاتی تھی شہنائی شہانا
کہوں کیا میں کہ بیروں از بیاں تھیں
وہ نوبت میں جو روشن چوکیاں تھیں
مرصع سینکڑوں ہی پالکی تھیں
جلو ان کی میں لاکھوں نالکی تھیں
ہزاروں رخش کوتل بس قدم بلز
مرصع اور طلائی جن کے سب ساز
جلو کی فوج اکثر بادلہ پوش
پرے باندھے برابر دوش بر دوش
وزیر عمدگانِ شہر باہم
مرصع پوش ہمراہ شاد و خرم
اور ان کے درمیاں بازینت و زین
چڑھا فیلِ سفید اوپر رتن سین
ادھر اودھر فقیروں کو برابر
بجائے سیم دیتا لعل و گوہر
بیاں سے ہے یہ باہر میں کہوں کیا
ہوا داخل وہ اپنے قلعے میں جا
ہدم کی اس میں بس آئی سواری
چلے ہے جس طرح بادِ بہاری
پرستاریں جلو میں وہ پری زاد
کہ جن کی شکل رشکِ فکرِ بہزاد
ہرے باندھے برابر پیش اور پس
ہر اک صورت میں ماہِ چاردہ بس

یہ کہتے جاتے تھے وہ[1] ہر کسی کو
سواری ہے بڑھو آگے پرے ہو

انھوں کے درمیاں چنڈول اس کا
مغرّق لعل و گوہر میں سراپا

بھنور تنہا نہ تھے کچھ ان پہ قرباں
فدا ہوتے تھے ان پر انس اور جاں

جلو میں سیکڑوں ڈولے طلائی
جنھوں پر آنکھ سورج نے لگائی

انھوں میں اس کی ہم سن اور ہمزاد
سراپا ناز اور حسنِ خدا داد

غرض اک اژدہامِ حسن ہمراہ
اور ان کے درمیاں راجہ کی دل خواہ

عمارت تھی جو رنگیں اور اعلا
ارم سے حسن و خوبی میں دوبالا

بیاں کیا کیجے اس کی شان و شوکت
کہ تھی روے زمیں پر ایک جنت

جو پدماوت کی واں آئی سواری
اسی رنگیں محل میں جا اتاری[2]

بایں آداب جب آئی سواری
ہوئی پہنچا کے رخصت فوج ساری

مبارک اور سلامت سے تھے سب شاد
نئے سر سے ہوا چتور آباد

۱- نسخۂ لکھنؤ : چلے جاتے تھے کہتے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : اس شعر کا پہلا اور اس سے اگلے شعر کا دوسرا مصرع ملا کر صرف ایک شعر درج ہے۔

غرض لذریں لے ہر اک آدمی سے
ہوا داخل محل میں کس خوشی سے
گیا خدمت میں پہلے والدہ کی
کہ وہ مشتاقِ دیدارِ پسر تھی
قدم پر سر جھکا کے خوب رویا
غبار اس کے جو دل پر تھا سو دھویا[1]
بصارت بس کہ گریہ نے تھی کی دور
ہوئی دیدار سے بیٹے کے پُرنور
پدم پھر سامنے مجرے کو آئی
لیا گھر بار پہلے منہ دکھائی
بہو بیٹے کو چھاتی سے لگایا
دل و دیدہ کو پھر اک چین آیا
پدم کو ساس نندوں نے جو دیکھا
کہ ہے اک حسن کی شعلہ سراپا
کہا آتے ہی اس رشک چمن کے
یہ صورت حق بجانب ہے رتن کے
گیا راجہ رتن پھر ناگمت پاس
کہ تھی ملنے کی اس کے دل میں اک آس
جلن تھی اس کو بس نامِ پدم کی
پہ تھی مشتاق راجہ کے قدم کی
رتن نے جب قدم اپنے دکھائے
تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : یہ اور اس سے اگلا شعر مقدم مؤخر ہیں۔

تواضع کے بجا لائی وہ دستور
نہ بولی منہ سے لیکن ہو کے مغرور
کیا ضبطِ نفس کو اس نے تادیر
ہجومِ شکوہ نے لیکن لیا گھیر
لگی کہنے کہ بس اے بے وفا مرد
نہ آیا تجھ کو مطلق کچھ مرا درد
مجھے یاں غم میں دیوانہ بنا کر
رہا یوں غیر سے جا دل لگا کر[1]
تجھے اے بے وفا کس نے سکھایا
کہ میرا سب حقِ خدمت بھلایا
سمجھتی تھی تجھے ہیگی میری چاہ
سو نکلی دل میں تیرے غیر کی راہ[2]
گیا تو غیر کے غم میں نکل کر
ہوئی میں خاک تیرے غم میں جل کر
مجھے کر یک بیک دل سے فراموش
ہؤا جا کر پدم کا تو ہم آغوش
غرض شکوے کہ جو جو دل میں آئے
کہوں کیا میں رتن کو کہہ سنائے
رتن بولا کہ شاکی ہے بجا تو
ولے ہرگز نہ ہو اتنی خفا تو
ہوئی[3] اے جان تیری قدر و منزل
کہوں کیا میں کہ جانے ہے مرا دل

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : جو ہے۔

تو پہلی سب سے میری بیاہتا ہے
کنھیا ہوں میں اور تو رادھکا ہے
ترا محکومِ فرماں میں بہ دل ہوں
حقِ خدمت سے تیرے منفعل ہوں
جو ہووے چاہ کا حق ، تو نے چاہا
محبت اور عشق اپنا نباہا
رہی تو رات دن بس بے خور و خواب
مری دوری سے مضطر مثل سیماب
اٹھائے تو نے جیسے رنج اور غم
کیا کر مجھ سے سو اب عیش باہم
رتن نے کہہ کے تب لفظِ صفائی
کدورت اس کے دل سے سب مٹائی
منائی جب کہ وہ روٹھی رتن نے
کہا پھر اس کی اس رشکِ چمن نے
کہ تم جو جا کے یوں پردیس چھائے
کہو تو بارے کیا کیا چین پائے
گدایانہ ہوئے تم یاں سے راہی
ملا پھر کیونکہ تم کو[1] تاجِ شاہی
وہ پدماوت جسے لائے ہو جا کر
نہایت رنج اور محنت اٹھا کر
جہاں سے ایسی کیا اعلیٰ ہمدم ہے
کہ مجھ میں کوئی خوبی اس سے کم ہے

۱- نسخہ لکھنؤ : تم کو کیونکر -

پڑا بس تجھ کو بھنورے کا سا چسکا
کیا مجھ سے سو اس سے بھی کرے گا[1]
نہ بھولے وہ جسے لایا ہے تو بیاہ
رہے کی تا بہ کے ایسی نئی چاہ
سنے گا ذکر خوبی پھر کسو کا
تو پھر ایسا ہی اس کا حال ہوگا[2]
ہے سیرت تو نے بھونرے سے اڑائی
جو ہے دل میں ترے بس بے وفائی
ملی تھی بسکہ مدت میں رتن سے
کہے تو بلبلِ غمگیں چمن سے
رہی تا صبح ان میں وہ حکایت
کہ معنی جس کے مضمونِ شکایت
انھیں اس طرح گزری رات ساری
ہدم کی کیا کہوں میں بے قراری
جدائی ایک تو تھی ہی رتن کی
قیامت پر جلن تھی سوت پن کی
کہ اس نے رات کر اختر شماری
سحر تک تھی عجب غم سے گزاری
سحر گاہاں رتن واں سے جب آیا
ہدم کو بس کہ غم گیں حد سے پایا
بھرے آنکھوں میں آنسو، تھا یہ عالم
گلِ نرگس میں جیوں قطراتِ شبنم

۱۔ نسخۂ لکھنؤ: مزا چکھنے کی ہر اک گل کے اس کا۔
۲۔ ایضاً: کیا مجھ سے سو اس سے بھی کرے گا۔

سحر آسا رتن کو دیکھ خنداں
لگی کہنے اسے وہ ہو کے گریاں
کرو مجھ سے نہ کچھ حرف و حکایات
تمھاری مجھ کو کچھ بھاتی نہیں بات
نہیں خوش میں چلو آگے نہ آؤ
رہے تھے رات جس جا واں پہ جاؤ
کہا اس نے پدم سے ہنس کے اے گل
بہ دل عاشق ہوں تیرا مثلِ بلبل
تو ہے خود آپ دانا اے خرد ور
کہ ہے یہ بات تیرے حقِ میں بہتر
رہوں میں پاس اس کے کام نا کام
ولے[1] اس میں تو ہووے گی نہ بدنام
بہ دل خوش گو نہیں اے جانِ سنگل
یہ ہے بہتر کہ تو بھی سب سے مل جل
ملے کیونکر کہ ہے یہ بدتر از موت
کہیں ملنے سنی ہے سوت سے سوت
لگی کہنے گیا تو جس کے گھر شب
وہ اے مہ گھر ہے تجھ کو برجِ عقرب
تعجب ہے کہ تو ہے اس سے مانوس
نہ جانا پھر کہ وہ ہے سخت منحوس
کلف ہے وہ میں ہوں مہتاب انور
کہاں میں صاف تن اور وہ مکدّر

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : لو پھر۔

گل و بلبل میں میرے عاشقِ زار
اور اس کی شکل سے دیدے پُر از خار

پدم ہوں یاں میں جیوں طاؤس خرسند
وقارِ ناگمت پھر کہیے تا چند

زبس ہاتھوں سے میرے اس کی ہے سوت
کہ وہ ہو کر لگے ہے اب مری سوت

دونوں سوتوں میں لڑائی ہونا اور رتن سین کا واسطہ صفائی ہونا

دلا تو چل ذرا گلشن کی جانب سیر واں ہے
کہ رشک عاشقی دو عندلیبوں کو لڑاتا ہے

پلا اک جام اے ساقی بے باک
کہ ہیگی آج سیر باغ ہر تاک

پدم اور ناگمت کی یاں لکھوں جنگ
کہ رشک سوت پن سے ہے وہ دل تنگ[1]

حقیقت سن پدم سی دلربا کی
کہ رہتی ناگمت کی تھی وہ شاکی

کہ اک دن ایک عورت صبح آ کے
بیاں کرنے لگی گھر میں پدم سے

کہ اے گلدستہ باغِ جوانی
سنا یوں میں نے اکثر کی زبانی

۱- نسخہ ممتاز المطابع و نسخہ نول کشور : ہے بہت تنگ -

یہاں ہے ناگمت کا تحفہ اک باغ
کہ جس کے رشک سے لالہ کو ہے داغ
وہاں سو جا کے اس نے یہ ہے ٹھانی
رتن سے کیجے حفظِ زندگانی
رتن سے جا کے سیرِ باغ کیجے
برنگِ لالہ تجھ کو داغ دیجے
تری آنکھوں کی اے رانی سو وہ خار
ہے اب مصروفِ سیرِ گشتِ گلزار
سنی یہ بات اس سے جو پدم نے
تو بس گھیرا اسے رشکِ الم نے
بہ دل سوزاں برنگِ شمع فانوس
چلی وہ ناگمت پر مثلِ طاؤس
نہاں سوز و گداز اور ظاہرا ناز
گئی صیدِ کبوتر پر وہ جیوں باز
نسیم آسا گئی وہ سوئے گلزار
و لیکن دل میں لاکھوں رشک کے خار
ملے ظاہر میں اک گل پر دو بلبل
دلوں میں لیکہ پیچاں مثلِ سنبل
ادھر یہ رشک کی آتش سے فی الحال
برنگِ گل تھی ہوتی دم بدم لال
حسد کی ناگمت کے دل میں تھی سول
سو ہوتی زہرِ غم سے نیم کا پھول
اگرچہ دل میں تھا دونوں کے یہ غم
ولے کرتی تھیں سیرِ باغ باہم

کہ ناگہ ایک جا[1] ہنس کر پلم نے
اسیرِ پنجۂ رشک و الم نے

کہا اُس قیدیِ دامِ حسد سے
شناسا کچھ نہیں تم نیک و بد سے

اگرچہ باغ ہے اچھّا بنایا
ولے بعضا شجر بے جا لگایا

یہ کیا موقع جہاں نارنگیاں ہوں
اُنھی کے پاس کھٹّی املیاں ہوں

جہاں خوش ذائقہ انگور ہووین
دھتورہ تلخ واں کاہے کو ہووین

جہاں نغمہ سرا ہو بلبلِ باغ
یہ کیا لازم مقابل اس کے ہو زاغ

نہالِ انبہ جس جا ہووے خوش رنگ
وہاں جامن کے رہنے کا ہے کیا ڈھنگ

کہا اس نے کہ ہاں کہتی ہو تم خوب
ولے وہ گل جو ہو گلچیں کا مرغوب

نہ دیکھے سیر جس کی مالکِ باغ
حقیقت میں ہے وہ گل بدتر از داغ

وہ جامن صاف اور نمکیں زحد بیش
ہے بہتر انبہ سے جس میں کہ ہو ریش

ز بس مرطوب از حد ہے جو کیلا
یہی موجب کہ رہتا ہے اکیلا

۱- نسخۂ لکھنؤ : کہ اس میں یک بیک ۔

رہی تا دیر باہم یوں حکایت
کہ تھی رمز و کنایہ میں شکایت
اسی صورت سے جب خفگی بڑھائی
ہوئی باتوں میں پھر ظاہر لڑائی
پدم بولی کہ میں ہوں غیرتِ باغ
بجا ہے تیرے دل میں غم سے ہو داغ
میں آہو چشم، تو ہے گاؤ دیدہ
میں گل ہوں نارسیدہ تو رسیدہ
سراپا ناز میں طاؤسِ گلشن
تو کیا اے ناگمت کالی سی ناگن
کہا اس نے ہے میرا حسن نمکیں[1]
بہ از خوبیِ لیلیٰ اور شیریں
یہ میرے رنگ کی ہے قدر و منزل
کہ آنکھوں پر نہ ہو اس کا اگر تل
تو تیرے رنگ کے مانند بے نور
رہا کرتی ہیں آنکھیں سب کی پھر کور
نہ کچھ شیریں زباں میں جوں ملک ہوں
کہ سر سے تا بہ پا کانِ نمک ہوں
جو دیکھی ناگمت سے ترش روئی
ہے سرگرمِ جوابِ تلخ گوئی
پدم پہلے اٹھی اپنے مکاں سے
کہ لڑیے تا بہ کے تیغِ زباں سے

۱۔ اسخۂ لکھنؤ : حسنِ افزوں ۔

جو کچھ ہووے تو بس ہاتھوں سے کیجے
کہ دشمن ہو تو اس کی جان لیجے
اٹھی ایدھر غرض یہ بر سرِ جنگ
اُدھر وہ رشکِ غنچہ با دلِ تنگ
چڑھا کر آستیں اور باندھ دامن
لڑیں جوں بلبلیں در صحنِ گلشن
زباں تو[۱] اک طرف حرفِ درشتی
لگی ہونے بہم دونوں میں کشتی
پدم کی چنپئی رنگت قیامت
اور اس کا سانولا پن قہر و آفت
لگی ہونے جو باہم دونوں میں جنگ
بیاں کیا کیجیے تھا کچھ عجب رنگ
پدم سے تھی وہ چمٹی طیش کھا کے
کہ جوں صندل سے لپٹے ناگ آ کے
غضب سے ہاتھ یوں گردن میں تھے خم
کہ دو شاخیں لپٹ جاتی ہیں باہم
کہوں کیا ان کا لڑنا آ کے در جوش
کھسل پڑنا دوپٹوں کا وہ بر دوش
وہ رکھنا ناک پر انگلی غضب سے
وہ دینا گالیاں رنج و تعب سے
بکھر جانا وہ بالوں کا قیامت
ہجومِ دود شعلے کی علامت

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : زباں سے ۔

بھلا کُرتی کے دامن کا جھٹکنا
قیامت تِس پہ آنکھوں کا مٹکنا
غرض یوں سانولی گوری سے پیچاں
کہ نورِ روز و شب دست و گریباں
ز بس تھیں گرم دونوں بر سرِ غدر
یہ روزِ عید تھی اور وہ شبِ قدر
رتن نے یہ خبر جس وقت پائی
کہ ہے دونوں میں باہم اک لڑائی
سرِ پرخاش ہیں آہو رمیدہ
مہ و خورشید کے دو نورِ دیدہ
یہ لڑتی تھیں کہ وہ بھی اس میں آیا
غضب کا شعلہ دونوں سے بجھایا
ادھر اس کو، اُدھر اُس کو بٹھا کے
شرارِ قہر القصہ بجھا کے
منگا چنڈول دونوں کے بہ یک بار
چمن سے گھر میں لایا کر کے اسوار
مرتّب تھا جو اک کاخِ طلائی
سنہری گویا جنّت تھی بنائی
سو اس میں ناگمت کو جا اُتارا
کہا اس سے کر یہ گھر ہے تمہارا
رہو اس میں سدا با عیش و آرام
کسی سے مجھ سوا کہہ کیا تجھے کام
تری خدمت سے میں کب ہوں گریزاں
جو تو اس غم سے ہووے اشک ریزاں

حقِ خدمت ہے دونوں کا برابر
نہ تو کم ہے نہ وہ تجھ سے ہے بہتر
صفائے گفتگو دیکھی رتن کی
کدورت مٹ گئی رشکِ چمن کی
پدم کا کاخ سیمیں تھا جو تیار
منقش جس طرح ہو صحنِ گلزار
آنارا وان آسے لا کر بہ اعزاز
کہا اس سے کہ اے سرمایۂ ناز
تجھے ہے کام مجھ سے اے خود آرا
نہ رکھ مطلب کسی سے تو خدارا
فدا اے جان تجھ پر میں بہ دل ہوں
ولے اس سے بہ ظاہر منفعل ہوں
زمانہ سازیاں کرتا ہوں اس سے
بظاہر بازیاں کرتا ہوں اس سے
کروں میں ایک شب واں بھی نہ آرام
تو ہم تم ہوویں دونوں ساتھ بدنام
تجھے گو شاق ہے اک آن تجھ بن
پہ اک شب یاں رہوں تو واں بھی اک دن
غرض کر چاپلوسی اور خوشامد
ہوا دیوان خانے میں برآمد
معین کر کے پھر کچھ شغلِ اوقات
بخوبی کاٹتا تھا اپنے دن رات
اسی صورت بر آئی ایک مدت
کہ رہتی تھی انھوں میں عیش و عشرت

ہوئی راجہ کی پھر دونوں سے اولاد
زمانہ ان کی شادی سے ہوا شاد

داستان راگھو برہمن مصاحبِ رتن سین کی کہ راجہ نے خفا ہو کر شہر بدر فرمایا اور اس نے پازیب پدم کی سلطان علاء الدین کو پہنچا کر اشتیاق پدم کا دلوایا

کہاں جاوے کوئی اس چرخ کے ہاتھوں سے اے عشرت
کہ یہ نیرنگ کیا کیا رنگ عالم[1] کو دکھاتا ہے

پلا دے ساقیا تو جلد اک جام
کہ ہے گردش میں جامِ چرخِ ناکام
بنا کے ایک نقشہ ماہِ نو کا
یہ ساحر آفتیں کرتا ہے کیا کیا
کبھیں زنّار دار کلکِ مشکیں
کہے ہے یہ حدیثِ سحر آئیں
کہ تھا راجہ رتن کا محرمِ راز
برہمن نام راگھو سحر پرداز
اگرچہ بیدخوانی خوب تھی یاد
پہ علمِ ساحری میں تھا وہ استاد
مصاحب جب سے[2] راجہ کا بنا تھا
دکھاتا تھا سدا سحر و تماشا
رتن تھا اس کی جانب دل سے مانوس
بہ دل اس کے تماشے میں تھا مصروف

۱- نسخۂ ممتاز المطابع : زمانے کو -
۲- نسخۂ ممتاز المطابع : جب کہ -

برہمن اور بھی راجہ کے جو تھے
بہ‌دل بغض و حسد رکھتے تھے اس سے
سدا اس فکر میں رہتے تھے دن رات
کہ ایسی ہاتھ آ جاوے کوئی بات
اسے دربار میں آنے نہ دیجے
جو منصب اس کا ہیکا آپ لیجے
ذلیل اس کو کریں گھر سے نکالیں
غرض ہم اس سیہ اختر کو ٹالیں
کیا کرتے تھے باہم سب یہ تدبیر
موافق ہوگئی اک روز تقدیر
بظاہر تھی وہ تقدیرِ موافق
ولے باطن میں صد آفات لاحق
کہ اک دن باہمنوں[1] نے آکے یک بار
رتن نے کی سرِ دربار تکرار
کہ اے آگاہِ علمِ بیدخوانی
عیاں سازندۂ رازِ نہانی
مجھے درپیش ہے یہ عقدہ لاحل
بتاؤ آج ہوگا چاند یا کل
کہا راگھو نے اس سے اے مہاراج
مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہے آج
حریف اس کے جو باہمن تھے وہاں اور
انہوں نے از رہِ تقویم کر غور

۱- اصل میں اس لفظ کی کتابت "باسہنوں" ہے۔

کہا راگھو سے اتنے قول باطل[1]
حضورِ رائے کچھ رکھتا ہے حاصل
تری فکر اور طبیعت میں خلل ہے
کتابوں میں تو ناداں دوج کل ہے
سنی یہ گفتگو راجہ نے جس دم
کہا راگھو سے فوراً ہو کے برہم
کہ اتنا جھوٹ کہنا کیا سبب ہے
مگر اے یاوہ گو تو بےادب ہے
کہی تھی بے تأمل اس نے جو بات
سو لائی سر پہ اس کے تازہ آفات
اگرچہ بات اس کی وہ غلط تھی
سخن کی اس نے تس پر پرورش کی
کہا تقریر ان سب کی ہے فاسد
بدل یہ بدگماں ہیں میرے حاسد
اگر سچ ہو تو ذلت ان کو دیجو[2]
نہیں تو مجھ کو جو چاہو سو کیجو
غرض یہ کرکے ان سے قول و اقرار
گھر آئے اپنے اپنے اہلِ زنّار

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : اتنا کذب باطل — اس شعر کے بعد ایک شعر زائد ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ملتا :

کہا راجہ سے تو نے چالد ہے آج
مگر تو علم سے شاید ہے محتاج

۲۔ نسخۂ لکھنؤ میں قافیہ ''دیجے — کیجے''۔

جب آخر دن ہوا با صد تگ و دو[1]
بنا کر سحر سے راگھو مہِ نو
لگا راجہ سے کہنے بندہ پرور
نظر تو کیجیے بامِ فلک پر
نہیں تقریر میں میری خلل ہے
انھیں تو پوچھو کیسی ان کی کل ہے
مری ذلّت کے ناحق ہیں جو در پے
وہی منصف ہوں اس کے آج کیا ہے
کہا ان سب حریفوں نے ہو خرسند
کہ اے راجہ یہ ہے علمِ نظر بند
اگر یہ ماہ ہوتا آسماں پر
تو ہوتی روشنی سارے جہاں پر
تمھیں جو ماہِ نو اس نے دکھایا
ہوا پر سحر سے ہے یہ بنایا[2]
ہوا اپنے بنانے سے یہ بے دوس
ولے پرتو ہے اس کا سات ہی کوس
نہ ہو باور یہاں سے لوگ جاویں
بھلا دس کوس تک تو دیکھ آویں
کہ اس کی روشنی واں تک بجا ہے
تو جانو راست راگھو کا کہا ہے
وگر اس کی ہے سات ہی کوس تک حد
تو پھر ہے واقعی میں بات یہ بد

۱- نسخہ لکھنؤ : ہوا وہ روز آخر جب تو شب کو ۔
۲- نسخہ لکھنؤ : یہ ہے چڑھایا ۔

پسند آئی جو یہ راجہ کو تقریر
کہا اچھا کریں اس میں نہ تاخیر
شتابی لوگ جاویں دیکھ آویں
جو ہووے واقعہ جلدی سناویں
چلے ہر سُو پیادے اور اسوار
کہ تا ظاہر ہو اس کا صدقِ گفتار
کہا زنّار داروں نے جہاں تک
سبھوں نے جا کے دیکھا سو وہاں تک
سنایا سب نے راجہ کو جب آ کر
کہ دیکھا ہم نے دس دس کوس جا کر
حضوری میں جو ان سب نے کہا تھا
وہیں تک ماہ نو کا پرتوا تھا
حریفوں کی بن آئی بات ساری
ہوئی راگھو کو دُونی شرمساری
کہا سب نے رتن سے اے مہاراج!
کہو اب دوج کل ہے یا ہوئی آج
یہ ساحر ہے قیامت اک دغل باز
عبث تم نے کیا ہے اس کو دم ساز
نہ ہو ایسا کسی دن یہ بد اختر
بلائے تازہ لاوے تیرے سر پر
کہا اس کا سنا ہرگز نہ مانو
اسے تم آستیں کا سانپ جانو
یہ سن سن کر سخن وہ منفعل تھا
نگوں سر اپنے کہنے سے خجل تھا

قضا بن آئی تھی واں اس کو کوئی بات
کہ وہ سہ لایا اس پر قہر کی رات

رتن کو سب کے کہنے سے ڈر آیا
نہایت دل ہی دل میں خوف کھایا

کہا القصّہ ہو راجہ نے برہم
ہے صحبت اس کی مجھ کو واقعی سم

کہو اس سے نہ میرے شہر میں آئے
کسی جانب کو یہ یاں سے نکل جائے

ہوا تھا بس کہ عالم میں وہ محجوب
یہ کہہ کر دل میں اب رہنا نہیں خوب

کفِ افسوس باہم اپنے مل کے
چلا خجلت زدہ گھر سے نکل کے

ہوا معلوم جس دم یہ پدم کو
کہ اس بستی سے نکلا آج راگھو

بلا کر زیرِ منظر اپنے فی الحال
لگی کہنے اسے اے نیک افعال!

تری تقدیر نے تجھ کو نکالا
کہ لائی سر پہ تیرے روز کالا

بہت کی میں نے راجہ سے شکایت
ولے مانی نہ اس نے کچھ حمایت

حقِ خدمت ہے تیرا ہم پہ بسیار
و لیکن میں خوشی راجہ سے ناچار[۱]

۱- نسخۂ لکھنؤ : و لیکن جو خوشی راجہ کی لاچار۔

غرض کر اس پہ دل سے مہربانی
لگی کہنے بہ اشفاقِ نہانی
یہ جو پازیب میری بے بہا ہے
جواہر اس میں لاکھوں کا لگا ہے
جہاں تیرے تئیں کچھ بے زری ہو
بقیمت اس کو دیجو جوہری کو
بصد الطاف دی پازیب لا کے[1]
کہیں تو بیچ لینا اس کو جا کے
غرض رخصت ہوا پازیب لے کے
دعائے خیر پدماوت کو دے کے
پس از قطعِ منازل بے سر و پا
جہاں آباد میں جا کے وہ پہنچا
جو واں درجِ خلافت کا گہر تھا
علاء الدین خلجی تاجور تھا
مقرّر اس پہ تھی عالم پناہی
کرے تھا ہند کی وہ بادشاہی
نہایت داد رس اور کامراں تھا
خدا کا فضل عالم پر عیاں تھا
کروں کیا شان و شوکت اس کی تقریر[2]
بجا ہے مولوی جامی کی تحریر
"فلک در خیلش از جوزا کمربند
ظفر پابندِ تیغش سخت پیوند"

۱- نسخۂ لکھنؤ : کر (ردیف) - کہا (آغاز مصرعہ ثانی) -
۲- نسخۂ لکھنؤ : دونوں مصرعوں کے قوافی مقدم مؤخر ہیں -

"ہمہ اسبابِ شاہی حاصل او
نماندہ آرزوئے در دلِ او"
جہاں آباد میں وہ خاطر آباد
اسی صورت رہے تھا با دلِ شاد
کہ اک دن روبرو راکھو نے جا کے
تماشائے طلسمی کچھ دکھا کے
کیا محظوظ شاہِ تاجور کو
دکھا کر خوب سا فضل و ہنر کو
جو دیکھا شاہ نے ہے مردِ دانا
حضوری کے موافق اس کو جانا
رکھا اس کو بصد اعزاز و اکرام
کہا آیا کرے یاں صبح اور شام[1]
جو صحبت شاہ سے اس کی بر آئی
تو وہ پازیب پھر اس کو دکھائی
ہوا مشتاق اس کو دیکھ کر شاہ
لگا کہنے اسے اے مرد آگاہ
یہ ہے پازیب کس کی کیونکہ پائی
کہاں سے سچ بتا تو[2] ہاتھ آئی
تجھے دی کس نے اور لایا کہاں سے
یہ تحفہ طرفہ تر، اعلیٰ جہاں سے
پری ہے حور ہے وہ یا ہے انساں
بتا ہے کون وہ رشکِ گلستاں

۱- نسخۂ لکھنؤ : ہر سحر شام۔
۲- نسخۂ ممتاز المطابع و نسخۂ نول کشور : یہ۔

نشاں اس کا مجھے دے وہ جہاں ہے
اور اس کی دوسری بھی دی کہاں ہے

جو دیکھا بادشاہ کو اس نے مشتاق
کہا یہ بات ہے مشہورِ آفاق

کہ ہے چتّور کا راجہ رتن سین
زمانے نے بھی[1] بخشا راحت و چین

یہاں سے چھوڑ کر اسبابِ شاہی
گدایانہ ہوا سنگل کو راہی

اٹھا کر سینکڑوں رنج و الم کو
ہے سنگلدیپ سے لایا پدم کو

کہوں کیا اس کا عالم قصّہ کوتاہ
کہ ہے روئے زمیں پر غیرتِ ماہ

سراپا رشکِ گل[2] سروِ رواں ہے
قیامت نازک[3] اور غنچہ دہاں ہے

اگر صاحب بھی اس کو دیکھ پاویں
یقیں تو ہے بہت سا حظ اٹھاویں

نہیں صحبت سے اس کی وہ بھی شاداں
کہ ہے راجہ رتن اک مردِ دہقاں

اسے کیا قدر اس نازک بدن کی
ملی ہے زاغ کو صحبت چمن کی

۱- نسخۂ لکھنؤ : زمانے کو ہے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : شکل گل -
۳- نسخۂ لکھنؤ : قامت -

یہ دی ترغیب شاہِ بحر و بر کو
ہوا وہ مستعد جی سے سفر کو
"نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حسن از رہِ گوش
ز جاں آرام برباید ز دل ہوش"
مسلّح کر کے لشکر اپنا فی الحال
چلا ہے[1] بادشاہِ نیک اقبال
لیے ہمراہ اپنے اس قدر فوج
کہے تو بحرِ بے پایاں کی ہے موج
ہزاروں فوج چینی[2] اور زنگی
فرانسیسی و رومی اور فرنگی
سپاہِ ہند لاکھوں زابلی تھے
ہزاروں ازبکی[3] اور کابلی تھے
غرض عجمی و عربی خیل در خیل
جدا ہر ایک کی ہر سمت کو ذیل
ہزاروں توپ خانہ اور شترنال
صدا سے جن کی ہو عالم میں بھونچال
بایں ساماں وہ شاہِ عشق در دل
گیا چتّور تک منزل بمنزل

۱- نسخۂ لکھنؤ : چلا وہ -
۲- نسخۂ لکھنؤ : حبشی -
۳- نسخۂ لکھنؤ : اوبجی -

قریب اس شہر کے جب جا کے پہنچا
کیا اک سمت دولت خانہ برپا
ہوا اک دشت میں لشکر کا ڈیرا
کئی منزل تلک جنگل تھا گھیرا
کہا دستور سے شہ نے خرد ور
رتن کو نامۂ شاہی رقم کر
کہ تا وہ دست بستہ روبرو آئے
جو ہو ارشاد عالی سب بجا لائے
ہماری بندگی سے کر ہو انکار
تو ہم آ پہنچے بارے ہاں خبردار

نامۂ عتاب آمیز بھیجنا سلطان علاء الدین کا رتن سین کے پاس اور آمادۂ جنگ ہو کر جواب لکھنا اس کا بادشاہ کو بے خوف و ہراس

خداوندِ جہاں کی بندگی میں جو نہ حاضر ہو
تو فرمانِ قضا جریان اس پر واں سے آتا ہے

الا اے ساقیِ سرمست و خود کام
میں آیا ہوں ترا سن دور سے نام[1]
وہ دخت رز جو ہیگی مستِ سرشار
نکال اب حجلۂ مینا سے اے یار
اگر دے گا تو میں ممنون ہوں گا
نہیں تو آخرش تجھ سے لڑوں گا

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : ہوں آیا دور سے سن کر ترا نام ۔

بس اب یاں سے دبیر شور انگیز[1]
رقم کرتا ہے نامہ ایک خوں ریز
ہوا مرشد سے جو دستور مامور
کیا نامہ رقم اس نے بدستور
پس[2] از توحید و نعتِ سرورِ پاکؐ
بیانِ معنیِ مضمونِ لولاک
کہ ہاں اے کوتوالِ شہر چتّور
نہیں رہتا فلک کا ایک سا دور
ہوئے یاں ما بدولت رونق افزا
تو پھر آستاں بوسی نہ آیا
درِ دولت سے شاید تو پھرا ہے
ہوا حاضر نہ ، موجب اس کا کیا ہے
اسی میں خیر ہے ، اب آ شتابی
قصورِ بندگی میں ہے خرابی
حضوری میں تو آ ، با خویش و فرزند
اگر رہنا ہے تجھ کو جگ میں خرسند
وہ سنگل سے ہے لایا جو کنیزک
اسے سنتے ہیں دانا اور زیرک
حضورِ خود بدولت لا آسے زود
کہ تیری اب اسی میں ہیگی بہبود
اگرچہ اس کے دینے میں ہے تاخیر
تو کیجے جنگ کی پھر جلد تدبیر

۱- نسخہ' لکھنؤ : شوق انگیز -

۲- اس شعر سے پہلے نسخہ' لکھنؤ میں عنوان ہے ''فرمان شاہی'' -

گیا جب یہ رتن کو نامۂ شاہ
ہوا وہ پڑھ کے اس مضموں سے آگاہ

رہا[1] یک چند چوں آئینہ حیراں
غضب سے ہو مثالِ بید لرزاں

جواب اس کا لکھا اس نے اسی دم
کہ اے فخرِ جہان و شاہِ عالم

کمی یاں فوج و حشمت کی تو کب ہے
تمھارا ہو ہمیں پاسِ ادب ہے

میں کچھ ایسا نہیں کمزور محتاج
کہ جس کو آپ کر لیویں گے تاراج

ہے سنگل سے جو آئی ماہ پارہ
طلب میں اس کی تھا جو کچھ اشارہ

یہ کہیے کون ایسا ہے وہ ناشاد
کرے ناموس و ننگ اپنا جو برباد

نہیں کچھ خوب ایسی لغو حرکات
تامل کر کے بہتر ہے کہو بات

اگرچہ جنگ کی جی میں ہے تدبیر
تو بسم اللہ ، کیجے پھر نہ تاخیر

جوابِ نامہ لکھ کر با دلِ تنگ
ہوا تیار شہ سے بر سرِ جنگ

جو کچھ اسباب جنگی ہووے درکار
ہوا سب بات کہنے میں وہ تیار

۱- نسخۂ لکھنؤ : اس شعر سے قبل عنوان ہے ''جواب نامۂ شاہی'' ۔

کیا سب بندوبست ایسا ہی دل خواہ
نہ پاوے جس میں لشکر غیر کا راہ
لگا ہر سمت توپیں اور بندوق
بنایا قلعے کو آتش کا صندوق
رکھی چاروں طرف آتش کی وہ مار
کہ جانا جس کے منہ پر سخت دشوار
بروجِ قلعہ پر لاکھوں سپاہی
جو لائیں دم میں عالم پر تباہی[1]
غرض در بند و خندق کر کے پُر آب
مہیّا جنگ کا کر سارا اسباب
مسلح ہو رہے جتنے تھے باہم
کہ ہے لڑنے کو آیا شاہِ عالم
جوابِ نامہ سن یاں شاہ فی الحال
سراپا قہر کی آتش سے ہو لال
لگا کہنے کہ ہیں ! یہ طفلِ دہقاں
نہ ہووے شوکتِ شاہی سے ترساں ؟
جوابِ نامۂ اقدس لکھے جنگ
مگر ہے زندگی سے اپنی دل تنگ[2] ؟
کہو ! جاویں غلامانِ وفا جو
اسیرِ دام تا کر لاویں اس کو[3]

۱- نسخۂ لکھنؤ : جو کر دیں کشتیٔ عالم تباہی -
۲- نسخۂ ممتاز المطابع میں یہ شعر نہیں ہے -
۳- نسخۂ ممتاز المطابع میں یہ شعر بھی نہیں ہے -

شتاب ان کافروں کو جا کے ماریں
ہر اک کا بارِ سر تن سے[1] آتاریں

کہوں کیا میں کہ فوراً حسبِ ارشاد
چلی اک خس پر جس طرح باد (کذا)

جو ہو کر مستعد وہ بر سرِ جنگ
چلی آئی سپاہِ برق آہنگ

ہوئے یہ بھی نکل کر تب صف آرا
دو جانب سے ہوا ہنگامہ برپا

نقیبوں کی صدائیں وحشت انگیز
وہ کڑکے ڈھاڑیوں کے اور خوں ریز

دو جانب کی صفیں جوں ابرِ تاریک
خروشاں رعد ساں آئیں جو نزدیک

لگا چھٹنے ہر اک سو توپ خانہ
ہراساں جس کی آتش سے زمانہ

دھوئیں میں اس طرح اڑ جائے رنجک
کہ جوں بادل میں مارے برق چشمک

نکلنا توپ سے گولے کا رخشاں
گھٹا میں جس طرح مہر درخشاں

وہ بندوقوں کی چھٹنا ہر طرف باڑھ
کہ شمشیرِ اجل میں ان سے تھی باڑ[2]

یہ گولہ سرخ نکلے تھا شتابی
شبِ یلدا میں جوں تیرِ شہابی

۱- نسخۂ ممتاز المطابع : بار تن سر سے -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کہ جن کی سینۂ مرداں سوا آڑ -

کہوں کیا میں ہوا جو تیر باراں
جوانوں نے پیا بس آبِ پیکاں
کروں کیا دشنۂ نازک کی تقریر
کہ پہلو ان سے تھی قندیل پر تیر
بایں صورت غرض وہ جنگ کرتے
بہم زخمی ہو گرتے اور مرتے
در آوردہ ہوئے لشکر وہ یک بار
لگی چلنے بہم دونوں میں تلوار
ہوئے کفار کچھ گولوں سے فی النار
ہوئے کچھ آب نوشِ تیغِ خوں خوار
رہے باقی سو ہو کر سخت بیدل
ہوئے جا کر حصار اپنے میں داخل
شرارِ فوجِ شاہی سے ہو بے تاب
اڑے اپنی جگہ سے مثلِ سیماب
ہوا از بسکہ غالب لشکرِ شاہ
کہ تھی یہ فوج سب کے حسب دل خواہ
گئے جو فوجِ شاہی میں سے مارے
بلا تکرار جنت کو سدھارے
نوید فتح شہ کو جو سنائی
کہ جیتی غازیوں نے جا لڑائی
رہے مرنے سے باقی جو کہ مقہور
حصارِ شہر میں اب ہیں وہ محصور
سو ہم نے ہے حصار شہر گھیرا
جو فرماؤ کریں اس جا پہ ڈیرا

نوید فتح سن کر یہ خدا داد
ہوئے اعلیٰ و ادنیٰ خرم و شاد
شتابی شاہ نے منگوا سواری
کری چلنے کی اودھر کو تیاری
جب آیا شہ بہ فوجِ چند در چند
ہوئے وہ غازیانِ جنگ خرسند
آدھر سے بے فکر وہ غارت گرِ ننگ
ادھر یہ فوجِ شہ آمادۂ جنگ
اٹھا کر ہاتھ کو تیغ و سناں سے
لگے کرنے بہم تیر و کماں سے
آدھر سے گولیاں ، ایدھر سے گولے
برسنے پھر لگے جس طرح اولے
یہ گردا گرد اور وہ گڑھ میں سب بند
شکست ان کو نہ ان کو فتح تا چند
کیا گو آب و دانہ ان کا مسدود
ولے بے فکر تھے تو بھی وہ خوشنود
کہ تھا سامان واں برسوں کا تیار
علوفہ ان کو مطلق تھا نہ درکار
صحر سے شام تک کرتے سدا جنگ
سنا کرتے سحر تک بربط و چنگ
حصار شہر تھا وہ سنگ اژدہات
نہ پہنچے جس پہ کچھ صدمہ نہ آفات
ہراسِ شہ ، نہ فکرِ آب و دانہ
وہیں موجود اشیائے زمانہ

نہ ٹوٹی جب کہ وہ سدِّ سکندر
ہوا لڑنے سے عاری شہ کا لشکر
اسی صورت غرض گزرے کئی سال
کہ وہ سرکش ہوئے ان سے نہ پامال
بہ تنگ آئے نہ وہ اور یہ ہوئے تنگ
ہوئی وہ جنگ آخر باعثِ ننگ
کہا شہ نے کہ ہے مقصود جانا
غرض ہونا ہے رسوائے زمانہ
فریب اس کو کسی صورت سے دیجے
جو ہاتھ آوے تو اس کو قید کیجے
بہر صورت اگر یہ ہاتھ آوے
تو بارے کچھ ندامت ہم سے جاوے
وزیروں سے بلا کر ، کی یہ تقریر
بہ ایں مضموں کرو فرمان تحریر
ہوا ہم کو بوجہِ خوب اظہار
کہ پدماوت کا ہے تو عاشقِ زار
نہ تھا کچھ کام گرچہ اس کا لینا
دلِ غمگیں کو تیرے داغ دینا
بہ دل تھا اس کا لینا ہم کو مرغوب
ولے عاشق کُشی ہوتی نہیں خوب
تری ان محنتوں پر اب نظر کی[1]
طرف اپنی سے وہ رشکِ چمن دی

۱- نسخۂ لکھنؤ : آبرو کی -

معاف اب ہم نے کی تیری خطا سب
حضوری میں بلا وسواس آ اب
ارادہ خود بدولت کا ہے بالجزم
کہ کیجے اپنے کشور کی طرف عزم
تو آ اب بندگی میں جلد خوش حال
کہ خلعت ملک کا دیں تجھ کو اور مال
تجھے وسواس ہو آنے سے آیا
تو ہووے ہی سا بدولت رونق افزا
روانہ کر کے راجہ کو یہ فرمان
چلے ملنے کو اس کے آپ سلطان
گیا جب پاس اس کے نامۂ شاہ
کہ وہ فرمان تھا آبِ تہہِ کاہ
کھلا اس پر جو وہ نامے کا مضمون
کہ تھی جس کی عبارت سحر و افسون
مٹی ساری غرض دل سے کدورت
یہ جانا اب ہوئی بچنے کی صورت
کہ شاہ بحر و بر تنہا ہے آتا
نہ سمجھا یہ کہ ہے اقبال جاتا
سمجھ کر دور سر سے اپنی آفت
ہوا خوش حال مشغولِ ضیافت
کہ اس میں شاہ بھی بہ چند اشخاص
کرم فرما ہوا از راہِ اخلاص
رتن نے بے تکلف دیکھا جب شاہ
قدم بوسی کو آیا بر سرِ راہ

سجایا تھا جو وہ دیوان خانہ
بٹھایا لا بآدابِ شہانہ
جو بیٹھا واں وہ شاہ بحر اور بر
نثار اس پر کیے لعل اور گوہر
ہزاروں تحفجاتِ ہفت کشور
کیے تھے نذرِ شاہِ دادگستر
ہزاروں ترکی و تازی قدم باز
نسیمِ صبح سے خوش در تگ و تاز
کئی سو فیل منگوائے سبک رو
کجک[1] سر پر جنھوں کے ہو مہِ نو
ہزاروں پارچے وہ رنگ در رنگ
ہو جن پر نورباف چرخ بھی دنگ
غرض یہ لے چکا جب نذر سلطان
وزن سے پھر کیا ارشاد اب ہاں
عمارت اور مکاں منزل بمنزل
دکھا چل کر کہ ہے یوں چاہتا دل
نئے نقشے اگر ہم کو نظر آئیں
تو پھر ایسے ہی ہم بھی جا کے بنوائیں

پدم کا عکس پڑنا آئینے میں اور ولولۂ عشق پیدا ہو جانا بادشاہ کے سینے میں - پھر قید ہو کر وطن سین کا دہلی میں آنا اور پدم کا چتور میں مارے غم کے حال تغیر ہو جانا

کہوں کیا عشق کی باتیں کہ یہ دیدار معشوقاں[2]
فریب و مکر کیا کیا عاشقوں کو آ سجھاتا ہے

۱- کجک : اسمِ مذکر ، فیل بانوں کا آنکس (فرہنگِ آصفیہ ، جلد سوم ، صفحہ ۳۷۷) -
۲- نسخۂ لکھنؤ : کہ پھر دیدِ معشوقاں -

اٹھ اب اے ساقیِ فرخندہ فرجام
کہ ماہِ چاردہ ہے بر لبِ بام
پلا وہ مے کہ جس کا نشہ اے یار
بہ چشمِ دل دکھا دے روئے دلدار
ہوئی فکرِ سخن میں طبع پھر کند
پلا وہ مے کہ ہووے تیز اور تند
ہوا شہ کو جو شوقِ صحن اور بام
حقیقت میں نہ تھا کچھ سیر سے کام
مگر راگھو جو تھا ہمراہ آیا
سرِ فتنہ تھا یہ جس نے اٹھایا
سکھائی شاہ کو تھی اس نے یہ بات
کہ ہاں جب کیجیے سیرِ مکانات
کہوں میں جس جگہ واں بیٹھ جانا
اور اپنے آگے آئینہ رکھانا[1]
اسی جا کیجیے یک چند آرام
کہ تا وہ مہروش آوے سرِ بام
تماشا کچھ نیا ہوتا ہے جس جا
ہیں آتی عورتیں بہرِ تماشا
یقیں ہے دیکھنے کو آئے گی واں
لبِ بام آوے وہ مہرِ درخشاں
کئی ہمراہ ہوں گی ماہ پارہ
ولے اس پر میں کر دوں گا اشارہ

۱- نسخہ ممتاز المطابع : منگانا۔

غرض اس شکل اس کو دیکھ لیجو
پھر آگے جو کہ بن آوے سو کیجو
سو راگھو سے یہ کر کے مشورت شاہ
کہ تھی یہ مصلحت بس حسبِ دلخواہ
رتن کالے کے اپنے ہاتھ میں ہاتھ
چلا سیرِ عمارت کے تئیں ساتھ
مکاں سب دیکھ جوں گلزار رنگیں
کرے تھا موقع موقع سب پہ تحسیں
کسی نقشے کو کہتا خوب ہے یہ
ہمارے دل کو بھی مرغوب ہے یہ
غرض یہ کہ دیکھا ہر اک در و بام
پھرے تھا سیر کرتا کام ناکام
کہ اس میں اک محل کے متصل آ
کیا راگھو نے آنکھوں سے اشارا
سمجھ کر اس کو وہ شاہِ خردور
ہوا کرسی نشیں بس زیرِ منظر
بہت سا دیکھ اس رنگیں مکاں کو
کہ دیکھے جیسے بلبل بوستاں تو
رتن سے کر کے فوراً کچھ بہانہ
منگا کر جلد آئینہ و شانہ
رکھ اپنے روبرو آئینہ یک بار
کیا شانہ ، پھر اپنی باندھی دستار
وہ آئینہ کہ جامِ جم سے بہتر
اگر دیکھے تو حیران ہو سکندر

دکھا تو لا کے پر راجہ نہ سمجھا
کہ بھیدی گھر کا ہے لنکا کو ڈھاتا[1]

نہ سوچا دل میں کچھ وہ خاک بر سر
کہ اس آئینے میں کیا کیا ہیں جوہر

غرض دستار کی بندش نہ بوجھا
بتانا شہ کی پگڑی کا نہ سوجھا

کہاں راجہ کو عقل اور نکتہ چینی
سمجھتا شہ کی جو وہ نکتہ بینی[2]

غرض وہ سادگی سے فارغ البال
لگہ پرہا کھڑا تھا شاد و خوش حال

برنگِ آئینہ با چشمِ حیراں
ادھر یہ منتظر بیٹھا تھا سلطاں

کہ اس میں واں پدم کو شاد و خرم
لگیں ترغیب دینے اس کی ہمدم

کہ اے تصویر رشکِ چین و ارژنگ
نگہ کر تو برنگِ چرخِ نیرنگ

زمانے پر ہے کیا کیا رنگ لاتا
نئے نقشے ہے عالم کو دکھاتا

ذرا اس بات کو تو دل میں کر غور
کہاں سنگل کہاں دہلی و چتّور

تو کس کس شکل سے سنگل سے آئی
کہ اس کو جانتی ہے سب خدائی

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : بس ڈھاتا لنکا۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ : شالم بینی -

کہاں دہلی کا سلطان یاں تک آوے
عبث تیرے لیے زحمت اٹھاوے

کر اپنا ننگِ شاہی مفت برباد
کوئی دن کو چلا جاوے گا ناشاد

ہمیں رہ جانے کا دل میں پریکھا
کہ آیا شہ پر آنکھوں نہ دیکھا

وہ زیرِ غرفہ اب بیٹھا ہے آ کر
چلو تو دیکھ لیویں اس کو جا کر

پدم بھی سن کے بولی اس سے کیا خوب
مجھے بھی دیکھنا اس کا ہے مرغوب

غرض لے ساتھ کتنی ماہ پارہ
لبِ بام آئی وہ بہرِ نظارہ

دریچے سے جوہیں چلمن اٹھائی
سراپا صورت آئینے میں آئی

وہ صورت تھی کہ تھا کچھ سحر و افسوں
کہ بس شہ کی ہوئی حالت دگرگوں

ادھر تو دیکھ شہ کو وہ پری رو
معِ ہمدم گئی اپنے مکاں کو

نظر پڑتے ہی یاں ان کو غش آیا
کہے تو ہو گیا پریوں کا سایا

رتن نے اس کا وہ[2] آنا نہ دیکھا
یہاں سے جھانک کر جانا نہ دیکھا

۱۔ نسخہ شیرانی : اس شعر کے بعد ۱۱ اشعار ندارد ۔
۲۔ نسخہ لکھنؤ : نظر نے اس کا واں ۔

جو حالت غش کی دیکھی شہ کے اوپر
لگا راگھو سے کہنے[1] ہو کے مضطر
کہ بارے کہہ تو اے فرخندہ افعال
ہؤا کیا قبلۂ عالم کا احوال
کہا اس نے کہ جو تھا پان کھایا
سو یہ غش ان کو ہے گرمی سے آیا
غرض اک دیر میں آیا اسے ہوش
کیا دونا شرابِ عشق نے جوش
چلا دیوان خانے کو بہر حال
خرامِ ناز کا پر اس کے پامال
ٹھہر کر اک دو ساعت اور منگا تخت
ہوا تشریف فرما وہ جواں بخت
پیادہ پا رتن بہرِ سعادت
چلا کتنے قدم از راہِ خلعت[2]
گلے سے اپنے شہ نے جلد یک بار
دیا بس اس کو مروارید کا ہار
بجا لاتا ہوا آداب وہ اور
قدم چندے چلا پھر رائے چتّور
کیا کچھ اور بھی تحفہ عنایت
اسی صورت غرض کرتے رعایت
کہ لے تجھ کو دیا یہ ملک اور مال
لے آیا در تلک اس کو بہرحال

۱- نسخۂ لکھنؤ : رتن راگھو سے بولا -
۲- نسخۂ لکھنؤ : خدمت -

کہا شہ نے کہ لایا اس کو واں سے
عجب ہے پھر کے اب جاوے یہاں سے
کسی صورت یہ ہووے در سے بیروں
تو جانو کر گیا تاثیر افسوں
دیا اپنا دوشالہ ، کی یہ تقریر
کہ بخشا ملک تجھ کو تا بہ کشمیر
وہ ناداں سادہ لوحی سے ہو خرسند
حصارِ شہر سے نکلا قدم چند
تھے واں دستے غلاموں کے چھپائے
نکلتے ہی رتن کے گرد آئے
کیا شہ نے اشارہ ان کو یک بار
کہ ہاں فرصت ہے کر لیویں گرفتار
رتن تو سادہ دل تنہا وہاں تھا
فریبِ شاہ کب اس پر عیاں تھا
یہ سچ ہے جو عدو کو دوست جانے
لگے گا آخرش اک دن ٹھکانے
نہ سمجھا تھا غرض وہ صاحبِ اوج
کہ ہے بیرونِ در پوشیدہ اک فوج
وگرنہ یاں تلک وہ پا پیادہ
نہ تنہا آنے کا کرتا ارادہ
وبالِ جاں غرض وہ سادہ پن تھا
و الا" ہاتھ آتا کب رتن تھا
ہوا القصہ وہ جس وقت قیدی
اسے جیسے ہوئی بس نا اُمیدی

کیا دربانوں نے در بند فی الحال
کہ فوجِ شہ بہ آوے اپنے دنبال
مبادا فوجِ شاہی یاں گھس آوے
تو باقی سائبوں پر پھر قہر لاوے
غرض لائے رتن کو قید کر کے
کہ جوں صیّاد لاوے[1] صید کر کے
اسے لے بادشہ ایدھر کو آیا
ہوا واں قلعے میں اک شور برپا
پدم نے یہ خبر جس وقت پائی
کہوں کیا ایک حالت اس پہ[2] آئی
گریباں پھاڑ منہ سے خاک ملتی
شرارِ غم سے مثلِ شمع جلتی
ہوا اعلیٰ و ادنیٰ پر زبس غم
کہ سب دفتر ہوا اک بار برہم
کہوں کیا ان کا میں حالِ پریشاں
کہ تھا چھوٹا بڑا حیران و ترساں
ادھر ان سے نہ بن آئی کوئی بات
گیا ہاتھوں سے راجہ وائے ھیہات
اُدھر لے بادشہ راجہ رتن کو
چلا ہو شادماں[3] اپنے وطن کو

۱- نسخۂ لکھنؤ : شاداں ۔
۲- نسخۂ لکھنؤ : ایک اس پر آفت ۔
۳- نسخۂ لکھنؤ : چلا مسرور وقت ۔
۴- نسخۂ لکھنؤ : نہ ہیبت ۔

یہ ہیبت شاہ کے دل میں سمائی
کہ فکر ان سے نہ مطلق کچھ بن آئی

کہوں کیا شہ پس از قطعِ منازل
ہوا شاداں غرض دہلی میں داخل

رتن کو در مکانِ[1] چند در چند
اسیروں کی طرح رکھتا نظر بند

رہا وہ بھی غرض با نا امیدی
بصد اندوہ و حسرت ہو کے قیدی

ہوا وصلِ صنم سے اپنے مایوس
ملے تھا رات دن وہ دستِ افسوس

بھیجنا بادشاہ کا ایک عورتِ طرار کو چتور کی طرف جوگن کے بھیس میں اور بہ سبب نہ ہاتھ آنے پدم کے پھر آنا اس کا اپنے دیس میں

کہوں کیا تم سے میں اس چرخِ کج رفتار کی گردش
یہ مایوسِ وصالِ یار کو پھر پھر ستاتا ہے

پلا دے جام اے ساقیِ پرجوش
اڑا دے جو کہ میرے یک بیک ہوش[2]

جو گزرا قید میں راجہ کو یک سال
کہ اک روز شہ نے ہو کے بے حال

رتن کی قید سے مطلب نہ پایا
تب اس نے اور یہ حیلہ اٹھایا

۱- نسخۂ لکھنؤ : درمیان -
۲- یہ شعر نسخۂ لکھنؤ کے سوا کسی دوسرے نسخے میں نہیں - چونکہ تمام عنوانات ساقی سے خطاب کے ساتھ شروع ہوتے ہیں ، اس لیے اس شعر کو حاشیے کی بجائے متن میں رکھنا زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے -

کہ اک عورت بلائی خوب ہشیار
نہایت زیرک و دانا و طرّار
بہ سن ِ چاردہ اور شکل میں حور
سراپا سے جھلکتا جوبن اور نور
کہا اس سے کہ دوں گا ملک اور مال
زمانے میں رہے جس سے تو خوش حال
ولے کچھ مکر کر تو یاں سے جاوے[1]
فریبوں سے ہمدم کو لا ملاوے
دل و دیدہ کو ہووے چین و فرحت[2]
جدا ہو ہجر کی دل سے یہ کلفت
وہ بولی اے شہ ِ فرخندہ افعال
رہے قایم یہ تیرا جاہ و اقبال[3]
مجھے ہے یاد ایسا مکر و تلبیس
کہ ہے شاگرد میرا جس میں ابلیس
غرض اس فن میں ایسی ہوں خرد مند
کروں جس سے فلک میں خرقہ پیوند
اگر کہیے کہ لا جا کر کوئی حور
قصور اس میں نہ ہو مجھ سے بمقدور
زبس یہ فن بہ از جادو گری ہے
مری ہر بات تسخیر ِ پری ہے

۱۔ نسخہ ٔ لکھنؤ : ولے کچھ مکر تو یاں سے چلاوے ۔
۲۔ نسخہ ٔ لکھنؤ : فرحت ۔
۳۔ نسخہ ٔ لکھنؤ : ترا یہ ملک اور مال ۔

پدم کا جا کے لانا کام کیا ہے
نہ لاؤں میں تو میرا نام کیا ہے[1]

فلک پر ہو تو میں لاتی ہوں جا کر
پدم کیا چیز وہ تو ہے زمیں پر

سنا کر شاہ کو سب مکر اور فن
بنی القصہ وہ مکار جوگن

پہن کر سب لباسِ کہربائی
سراپا شکل جوگن کی بنائی

وہ مندرے کان میں غارت گر ہوش
دلِ عالم ہو جس کا حلقہ در گوش

وہ حلقہ سر پہ جیسے مہ پہ ہالا
اور اک کاندھے پہ رکھے مرگ چھالا

بھبھوت اپنے وہ تھا منہ پر لگایا
کہ آئینے کا جس نے ہوش اڑایا

ادھر اودھر وہ سر کے بال چھوڑے
غرض دنیائے دوں سے منہ کو موڑے

بہ ایں صورت وہ دانائے زمانہ
ہوئی چتّور کی جانب روانہ

پس از قطعِ منازل چند در چند
جوہیں چتّور میں آئی وہ خرسند

ہوا سب شہر میں اس کا یہ شہرہ
کہ اک جوگن ہے آئی رشک زہرہ

۱- نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد -

نہیں دیکھی کسی نے ایسی جوگن
سراپا درد اور غم کی بروگن

پدم نے دھرم سالا تھی بنائی
کہ تا راجہ کی ہو مشکل کشائی[1]

کہ جو تازہ مسافر یاں پہ آئے
مسافر خانے میں آرام پائے

فقیر آوے تو وہ آرام یاں لے
رتن کی کچھ رہائی کی خبر دے

کوئی ایسا خرد ور ہاتھ آوے
کہ وہ تدبیر ملنے کی بتاوے

غرض جو وارد و صادر تھا آتا
پدم کو سرگزشت اپنی سناتا

وہاں آئی وہ جوگن رشکِ شمشاد
بظاہر یاد سے دنیا کی آزاد

مسافر خانے میں آ کر وہ پُر فن
جو بیٹھی جوگیانہ مار آسن

بچھا کر مرگ چھالا اک جگہ پر
دھیان اور گیان میں کہتی تھی ہرہر

خبر پہنچی پدم کو گھر میں جس دم
کہ اک جوگن سراپا درد اور غم

تمھارے دھرم سالا میں ہے آئی
عجب ہے شکل کچھ اس نے بنائی

۱- نسخۂ لکھنؤ : پدم نے دھرم سالے تھے بنائے
کہ راجہ قید سے چھٹ کر کے آئے

یہ سنِ چاردہ ، رشکِ پری زاد
سوا ہر ہر کے اس کو کچھ نہیں یاد
دھیان اور گیان میں وہ نازنیں ہے
کوئی دم یاد سے خالی نہیں ہے
نہیں چھوٹا وہ اپنا فقر کرتی
ہے ہردم دل کو یادِ حق سے بھرتی
جو اٹھتی بیٹھتی وہ مہ لقا ہے
سہارے کو عصا یادِ خدا ہے
دم اپنے کی ہے سارنگی بناتی
اسی اک تار کو ہردم بجاتی
غرض جو چاہیے عشاق کے راز
نکالے ہے اسی پردے سے آواز
سنے کوئی تو ایسا بولتی ہے
سخن میں لاکھوں عقدے کھولتی ہے
سنا رانی نے اس کا حال جس دم
تو بولی اس سے وہ مجموعۂ غم
کہ ہاں ری! ہے کوئی ؟ جلدی سے جاؤ
کہاں ہے اس کو ہاتھوں ہاتھ لاؤ[1]
اگر وہ دردِ دل سے آشنا ہے
تو میرے درد کی مشکل کشا ہے
جو پوچھوں اس سے میں کچھ راہ کی بات
کہے مجھ سے وہ منزل اور مقامات

۱- نسخۂ لکھنؤ میں قوافی : جائے — لائے۔

سخن کوئی مجھے ایسا بتاوے
کہ جو یہ پردۂ دوری اٹھاوے
پدم کے سامنے جوگن جب آئی
اور اپنی اس نے وہ صورت دکھائی
بٹھا کر اس کو با اعزاز و اکرام
یہ پوچھا اس سے پھر اے نیک فرجام
تمھاری عمر چھوٹی اور بڑا دکھ
کہو تم پر یہ ایسا کیا پڑا دکھ
یہ صورت اور تمھاری نوجوانی
عبث کھوتی ہو اپنی زندگانی[1]
لیا کس واسطے یہ جوگ تم نے
اٹھایا سر پہ کیوں یہ روگ تم نے
کہاں سے آئی اور جاتی کہاں ہو
تم ایسی کس لیے بے خانماں ہو
اٹھائے جس لیے رنج و صعوبات
حصولِ مدعا کی کہیے کچھ بات
تمھیں جس کی طلب یہ جابجا ہے
وہ کیا شے ہے، تمھاری ذات کیا ہے
کہا جوگن نے رو کر سن اے رانی
کہوں کیا تجھ سے میں اپنی کہانی
بڑا قصہ ہے میرا اور بڑی بات
بتاؤں کیا تجھے میں قوم اور ذات

۱- نسخۂ ممتاز المطابع: نوجوانی -

مگر ناچار اتنا بولتی ہوں
گرہ احوالِ غم کی کھولتی ہوں
مجھے جو دیکھتی ہو سینہ پُر خوں
سو میں اک خاندانِ عمدہ سے ہوں
رہے تھی اپنے گھر میں خرّم و شاد
سوائے عیش و عشرت کچھ نہ تھا یاد
تھی مجھ میں اور مرے شوہر میں الفت
بہم رہتی تھی نت سرگرمِ صحبت
سو عرصہ اک برس کا ہو چکا ہے
کہ مجھ سے میرا شوہر گم گیا ہے
ہوئی میں عشق سے اس کے جو دل تنگ
پھر آخر کر حیا و ننگ سے جنگ
نہ کھانا مجھ کو بھاتا ہے، نہ پینا
ہے اس بن بس مجھے دشوار جینا
لٹا گھر بار بن کے شکلِ جوگن[1]
طلب اس کی میں نکلی ہوں بروگن
جہاں تک ہے زیارت اور مقامات
جنھیں کہتے ہیں تیرتھ شہر دیہات
گئی اس کی طلب میں جا بجا میں
کسی جاگہ نہ دیکھا نے سنا میں
ورود اپنا ہوا دہلی میں جس دم
رہی اس کی تلاشی واں میں[2] پر غم

۱- نسخۂ لکھنؤ میں قواف : جوگی—بروگی -
۲- اسخۂ ممتاز المطابع : واں بھی -

اسی صورت سے اک دن سیر کرتی
غمِ شوہر میں روتی اور مرتی
جدھر کو تھا وہ زنداں خانۂ شاہ
گئی میں سیر کرتی واں پہ ناگاہ
ہزاروں راج بنسی قید تھے واں
وہ زنداں خانہ تھا اک چاہِ کنعاں
فقیرانہ جو دیکھی میری صورت
ہر اک نے کی بہت تعظیم و حرمت
جہاں تک تھے وہاں پر قید مغموم
کیا احوال سب کا میں نے مفہوم[1]
ولے ان میں جو اک راجہ رتن ہے
غضب ہی اس پہ کچھ رنج و محن ہے
ہوئی دریافت اس کی جب کہ مشکل
تو اس کے غم میں میرا جل گیا دل
یہ ٹھانی یاں سے پھر اب سیر کیجے
اسے چتّور میں چل دیکھ لیجے
یہ جس کے غم میں یاں قیدی ہوا ہے
بھلا اس کا تو دیکھوں حال کیا ہے
کہ جس کا عاشق ایسا ہو یہاں بند
رہے معشوق اس کا کیونکہ خرسند
سو تیرا دیکھنا تھا بس مجھے کام
چلی میں یاں سے، کیجے آپ آرام

۱۔ نسخۂ لکھنؤ : شعر ندارد ۔

آدھر جوگن تھی یوں سر گرمِ گفتار
ہدم سے تھا ادھر اک نالۂ زار
کہا اس سے ہدم نے اے بروگن
چلوں گی میں بھی بن کر شکلِ جوگن
کرو تو بن میں داسی تیری ہوں گی
بنوں کی جوگن اور مل کر رہوں گی
مجھے لے چل جہاں ہووے رتی میں
کہ اس بن ہوں میں بے آرام و بے چین
ہوئی جوں ہی ہدم تیار رفتن
تو دل میں خوش ہوئی مکار جوگن
کہ چلنے کی ہدم نے کی جو تدبیر
مرے سحر و فسوں نے کی ہے تاثیر
ہدم کی تھیں جو ہمرازان و محرم
انھوں نے دیکھ کر یہ حالتِ غم
فریبندہ سمجھ جوگن کی باتیں
سمجھ کر اس کی سحر آمیز گھاتیں
کہا اس سے کہ بس آگے نہ بولو
زباں مکر و فسوں پر اب نہ کھولو
اگر ہو بھیک لینا تم کو درکار
سدھارو لے کے اور لاؤ[1] نہ تکرار
تمھارے مکر ہم سب جانتے ہیں
یہ لا حاصل ہے، کب ہم مانتے ہیں

۱- نسخۂ لکھنؤ : کیجو ۔

چلو تشریف لے، یاں سے سدھارو
اسی میں خیر ہے بس دم نہ مارو
نکلوا کر غرض جوگن کو فی الفور
پدم سے یوں کہا ٹک کیجیے غور
کہ اے رانی نہ جوگن ہے یہ جوگن
یقیں ہے یہ زنِ مکار پُر فن
تمھیں یہ اشتعالک دے کے رانی
کیا چاہے ہے جوگن اور دیوانی
علاء الدیں کی یہ بھیجی ہے آئی
جو اس نے اپنی صورت یہ بنائی
تمیز و عقل سے تو بہرہ ور ہے
تو اس کو دیکھ سر تا پا ضرر ہے
یہ آیا کیا تمھاری فکر میں آج
کہ اپنا چھوڑ کر سب ملک اور راج
فریب و مکر پر لوگوں کے چلنا
بظاہر بھیس لوگوں کا بدلنا[1]
سمجھ کر یار، دے کر ہاتھ میں ہاتھ
نکل چلنا کسی مکار کے ساتھ
فقیری ترکِ پوشش کا نہیں نام
لباسِ لو سے کچھ حاصل نہیں کام
کرو ظاہر میں بیٹھی تم امیری
ولے موقوف دل پر ہے فقیری

۱- نسخہ لکھنؤ : فریب و مکر سے ہو کر دیوانہ
بظاہر کر لباسِ جوگیانہ

بظاہر نفس کافر ہے پھراتا
نہیں پھرنے سے کچھ مطلب پر آتا
فقیری چاہیے ہو آب و گل میں
دھیان اپنا رکھو تم دل ہی دل میں
نہ سمجھو آشنا بیگانے کی بات
نہ دل پر آنے دو باطل خیالات[1]
کدورت سے جو دل ہو صاف اے ماہ
نظر آ جاوے دل ہی دل میں دل خواہ
یہ عورت جو بہ شکلِ جوگیاں ہے
فریبِ نفسِ امّارہ عیاں ہے
کرے گر نفسِ کافر پیشوائی
نہ ہو منزل تلک ہرگز رسائی
مگر رہبر کوئی ایسا ہی ہاتھ آئے
تو ہاں البتہ اس سے راہ تو پائے
چلو 'گورا' و 'بادل' پاس رانی
کہو ان سے یہ سب غم کی کہانی
جو اے رانی تم ان کے پاس جاؤ
یقیں تو ہے کہ مطلب دل کا پاؤ
سنا سکھیوں سے یہ جوں ہی پدم نے
کہا پھر اس مریضِ درد و غم نے
کہ اچھا کیجیے گورا سے تقریر
کہ لاوے جا کے راجہ کو بہ تدبیر

۱۔ نسخہ ممتاز المطابع ناقص الآخر اور اس شعر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کے چار سو چوبیس اشعار نہیں ہیں۔

گورا و بادل ہمشیرہ زادۂ رتن سین کا دہلی میں جانا اور بزور تدبیر اس کو چھڑا کر چتّور میں پہنچانا

تماشا چرخ کی نیرنگیاں دیکھو کہ عاشق کو
چھٹا کر یار سے قیدی بنا کر پھر چھٹاتا ہے

پلا ساقی شرابِ پرتگالی
کہ جس سے رنگ و رو پر ہو بحالی
پلا کر جامِ مے بس شاد کردے
کہ ہوں محبوسِ غم، آزاد کردے
رتن قیدی رہا جو یاں مہِ چند
اسے آزاد کر دوں اور خرسند
کہ واں دردِ رتن سے ہوکے بے تاب
پدم نے ترک کی تھی سب خور و خواب
وبالِ جاں تھی اس کو زندگانی
کہ تھی اس پر بلائے ناگہانی
نہ تھا اس غم زدہ کو چین و آرام
تڑپنا اور رونا اس کا تھا کام
رتن کے تھے جو دو ہمشیرہ زادے
سپاہی اور بڑے عالی ارادے
انھوں کا نام تھا گورا و بادل
سپہ سالار، منصف اور عادل
کہا ان سے یہ جا یوں ہی پدم نے
اسیرِ پنجۂ درد و الم نے

کہ اے چشم و چراغانِ رتن سین
رتن بن کیونکر آتا ہے تمھیں چین
کہ جس کے تم سے ہوں دو شیر بازو
کریں دشمن اسیرِ دام اس کو!
حرارت مردمی کی تم میں گر ہو
تو اے فرزندو جا اس کی خبر لو
نہیں گر تاب و طاقت تم میں زنہار
تو میرے سر پہ رکھو اپنی دستار
جو میری اوڑھنی ہے سر پہ ڈالو
نہ نکلو گھر سے اور چرخہ سنبھالو
علاء الدین سے جا کر میں لڑوں گی
رتن کو لوں گی یا میں جان دوں گی
یہ پدماوت سے سن کر سخت گفتار
ہوئے خجلت زدہ دونوں وہ سردار
لگے کہنے کہ اچھا ہم ہیں جاتے
بہر صورت ہیں راجہ جی کو لاتے
تسلی کر پدم کی قصۂ کوتاہ
چلے اک فوج لے کر جانب شاہ
سپاہی سینکڑوں جنگی بلا کر
ہزاروں میانوں میں دو دو بٹھا کر
پدم کا ساتھ لے کر خاص چنڈول
کہ قیمت جس کی ہفت اقلیم کا مول
بٹھا کر اس میں آہنگر کو پنہاں
دی اک مشتی، ہتھوڑا اور سوہان

پدم کی رکھ کے اس میں خاص پوشاک
فریب تازہ کر کے چست و چالاک
چلے دہلی کی جانب با دلِ تنگ
بہ ظاہر صلح لیکن پردے میں جنگ
یہ شہرت دی سبھی شہر و نگر میں
پدم راضی ہے ، آتی شہ کے گھر میں
رتن سے ہاتھ اٹھا کر بادل و جاں
ہوا چاہے ہے شہ کے گھر مسلماں
بایں شہرت جو ہندوستاں میں آئے
اور اس کا خاص ڈولا ساتھ لائے
رکھی پوشاک تھی اس میں معطرّ
بھنور قربان ہوتے جس پہ آ کر
ہزاروں گرد ڈولے اس کے باہم
کہ ہیں اس میں پرستارانِ ہمدم
بہ ایں صورت غرض وہ فوجِ مکار
ضرور آئی لبِ دریا جو یک بار
خبر سلطاں کو جلدی جا سنائی
کہ پدماوت حضوری میں ہے آئی
دمِ عشقِ مقدم بس ہے بھرتی
پس از آداب ہے یہ عرض کرتی
میں کفر اور کافروں سے ہوں گریزاں
کروں تلقینِ طریقِ دین و ایماں
رتن کو کیجیے رخصت تا کہ دو دم
کچھ اس سے ہم کو کہنا ہے کہیں ہم

مجھے کہنا ہے جو کچھ کہہ سناؤں
پھر آگے بندگی میں شہ کی آؤں
غلامانِ وفا جو ساتھ آویں
اسے جو لاویں لے ویسا ہی جاویں
یقیں ایسا ہی سن کے شہ کو آیا
لہ پیراہن میں وہ پھولا سمایا
کہا لے جاؤ جلدی سے رتن کو
دکھا دو جا کے اُس رشکِ چمن کو
مری جانب سے بھی کہیو بصد شوق
کہ بے حد تیرے ملنے کا ہے بس ذوق
ہدایت کی خدا نے تجھ کو جاناں
جو تو ہونے کو آئی ہے مسلماں
ہوئی جو خود بخود ملنے کی تدبیر
تو میرے عشق نے شاید کی تاثیر
تری خاطر رتن کو ہم نے بھیجا
جو کہنا ہے سو کہہ لے پھر چلی آ
رہوں گا میں ترے محکومِ فرماں
دمِ آخر تلک ممنونِ احساں
"منور از قدم کن خانۂ ما
بکن رشکِ چمن کاشانۂ ما"
یہ سن شہ کا پیام از راہِ اخلاص
رتن کو لے گئے واں چند اشخاص
سو واں گورا و بادل نے یہ تذویر
یہ کر رکھی تھی آگے سے ہی تدبیر

کہ وہ ڈولے ہزاروں جو عیاں ہیں
جنھوں میں دو دو بیٹھے پہلواں ہیں
پدم کا تھا جو وہ چنڈول پُرزر
برابر اس کے رکھے سو ملا کر
رتن چنڈول میں جس وقت آوے
تو پردے پردے تھوڑی دور جاوے
پھر آگے چڑھ کے گھوڑے پر رواں ہو
جو چوکیدار ہیں ان سے نہاں ہو
ہم ان سے پھر لڑیں گے یا مریں گے
غرض جو کچھ بنے گا سو کریں گے
یہم سب مشورت کر کر مقرر
مسلّح ہو رہے لڑنے پہ یکسر
گیا چنڈول میں جس وقت راجا
پدم کی جا پہ آہنگر کو پایا
اگرچہ تھا رتن کو بھی یہ معلوم
کہ آئی میرے ملنے کو وہ مغموم
ولے اس دم ہوا اس پر ہویدا
کہ ہے میری رہائی اس سے پیدا
فریبِ تازہ 'گورا' نے کیا ہے
علاء الدین کو یہ دھوکا دیا ہے
شہنشہ کے غلامانِ ہوا خواہ
رتن کو لے کے آئے تھے جو ہمراہ
رہے خیمے کی ڈیوڑھی پر کھڑے وہ
غرض سب چوبدار آسا اڑے وہ

ادھر زنجیرِ پا راجہ رتن کی
اسیرِ دام یعنی بے وطن کی
شتاب آہنگروں نے لیے کے موہاں
قدم سے اس کے جلدی دور کی واں
جو نکلی اس کے پاؤں سے وہ زنجیر
تو یوں راجہ نے کی چلنے کی تدبیر
کہ وہ ڈولے جو رکھے تھے برابر
کیا ٹک دور تک ان میں نکل کر
کھڑا تھا جس طرف اسپِ قدم باز
بروں تقریر سے جس کی تگ و تاز
چڑھ اس پر کی جو اس نے سخت مہمیز
ہوا وہ اسپ گرمِ جست اور خیز
وہ گھوڑا تھا کہ بادِ صبح گاہی
ہوا وہم و گماں سا واں سے راہی
کہ اس میں دور تک پہنچا رتن سین
سوار باد پاصد راحت و چین
رقیبوں کو ہوئی ڈیوڑھی پہ جب دیر
لگے کہنے رتن ہوتا نہیں سیر
کہو کوئی یہ راجا جی سے جا کے
چلو جی! سو رہے کیا گھر میں آ کے
ہے حکمِ شاہ اب کیجے نہ تاخیر
حضوری میں کرو چلنے کی تدبیر
یہ کہتے تھے کہ بس خیمے سے یک بار
کئی سو اوچھی نکلے ہو تیار

کہ ہر اک زور اور قوت میں رستم
لگے لڑنے وہ ان سے ہو کے باہم
سپاہِ شاہ کم تھی اور وہ بیش
ہوئے آخر گریزاں سب یہ دل ریش
خبر سلطاں کو یہ ہونے نہ پائی
کہ یاں آخر ہوئی ان کی لڑائی
جو گورا اور بادل نے یہ دیکھا
کہ یہ تھوڑے تھے سوان کو تو مارا
کوئی دم میں خبر یہ سن کے سلطاں
غضب سے آپ مثلِ مار پیچاں
یقیں ہے آئے آپ ہی بر سرِ جنگ
تو ہم پر ہوگی اپنی زندگی تنگ
چلو جب تک وہ لڑنے کے تئیں آئے
ہمارا دور تک لشکر نکل جائے
یہ چل نکلے غرض سب مشورت کر
برنگِ صیدِ خائف رو قفا پر
علاء الدین ادھر جو بے خبر تھا
پدم کے شوق میں آشفتہ تر تھا
جسے سمجھا تھا گل، سو خار نکلا
بجائے گنجِ دولت مار نکلا
کہا لوگوں نے اس کو جا کے فی الحال
کہ اے فخرِ جہان و نیک اقبال
بایں صورت رتن کو لے گئے وہ
شکستِ فاش ہم کو دے گئے وہ

سو وہ جاتے ہیں ، لینا ہے تو لیجے
سلامت ان کے تئیں جانے نہ دیجے
یہ سنتے ہی خبر وہ شاہِ عالم
ہوا قہر و غضب سے سخت برہم
یہ فرمایا کہ ہو تیّار لشکر
کہاں جاویں گے وہ مکار اس پر
نہ ہونے دوں گا ان کے من کے چیتے
یہ ممکن ہے کہ جاویں یاں سے جیتے؟
یہ کہہ اور ساتھ لے کر اپنے اک فوج
بجا ہے جس کو کہیے بحر کی موج
چلا بس قہرِ سلطانی سے جوشاں
کہ جیسے شیر بکری پر خروشاں
وہ جاتے تھے مظفر اور منصور
ظفریابی سے اپنی سخت مغرور
کہ یہ بھی آئے پہنچے کیا سبک تر
گلستانِ عدو پر مثلِ صرصر
دکھاتے اپنی سب شان و حشم کو
اٹھائے جو وہ جاتے تھے قدم کو
کہ سدِّ راہ ان کے یہ ہوئے آ
کیا پھر سلسلہ لڑنے کا برپا
مسلّح وہ تو تھے لڑنے پہ یکسر
نہ تھا مطلق انہیں مرنے سے کچھ ڈر
کہا گورا نے بادل سے کہ بھائی !
نہیں بچتی نظر آتی لڑائی

چلو تم لے کے راجہ کو شتابی
کہ رہنے میں ہے اس کے اب خرابی
مبادا فوج شاہی فتح پاوے
تو پھر راجہ یہاں سے قید جاوے
سدھارو تم تو لے راجہ رتن کو
تسلی تا ہو اس رشکِ چمن کو
یہاں میں شاہ سے ہر طرح لڑتا
چلا آؤں گا ہٹتا اور اڑتا
اگرچہ تھا رتن کو ننگ آیا
تو یوں گورا و بادل کو سنایا
مری غیرت نہیں کرتی کہ جاؤں
قدم لڑنے سے میداں میں ہٹاؤں
یہ کی گورا نے سن کر عرض فی الحال
سلامت چاہیے صاحب کا اقبال
چلو تم گھر کو ہم بھی تو نہیں کم
کہ ہو لڑنے سے ان کے کچھ ہمیں غم
غرض کی مشورت یہ حسبِ دل خواہ
ادھر بادل کو کر راجہ کے ہمراہ
تھی فوجِ شاہ جو آئی بر سرِ جنگ
زبس جوشاں خروشاں تیز آہنگ
مقابل ہو گیا اس کے یہ پھر کر
کہ اب لڑیے ہی ان کے خوب گھر کر
مقابل کر کے اپنا شہ سے لشکر
ہوا بس مستعد مرنے کے اوپر

ادھر اودھر سے پھر ہونے لگی جنگ
جسے ہو دیکھ قتالِ فلک دنگ
ہزاروں رہکلے ، توپ اور شترنال
دو جانب سے لگے چھٹنے وہ فی الحال
صدا سے جنگ کی کیا کہیے کہ یکسر
ہوا اک زلزلہ روئے زمیں پر
ہوئے اہلِ جہاں کے کنگ سب گوش
اڑے سر سے برنگِ طائراں ہوش
زمیں سے آسماں تک کیا کہوں یار
دھوئیں سے ہو گیا عالم دھواں دھار
کڑک کر بان کا آنا وہ اس دم
گھٹا میں جس طرح بجلی کا عالم
وہ بندوقوں سے گولے کا نکلنا
دہانِ مار سے سمّن کا اگلنا
برسنا سینکڑوں تیروں کا ہر بار
دلِ عاشق پہ جوں مژگانِ دل دار
ادھر اودھر ہوئے مجروح مردم
ہوا ہستی سے بعضوں کا نشاں گم
ہزاروں ہی غرض مجروح تن تھے
ہزاروں مردہ بے گور و کفن تھے
غرض یوں لڑتے لڑتے شام آئی
سحر پر دوسری ٹھہری لڑائی

رتن سین کا دہلی سے چتور میں آنا اور پدم سے حال دیوپال کا سن کر نہایت طیش کھانا

فلک جب شعبدہ بازی پہ اپنی یارو آتا ہے
تو کیا نیرنگیاں معشوق عاشق کو دکھاتا ہے

پلا ساقی مجھے اک جام لبریز
سمندِ خامہ کو تا کر کے مہمیز
سناؤں اب رتن کا تازہ احوال
کہ وہ شوریدہ سر، ہجراں کا پامال
بخوبی ہو کے شہر اپنے میں داخل
ہوا گھر میں پدم سے جا کے واصل
نئے سر سے غرض ہو خرّم و شاد
کہا سب نے ہوا چتّور آباد
بجا گھر گھر سبھوں کے شادیانہ
کہ آیا خیر سے رائے زمانہ
سبھی خورد و کلاں نے شاد ہو کر
کیے اس پر تصدق لعل و گوہر
ہوا عالم کو حاصل راحت و چین
نئے سر سے ہوا پیدا رتن سین
نہ سمجھے ہائے لیکن ٹک وہ ناکام
کہ پیدا ہونا ہے مرنے کا پیغام
خیال و خواب ہے آنا رتن کا
سبب ظاہر ہے یہ رنج و محن کا

یہ شادی ہے جو مثلِ سیل آئی
دکھانے کی مقرر پھر جدائی
نہیں دیکھی ہے شادی مرگ ایسے
فلک نے دی رتن کو موت جیسے
کہ جس دم وہ پدم کے پاس آیا
نہ پیراہن میں پھر پھولا سمایا
اٹھائے تھے جو رنج و درد کے بار
پدم سے کہہ سنائے سب بیان وار
کہ یوں مرتا رہا تیرے الم میں
اٹھائے رنج و آفت تیرے غم میں
نہ کھانا مجھ کو بھاتا تھا نہ پینا
تصور سے ترے ہوتا تھا جینا
خدا نے تیری صورت پھر دکھائی
تنِ بے جاں میں گویا جان آئی
نہ تھی امید ملنے کی تو مجھ کو
کہے تھا دل میں کیونکر دیکھوں تجھ کو
اگرچہ حال تیرا بھی اے مغموم
مرے دل پر ہے روشن اور معلوم
ولے کچھ کچھ تو کہہ تو بھی زبانی
کٹی کس طرح تیری زندگانی
کہا اس نے میں اپنی حالتِ زار
کروں کیا تیرے آگے آج اظہار
تجھے بھی ہے بوجہِ خوب روشن
کہ جاں تجھ بن وہاں تھی اور یہاں تن

نہ کھانا تھا نہ پینا اور نہ سونا
غرض تھا تیرے غم میں جان کھونا

جدائی میں تری بس ہر سحر شام
سوائے نالہ و زاری نہ تھا کام

تصوّر میں ترے میں کیا کہوں بس
کھلیں تھیں آنکھیں نرگس ، نہ تھا بس

غم دوری سے تیرے میں جگر خوں
ہوئی لاغر بسان بید مجنوں

قدم گورا و بادل کے میں چوموں
کہ بس ممنون ان کی میں بہ دل ہوں

مری حالت پہ دونوں رحم کھا کر
تمہیں لائے بہر صورت یہ جا کر

سنو تم اور طرفہ ماجرا یہ
فلک کے دکھ زدوں پر اک جفا یہ

کہ تم قیدی ہوئے اودھر روانہ
ہوا تاریک مجھ پر اک زمانہ

رہی میں خاک بر سر زار و نالاں
بسان سنبل گلشن پریشاں

اسی اندوہ میں اک دن میں ناکام
کھڑی تھی اتفاقاً بر لب بام

کوئی راجہ ادھر سے نام دیو پال
چلا جاتا تھا باصد جاہ و اجلال

نظر اس کی پڑی مجھ پر یکایک
رہا یک چند حیرت سے مجھے تک

یہ دیکھ اُس تیرہ دل کی بے حجابی
اتر آئی محل سے میں شتابی
گیا وہ دن اور آیا دوسرا روز
شبِ غم سے زیادہ تر غم اندوز
تو اس نے ایک عورت عمر میں پیر
بد افعال اور جوان دل، نیک تقریر
بصد شوق اور بلا وسواس بھیجی
یہ اپنی پیغام میرے پاس بھیجی
کہ اے گلدستہ باغِ جوانی
عبث کھوتی ہے اپنی زندگانی[1]
نہیں آنے کا اب جیتا رتن میں
تو ناحق روز و شب غم سے ہے بے چین
بدل سب چیز کا ہے جگ میں ہوتا
نہیں ہوتا بدل پر زندگی کا
ترا یہ حسن اور یہ صاف صورت
غضب ہے تس پہ ہو غم کی کدورت
تجھے جس کا الم ہے وہ کہاں ہے؟
عبث غمگیں ہے، جی ہے تو جہاں ہے
ملاقاتِ رتن پر تو نہ رکھ دل
یہ دل عاشق ہوں تیرا مجھ سے آ مل
ہیں رایانِ جہاں میرے سلامی
رتن کو فخر ہے یاں کی غلامی

۱۔ یہاں پر نسخۂ شیرانی ختم ہو جاتا ہے۔

جواں ہوں ، خوبصورت صاحبِ فوج
رتن سے بھی زیادہ تر مجھے اوج
جو ہوتا ہے علاء الدیں کا قیدی
اسے ہوتی ہے جاں سے نا امیدی
کوئی جیتا نہیں واں سے پھرا ہے
وہ زنداں خانہ ، گھر اک موت کا ہے
اٹھا دل سے تو اب فکرِ رتن کو
زباں پر بھی نہ لا ذکرِ رتن کو
"منوّر ساز از خود خانۂ من
بکن رشکِ چمن کاشانۂ من"
غلام اپنا سمجھ اے غیرتِ حور
قصور اس میں نہ کرنا تا بہ مقدور
غرض دیوپال کا پیغام وہ زن
لگی کہنے جو با تقریرِ روشن
یہ سن کر اس کو میں نے خوب مارا
کہے ایسی نہ باتیں پھر دوبارہ
لیے دل پر ہزاروں درد و افسوس
جہاں کی تھی گئی واں کو وہ مایوس
میں اس آتش سے بھنتی اور جلتی
سراپا سوز سے جوں شمع جلتی
کہ بے وارث سمجھ کر مجھ کو ناکام
کیا دیو پال نے یہ آج پیغام
مبادا کل کو آوے بر سرِ جنگ
خدا ناخواستہ ہو جائے کیا ڈھنگ

کہا گورا و بادل سے یہ جا کر

کہہ اپنا حال اور غیرت دلا کر

کہ یا تو تم رتن کو لاؤ یاں تک

نہیں تو مجھ کو لے جاؤ وہاں تک

نہیں کرتے جو تم مجھ پر یہ احسان

ہوئی جاتی ہوں تو اب میں مسلماں

غرض تب تو یہ دونوں طیش کھا کر

گئے اک مکرِ تازہ یاں بنا کر

پھر آگے جو ہوا تم کو ہے معلوم

کہ میں تم سے ملی اس طرح مغموم

تم آئے خیر سے بادل بھی آیا

میں روتی تھی سو آ مجھ کو ہنسایا

پر اب گورا بھی خیریت سے آوے

خدا آفت سے اس کو بھی بچاوے

کشتہ ہونا دیو پال کا رتن سین کے ہاتھ (سے) جنگ و جدال میں اور خود زخمی ہو کر پھر آنا رتن سین کا اپنے مشکوے القبال میں

کہوں کیا چرخِ ناہنجار نت معشوق و عاشق میں
جدائی ڈال کر آتش میں ہجراں کی جلاتا ہے

پلا ساقی شرابِ تند اور تیز

کہ چھیڑوں یاں سے قصہ اور خوں ریز

رتن نے سن کے یہ دیوپال کا حال
سراپا قہر کی آتش سے ہو لال
پدم سے یوں کہا اے ناز پرور
قسم تیرے ہے سر کی مجھ کو دلبر
نہ ماروں اس کو میں جب تک کہ ناکام
ترے بستر پہ یک دم لوں نہ آرام
سحر دم میں ہوں اور وہ طالع وازوں
کروں میداں کو اس کے خوں سے گلگوں
پدم نے اس کو سمجھایا بہت سا
ولے وہ پُر غضب مطلق نہ سمجھا
اسی آتش سے ساری رات جلتا
رہا قہر و غضب سے ہاتھ ملتا
ہوئی صبح قیامت جب نمودار
ہوا تیار بہر جنگ و پیکار
لیے ہمراہ اپنے لشکر و فوج
کہے تو قلزم ہستی کی تھی موج
مصمم بر سر خوں ریزی و جنگ
چلا یاں سے وہ رائے برق آہنگ
کسی نے جا کے اس کو بھی سنایا
کہ لو تم سے رتن لڑنے کو آیا
اتر کر وہ بھی فوراً از سر تخت
یہ بولا خیر جی، سنگ آمد و سخت
ارادہ جنگ پر تو تھا نہ اپنا
اگر مرضی رتن کی ہے تو اچھا

چلیں تیّار مردانِ نمک خوار
کریں دامان صحرا خوں سے گلزار
غرض سامانِ جنگ آراستہ کر
مسلح ہو کے نکلا یہ بھی ایدھر
ادھر یہ اور آدھر وہ صاحبِ ننگ
ہوئے دونوں مقابل بر سرِ جنگ
صفیں دونوں ہوئیں آراستہ جب
کہ لڑنے کے سوا بنتی نہیں اب
دو جانب سے نقیبانِ سرافراز
نکل کر بولے اے مردانِ جاں باز
دمِ تیغ آج یاں طعمہ چشک ہے
نکل کر کھائے تو شرطِ نمک ہے
بڑھو آگے ، لڑو تیغ و سناں سے
کہ پاؤ آفریں سارے جہاں سے
کرو اب تیغِ خوں آشام روشن
کہ ہو جس سے تمہارا نام روشن
تمہارا جگ میں ہو نامِ نکوئی
کرو میداں میں اپنی سرخروئی
وہ کڑکے ڈھاریوں نے جو سنائے
جوانوں کے لہو نے جوش کھائے
تو اپنے اپنے سرداروں کے منہ پر
نظر کرنے لگے وہ دونوں لشکر
اشارہ ہم جو ٹک ابرو کا پاویں
تو پھر اک دم میں قتل عام کر دیں

کہ اس میں فوج کو دیوپال نے تھام
کیا راجہ رتن سے پہلے پیغام

مدد سے فوج کی ہو دست بردار
ہم اور تم کر لیں دونوں جنگ و پیکار

ہماری اور تمھاری ہے یہی جنگ
کہ خونِ یک دگر سے ہوویں یکرنگ

خدا دے فتح جس کو سو تو پاوے
ہوس دل میں ولیکن رہ نہ جاوے

اگر کچھ طنطنہ ہے مردمی کا
تو تنہا سامنے میداں میں آ جا

کہا سن کر رتن نے اس سے کیا خوب
بہ دل یہ بات ہم کو بھی ہے مرغوب

مدد کا فوج کی اس دل کو غم ہو
جو زور و مردمی میں آپ کم ہو

لڑوں تنہا جو رستم سا جواں ہو
سو تم کیا ؟ ایک زالِ ناتواں ہو

نکل آیا غرض کہہ کر یہ پُرجوش
سلاحِ جنگ سب زیبِ بر و دوش

صفِ مرداں سے وہ گھوڑا کودا کر
ہوا قائم مقابل اس کے آ کر

غرض چھیڑ اپنے اپنے رخشِ تازی
بہم کرنے لگے وہ نیزہ بازی

ختن کے نیزے وہ دلچسپ و خونخوار
سنانِ مژگانِ جاناں سے نمودار
وہ گھوڑے باد پا گویا چھلاوا
وہ کرنا نیزہ بازی ، دے کے کاوا
انی کا نیزے کی آنا بتا کر
نکل جانا وہ گھوڑے کو دبا کر
لگانا آگے حربے کا بصد کد
وہ کرنا دوسرے کے صدمے کو رد
نظر مردم کی ان کے فن پہ قرباں
کہے تو تھی ترنج نیزہ بازاں
نہ آیا کام کچھ تیغ و تبر تک
نہ صدمہ یک دگر کا کچھ سپر تک
کہ زخمِ نیزہ با ایں ہوشیاری
لگا راجہ رتن کے دل پہ کاری
سناں دل پر رہی اس کے یہ کھبھ کر
کہ جیسے خار رہ جاوے ہے چبھ کر
ولے اس نے بھی دونا طیش کھا کر
کمالِ زور سے نیزہ اٹھا کر
کیا دیوپال کے سینے پہ اک وار
کہ نیزہ اس کی چھاتی سے ہوا پار
وہ حربہ کیا تھا ، پیغامِ اجل تھا
سناں کے ساتھ ہی نکلا دم اس کا

رتن سین کا پیالۂ عمر لبریز ہونا اور ناگمت و پدم کا ستی بن کر جان کھونا

کھپا دیتا ہے جوں پروانہ کر یہ عشق عاشق کو
سراپا شمع ساں معشوق کو بھی پھر جلاتا ہے

پلا ساقی مجھے اب آخری جام
کہ ناکامانِ غم کا ہو چکا کام
شرابِ قسمِ اول دے وہ مجھ کو
دوبارہ جو کہ آتش پر کھنچی ہو
پدم اور ناگمت کا سوزِ جاں
کروں تقریر با آتش زبانی
کہ جب جنگاہ سے آیا رتن سین
بدن زخمی سناں سے سخت بے چین
کیا گرچہ حریف اپنے کو مردہ
ولیکن آپ بھی جیوں گل فسردہ
ہوا چتّور میں ماتم دوبارہ
کیے جیب و گریباں سب نے پارہ
ہوئی تھی آنے کی شادی جو گھری
سو عالم پر وہ شادی مرگ ٹھہری
خصوصاً ناگمت کا اور پدم کا
لکھوں کیا ماجرا ان کے الم کا
کہ دیکھا جس گھڑی زخمی رتن کو
کیا صد چاک اپنے پیرہن کو

وہ رخسارے طمانچوں سے کیے لال
بنایا ماتمی سب اپنا احوال
وہ گھر تھا یا کہ اک ماتم سرا تھا
کہ ہر سو آہ و نالہ ہو رہا تھا
ادھر وہ زخم سب راجہ رتن کے
پریشاں حال، ٹکڑے پیرہن کے
کوئی جرّاح کو جلدی بلا کر
دعائیں مانگتا ٹالکے لگا کر
الٰہی اس کے جی کی خیر کیجو
ہمیں داغ و الم اس کا نہ دیجو
کلیجہ پکڑے ایدھر اس کی مادر
اُدھر کو دست بر دل اس کی خواہر
جہاں تک اس کے خویش و اقربا تھے
سبھی دامِ الم میں مبتلا تھے
مداوا اور دعائیں کرمِ تدبیر
سبھی شے چارہ گر برعکسِ تقدیر
رتن نے دیکھ اپنی حالتِ زار
کہا ان سے کہ اے یارانِ غم خوار
عبث تدبیر میں ہر سو دواں ہو
میں جینے کا نہیں یارو کہاں ہو ؟
کوئی دم کا مسافر میں یہاں ہوں
عدم کی سمت پھر آگے رواں ہوں
غرض یہ کہہ کے پھر جس جس کو چاہا
جو کچھ کہنا تھا سب کو کہہ سنایا
پدم اور ناگمت کے تئیں بلا کر
بہت سا رو رو اور چھاتی لگا کر

کہا اے مونسانِ محرمِ راز
ہوئی تو زیست مجھ سے سخت ناساز
جو کچھ میں نے کہا ہو یا سنا ہو
مجھے اے ہم‌دمو ! سب بخش دیجو
چلا دنیا سے میں غمگین و ناشاد
خدا تم کو سدا رکھے پر آباد
کہا دونوں نے سر پر مار کر ہاتھ
کہ ہم بھی ہیں کنور جی آپ کے ساتھ
تمہارے ساتھ ہی ہم بھی چلیں گے
جلو گے تم تو پہلے ہم جلیں گے
اگر جیتے رہیں گے دونوں ناکام
تو پھر ہنس ہنس کہیں گے خاص اور عام
کہ قومِ زن نہایت بے وفا ہے
نہ ان کو غم کسی کا، نے حیا ہے
نہیں کوئی کسی کے کام آتا
کہیں ہیں سچ ہی 'جیتے جی کا ناتا'
خوشی سے ساتھ جس کے عمر کھوئی
شبالہ سیج پر پھولوں کی سوئی
جلایا اس کو باحالِ غم اندوز
جلی کوئی نہ اس کے ساتھ اس روز
غرض یوں بیٹھ کر رونا نہیں ہے
جئیں تم بن سو یہ ہونا نہیں ہے
یہ باتیں اور اس کی جاں کنی تھی
وہ مرتا تھا اور ان پر آ بنی تھی

کہ اس میں کھول آنکھیں کھینچ کر آہ
سوئے ملکِ عدم حسرت سے لی راہ
زبس مشتاق تھا روئے پدم کا
نکلنا بھی ہوا آنکھوں سے دم کا
کہوں کیا جوں ہی دم نکلا رتن کا
ہوا کیا حال اس رشکِ چمن کا
کیا جیوں گل گریباں چاک پر چاک
نسیم آسا اڑائی سربسر خاک
وہ توڑیں چوڑیاں نتھ کو اتارا
در و دیوار سے سر دے دے مارا
برنگِ گل تھا اس کا سرخ جو تن
ہوا نیلا کہ جیسے رنگِ سوسن
پریشاں شکلِ سنبل ہو گئی بس
کھلیں حیرت میں آنکھیں مثلِ نرگس
ادھر دامن تلک ٹکڑے گریباں
ہوئی تھی ناگمت جوں مار پیچاں
ادھر فرزند اس کے خاک پر سر
جمی گردِ یتیمی ان کے منہ پر
غرض آہ و فغاں ہر سمت کو تھی
خبر مطلق کسی کو نہ کسی کی
کوئی سر پیٹتا پھرتا تھا روتا
پچھاڑیں کھا کے کوئی جان کھوتا
زمیں پر لوٹتا پھرتا کوئی زار
کوئی حیران کھڑا تھا نقشِ دیوار

اڑائی رو رو آخر یاں تلک خاک
مکدّر ہو گئے جس سے سب افلاک
ہوا چتّور میں ماتم کا یہ جوش
کہ سب اعلیٰ و ادنی تھے سیہ پوش
غرض خانہ بہ خانہ شیون و شین
کہیں تھے رو رو سب 'ہے ہے رتن سین'
رہا اک دیر تک یہ شورِ ماتم
کہ دفتر ہو گیا اے وائے برہم
ہوئی اس کے جلانے کی جو تدبیر
کہ تھی تقدیر یوں ، کیجے نہ تاخیر
منگا کر چوک صندل کا اک انبار
جو ہو اسبابِ لازم کر کے تیّار
جلانے کو اسے جب لے چلے سب
قلق در دل فغان و آہ بر لب
پدم اور ناگمت نے کھینچ کر آہ
کہا ہم بھی جلیں گے اس کے ہمراہ
ہمارا ہاتھ میں راجہ کے تھا ہاتھ
نہیں ممکن کہ چھوڑیں آج ہم ساتھ
اسے تنہا نہ تم آتش لگاؤ
ہمیں بھی ساتھ ہی اس کے جلاؤ
پدم اور ناگمت نے جب یہ ٹھانی
نہیں منظور ہم کو زندگانی
جو خویش و اقربا مختار تھے چند
نہایت زیرک و دانا ، خردمند

انھوں نے ان کو سمجھایا بہت سا
کہ جلنا تم کو مطلق ہے نہ اچھا
کوئی دل ایسی باتوں پر ہے دھرتا ؟
موئے کا ساتھ جیتا کب ہے کرتا ؟
جہاں کا ہے یہی دستور دائم
کہ اک جاتا ہے ، اک رہتا ہے قائم
عبث ہوتا ہے ان باتوں سے دل ریش
کہ جاویں گے اسی رہ سب پس و پیش
یہ تھی تقدیر مر جاوے رتن سین
رہو تم اس کے غم میں سخت بے چین
غرض عالم یہ تھا کس کو گوارا
ولے تقدیر سے کس کا ہے چارا
وہ وارث اور تمھارا تاجِ سر تھا
اسی کے دم سے روشن سب یہ گھر تھا
بجا اس کی جو ہیںنگے اس کے فرزند
تمھارے قرۃ العین و جگر بند
ہوئی ہے خیر سے ان کو جوانی
موئی مٹی کی ہیں سو یہ نشانی
رتن کی جا پہ کر کے ان کو آباد
رہو تم دیکھ کر ان کو سدا شاد
غرض سن اس نصیحت کو وہ غمناک
لگیں کہنے کہ اُس بن سب ہمیں خاک
کہاں فرزند ؟ کیسا چین گھر بار ؟
رتن بن ہم کو جینا ہے یہ دشوار

رتن کے ساتھ ہی گھر سے چلیں گے
جلے گا وہ تو پہلے ہم جلیں گے
انھوں نے پائے سر آتش لگائی
کہ جیسے ہو کہیں ہولی جلائی
کہوں کیا پائے سر سے جب وہ آتش
ہوئی بالائے سر جوں سرو سر کش
ہوا شعلہ محیطِ سر سراپا
کہ تھا وہ برقِ خرمن کا تماشا
رتن تھا بس کہ مثلِ شمع خاموش
جلیں اس پر وہ جیوں پروانہ پرجوش
رتن کے ساتھ ہی پروانہ کردار
جلیں القصّہ دونوں آخرِ کار
جو تھا حق چاہ کا ویسا ہی چاہا
محبت اور عشق اپنا نباہا
جلا کے ان کو خویش و اقربا سب
گھروں کو اپنے آئے آہ بر لب
پدم کا تھا جو اک بیٹا کنول سین
رتن کا نورِ عین و راحت و چین
سبھوں نے دیکھ زیرکہ اور دانا
کیا مل کر وہاں کا کار فرما
رکھا سر پر مُکٹ، اس کو دیا راج
کہا، تجھ کو مبارک تخت اور تاج
دکھا کے نذریں سب خورد و کلاں نے
دعائے خیر دی پیر و جواں نے

جو تھا نک مین بیٹا ناگمت کا
کنول کا اس کے تئیں نائب بنایا
پدم سے جو موافق ناگمت تھی
انھوں نے بھی بہم الفت ہی رکھی
ہوئے یک دل جو باہم دونوں بھائی
پھری کشور میں دونوں کی دہائی
کیے نک اور کنول نے کام جاری
رہی باقی رتن کی یاد گاری

گورا پر فتح پا کے علاء الدین کا چتّور مین آنا اور پدم و ناگمت کے حال پر نہایت افسوس کرنا و آنسو بہانا

کہوں کیا عشق کے نیرنگ اے ہمدم کہ یہ ظالم
جلا کر شمع ، پروانے کی کیا کیا خاک اڑاتا ہے

نہ کر تاخیر اٹھ اے مست ساقی
صبوحی دے ، رہی ہووے جو باقی
خمارِ شب کو اب میں توڑتا ہوں
مے دنیا سے الفت چھوڑتا ہوں
پیا جس نے یہاں کی مے کا اک جام
رہا وہ سرگرانِ یاس ، ناکام
سنا تو نے رتن کا سب یہ احوال ؟
گیا دنیا سے کیا حسرت کا پامال
نہ خاطر خواہ اس نے چین پایا
کہ آخر عشق نے اس کو جلایا

غرض ان کی نصیحت جب نہ مانی
مقرر دل پہ جلنے کی ہی ٹھانی
ستی کا جو کہ ہو اسباب درکار
کیا آخر انھوں نے لا کے تیار
سنگار اپنا کیا دونوں نے باہم
لٹے سر سے بنی دلہن وہ پُر غم
سراپا اپنا زیور سب پہن کر
لباسِ نو عروسی زیبِ تن کر
بسا کر عطر سے اپنے بدن کو
دوچنداں رشک جس سے ہو چمن کو
مسی مل ، پان کھا ، سہرا بندھا کے
فلک کو دیکھ ، لوگوں کو سنا کے
لگی کہنے کہ راجہ حسبِ دلخواہ
ہمیں جس طرح سے لایا تھا یاں بیاہ
سو ہم بھی با لباسِ نو عروساں
اسی عالم سے ہوں گے ساتھ سوزاں
دیا تھا جس طرح سے جیتے جی ہاتھ
اسی صورت موئے پر دیں گے ہم ساتھ
ازل سے تھی ہماری گانٹھ جوڑی
سو کیونکر ہم سے اب جاوے گی توڑی
دیے جو اس نے پھیرے بیاہ کے دن
سو پھیرے آج ہم دیویں گے گن گن
جو کہنا تھا غرض سب کو سنا کے
محبت دل سے دنیا کی اٹھا کے

منگائے بٹے[1] وہ سیمیں طلائی
کہ عاشق جن پہ ہو ساری خدائی
لے اپنے اپنے ہاتھوں میں وہ دلریش
چلیں بازی کناں تابوت کے پیش
کہوں کیا حال اس دم کا اب اے یار
در و دیوار سے تھا نالۂ زار
وہ بٹے ان کے ہاتھوں میں اچھلتے
یہ دیکھ ادنٰی و اعلٰی ہاتھ ملتے
جنازہ پیچھے کاندھوں پر رتن کا
کہ جس سے خلق کو رنج و محن تھا
سبھی خورد و کلاں تھے پیرہن چاک
پریشاں حال سر پر ڈالتے خاک
اور آگے نوبت و فیل و عماری
دلھن دولھا کی ہو جیسے سواری
گئی القصّہ باصد حالتِ زار
جہاں وہ چوبِ صندل کا تھا انبار
پدم اور ناگمت پروانہ کردار
کیے پھیرے انھوں نے واں کئی بار
بجا لا کے وہ سب دستور معمول
چڑھا کر سر کے اوپر پان اور پھول
چڑھیں سر پر رتن کو لے کے جس دم
سر اور تن رکھ کے زانو پر وہ باہم

۱- بٹا : (۱۰) وہ گولہ جو کمان کی ڈور پر بازی گر دوڑاتے ہیں - (فرہنگ آصفیہ ، جلد اول ، صفحہ ۳۶۶) -
بٹے : بمعنی کھلونے یا لٹو (دیکھیے چٹے بٹے - نور اللغات ، حصہ دوم ، صفحہ ۵۱۰) -

لگیں کہنے کہ ہم نے ہمرہی کی
کہ پھیرے دے کے فاضل جان بھی دی
کھڑے تھے جو جو گرد و پیش گریاں
شرارِ غم سے باصد جانِ بریاں
علاء الدیں کا سن اب تو ارادہ
کہ وہ شورِ ہوس در سر فتادہ
ادھر گورا سے تھا جو بر سرِ جنگ
کہوں کیا تجھ سے اس کی جنگ کا ڈھنگ
کہ وہ لڑتا ہوا منزل بہ منزل
چلا آتا تھا خارِ عشق در دل
جب آیا وہ قریبِ ملکِ چتّور
کیا تب اس نے اپنے دل میں یہ غور
ہوا اس کا سلامت یاں سے جانا
ہے پھر مشکل وہاں سے ہاتھ آنا
سپہ سالار لشکر کو بلایا
بہت غیرت دلا کے یہ سنایا
کہ اب تو شام ہے ہووے سحر جب
لڑو اس طرح اس سے ٹوٹ کر سب
کوئی جیتا نہ جاوے ان میں زنہار
کہ ہیں مردود یہ سب سخت خونخوار
خبر ہم نے یہ ہے تحقیق پائی
رتن سے ہے وہاں ہوتی لڑائی
ابھیں ہم ہاو کر واں پر جو جاویں
تو ایسے میں پدم کو مفت پاویں

علاء الدیں سے سن کر بات مرغوب
کہا سب فوج نے اچھا بہت خوب
سحر کو ہم ہیں اور وہ دشمنِ لنگ
بھلا دیکھو تو کیسے کرتے ہیں جنگ
جو سر گورا کا ہم جا کر نہ لاویں
تو دہنے ہاتھ سے کھانا نہ کھاویں
یہ تھیں باتیں میانِ لشکرِ کیں
ملک بھی کہتے تھے سن سن کے آمیں
غرض وہ رات گزری صبح آئی
ٹھنی گورا سے اور شہ سے لڑائی
ہر اک جانب سے طبلِ جنگ باجا
مسلح ہو کے نکلے شاہ و راجا
نقیبوں نے صدا اپنی سنائی
جوانوں کے تئیں چیٹک لگائی
کہ ہاں اے نوجوانو کار فرما
بجا لاؤ حق اپنی مردمی کا
بڑھو آگے لڑو تیغ و سناں سے
جو پاؤ آفریں سارے جہاں سے
وہیں سن سن نقیبوں کی سب آواز
بتنگ آ کر غرض مردانِ جانباز
جدا کر کے کماں اور پھینک کر تیر
چلے دونوں طرف سے کھینچ شمشیر
کہ بس عاری اب آئے لڑتے لڑتے
ہر اک جاگہ سے ہٹتے اور اڑتے

جو کچھ ہو ، آج ہی ہووے شتابی
اٹھاوے کون ہر دن کی خرابی
غرض مرنا ہی اپنا کر مقرّر
در آوردہ ہوئے دونوں وہ لشکر
لگے چلنے وہاں تلوار کے وار
بہی دریائے خوں کی ہر طرف دھار
رہی اک دیر تک یوں ہی لڑائی
سپاہِ شہ نے آخر فتح پائی
گیا گورا بھی مارا ، ساتھ سب فوج
ہوئے دریائے خونی بر سرِ موج
کوئی جیتا نہ ان میں سے رہا واں
جو ہوتا ان کے درد و غم سے نالاں
ہزاروں بندگانِ پادشاہی
شہید ہو کر ہوئے جنّت کو راہی
غرض یہ فتح پا کر حسبِ دلخواہ
علاؤ الدیں نے لی چتّور کی راہ
نواحِ شہر میں داخل ہوا جب
سنا یک بارگی وہ ماجرا سب
کہ یعنی لڑکے یا راجہ رتن سین
گیا حسرت زدہ دنیا سے بے چین
جلایا آج اس کو وائے ہیہات
پدم اور ناگمت بھی جل گئیں ساتھ
کہوں کیا میں کہ شہ یہ ماجرا سن
ز بس تصویر آسا رہ گیا سن

ہوا جب آس سے دل کی وہ مایوس
فلک کو دیکھ بولا حیف افسوس
بہت افسوس کر کے ، ہاتھ مل کے
گیا خاکِ پدم پر واں سے چل کر
ہزاروں آہ کرتا با دلِ چاک
گیا جس دم جہاں ان کی تھی وہ خاک
غرض اک مشتِ خاکستر اٹھا کے
سرِ امید پر اپنے آڑا کے
یہ بولا آہ بھر ، با جانِ غم ناک
کہ ہے آخر یہ دنیا سربسر خاک
کوئی کیا اس کے اوپر دل لگاوے
دو روزہ زندگی پر جی جلاوے
ہوا یاں کب کسی کا کام پورا
کہ ہے یہ کار دنیا سب ادھورا
حباب آسا ہے دنیا امر موہوم
ثباتِ زندگی دم بھر ہے معلوم
بخیر اس کا نہیں ازبسکہ انجام
کہ ہے اس کی سحر بھی بدتر از شام
بشر کے حق میں شر ہے چاہ اس کی
پُر از خارِ ہوس ہے راہ اس کی
سنا اس میں و یا دیکھا تماشا
خیال و خواب و افسانہ ہی پایا
غرض خاکِ پدم سر پر آڑا کے
بصد افسوس و غم آنسو بہا کے

علاؤ الدین ہو کر سخت بے چین
چلا حسرت زدہ سوئے کنول سین
اسے خلعت دی اور کر عذر خواہی
ہوا دہلی کی جانب کو وہ راہی
غرض آیا تو وہ منزل بہ منزل
ولے کارِ جہاں سے سخت بے دل
کیسے اپنے سے بس سر در گریباں
چلا دہلی کی جانب زار و گریاں
چراغِ الفتِ دنیا بجھا کے
غرض بیٹھا وہ حق سے لو لگا کے
رہا دل پر نہ غم اس کے نہ کچھ پیچ
جو سمجھا غیر حق ہے اور سب ہیچ
سنی تم نے عزیزو ! یہ کہانی ؟
کہ ہے اللہ باقی ، کل فانی

خامۂ ندرت نگار کا خاتمۂ کتاب پر آنا اور تاریخِ تکمیل تحریر فرمانا

بس آگے کیا لکھیے قصّہ تو آخر ہو چکا عشرت
لکھیں تاریخ ان اشعار کی دل میں یہ آتا ہے

کدھر ہے ساقیٔ فرخندہ فرجام
بھلا اک آخری بھی اور دے جام
کہ قصہ میں رتن کا اور پدم کا
بیاں سب ان کے عیش و رنج و غم کا

بخوبی کر چکا تحریر سارا
کہ تا ہو سب کے اوپر آشکارا
کہی یہ مثنوی میں نے جو اے یار
ز بس کہنا تھا اس کا سخت دشوار
ولے خاطر تھی مجھ کو مولوی کی
سو میں نے ان کی اے یارو خوشی کی
جنھوں کا نام ہیگا قدرت اللہ
نہایت اہلِ دل اور مردِ آگاہ
بزرگ و نیک خصلت پارسا ہیں
شریعت اور طریقت آشنا ہیں
کہوں کیا اس کے میں لسب و کمالات
مثل ہے یہ کہ چھوٹا منہ بڑی بات
انھوں کو شعر کے فن سے ہے بس ذوق
نہایت اہلِ ذوق و صاحبِ شوق
مجھے ان سے ہے بس اک رابطہ خاص
کرم فرما ہیں میرے وہ بہ اخلاص
انھوں نے بس کہ بخشا مجھ کو یہ کام
کہ اس قصے کو عشرت کر تو اتمام
ہوا جس وقت مجھ کو شوق رہبر
تو کلکِ درفشاں میں نے اٹھا کر
لکھی یہ داستانِ عشق ساری
کہ ہے دنیا میں اس سے یادگاری
یہ کہہ کر دل میں پھر میں نے جو کی غور
کوئی تاریخ اس کی لکھیے خوش طور

کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر
بلا شک جانے ''تصنیفِ دو شاعر''

خاتمۃ الطبع

سبحان اللہ ! خامۂ داستان طراز کیوں کر محوِ سجدۂ شکرِ کارساز نہ ہو جائے اور گردِ کدورت طبائع مصفا سے کس طرح سردست لہ دھو جائے کہ بیچ اس ایامِ عشرت فرجام کے کتاب پدماوت اردو کی مصنفاتِ میر ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت سے قالبِ طبع میں آئی اور بندۂ اثیم محمد مصطفیٰ خان ولد حاجی محمد روشن خان غفر اللہ لہ الکریم نے بیچ اپنے چھاپہ خانے واقع بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر کے کہ معروف بمطبع مصطفائی ہے ، اس کی تکمیلِ طبع سے فراغت پائی - روزمرۂ قدیم میں یہ کتاب لاجواب ہے ، ہر شعر انتخاب ہے - جس جگہ کاتبوں سے کچھ رہ گیا تھا ، صحیح کیا اور ترکیب و بندشِ قدیم میں تصرف مناسب نہ جانا ، اسے ویسا ہی رہنے دیا ، تا کہ اس زمانے کی زبان لوگوں کو معلوم رہے ، کوئی روزمرہ جدید نہ کہے -

قطعۂ تاریخ از میر ناصر علی نصیر

خوب اردو زباں ہے پدماوت
مثل اس کی نہیں چھپا قصہ
لکھ اگر ہے خیالِ سال نصیر
ہے دلاویز خوش نما قصہ

۱۲۶۵ھ

ایضاً از سنہ عیسوی

دو سخن سنج کی تصنیف چھپی پدماوت
کیا دیا جلوہ عروسِ سخنِ زیبا کو

ترجمہ قصے کا لکھا نہیں دو شاعر نے
سلکِ تحریر میں کھینچا گہرِ یکتا کو

روزمرے میں کہی اپنے عجائب یہ کتاب
طاقتِ دخل نہیں ، معترضِ بے جا کو

خوب یک رنگ ہے دونوں کی زبانِ اردو
دیکھے سے جس کے خجالت ہے گلِ رعنا کو

سالِ تاریخ جو چاہا تو خرد نے یہ کہا
"مایۂ عبرت و عشرت ہے بہم دانا کو"

۱۸۴۸ع

از نتائجِ طبعِ باشرف اشرف علی اشرف

نسخہ پدماوت کا چھاپا مصطفٰی خاں نے عجب
خاطرِ اہلِ معانی کو خوشی حاصل ہوئی

دی ندا اس طرح ہاتف نے ز روئے انبساط
سال کر اشرف رقم کیا مثنوی بہتر چھپی

۱۲۶۵ھ

از عبدالرحمن خاں علی عنہ متخلص بہ شاکر

رتن سین اور پدماوت کا قصہؑ
عجب عبرت نما، عشرت فزا ہے
محمد مصطفیٰؐ خاں نے کیا طبع
کہ مطبوعِ دلِ اہلِ ذکا ہے
خرد نے دیکھ پدماوت کے منہ کو
کہا شاکر تجھے اب فکر کیا ہے
نہ کر کچھ غور، لکھ تاریخ اس کی
سراپا قصہ الفت سے بھرا ہے

۱۲۶۵ھ

للہ الحمد کہ چھٹی تاریخ جمادی الاولی ۱۲۶۵ ہجری میں یہ کتابِ لاجواب چھپ گئی۔

● ● ●

ضمیمہ

مثنویات۔ پدماوت

از گوپی چند نارنگ

"پدماوت" ہندی ادب کا وہ شاہکار ہے جسے بقائے دوام اور شہرتِ عام نصیب ہوئی ۔ اسے ملک محمد جائسی نے بعہدِ شیر شاہ ۱۵۴۰ء (۹۴۷ھ) میں اودھی زبان میں تصنیف کیا ۔

قصہ:

"پدماوت" کی کہانی کے دو حصے ہیں ۔ پہلا تخیّلی اور دوسرا نیم تاریخی ۔ پہلے حصے میں سنہل دیپ[1] کے راجا گندھرو سین کی حسین بیٹی پدماوتی جوان ہونے کے بعد دل گرفتہ رہنے لگی ۔ یہ ایک توتے کو ، جس کا نام ہیرامن تھا ، بہت عزیز رکھتی تھی ۔ توتا شہزادی کا دل بہلانے کے لیے اسے عشق و محبت کے سنہرے خواب دکھانے لگا ۔ راجا گندھرو سین نے توتے کو ہلاک کرنا چاہا لیکن وہ بچ نکلا اور ایک برہمن کے ہاتھ پڑا ، جس نے اسے چتوڑ کے راجا رتن سین کے پاس بیچ دیا ۔ راجا نے اس سے پدماوتی کے حسن و جمال کا احوال سنا اور پدماوتی کا نادیدہ عاشق ہوگیا ۔ غرض پدماوتی کو حاصل کرنے کے لیے رتن سین جوگی کے بھیس میں سنہل دیپ پہنچا ۔ یہاں توتے کے ذریعے راز و نیاز کے مراحل طے ہوئے اور بڑے رگڑوں جھگڑوں کے بعد دونوں شادی ہوگئی ۔ واپسی پر رتن سین

۱۔ بعض روایتوں کے مطابق سنہل دیپ سے مراد لنکا ہے ۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک محمد جائسی نے جزائر لنکا دیو کو سنہل دیپ کہا ہے ۔ یہ جزیرے لنکا سے جانبِ غرب واقع ہیں ۔

اور پدمنی کا جہاز طوفان میں گھر کر راہ بھٹک گیا ۔ طرح طرح کے مصائب و آلام سے مقابلے کے بعد دونوں چتوڑ پہنچے ۔ پہلی رانی ناگمتی اور پدماوتی دونوں راجا کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگیں ۔

اس کے بعد کا حصہ نیم تاریخی رنگ کا ہے ۔ سلطان علاء الدین نے چتوڑ سے نکالے ہوئے راگھو نامی ایک برہمن سے پدمنی کے حسن و جمال کا تذکرہ سنا اور اس کے حصول کے لیے بے تاب ہو گیا ۔ چتوڑ پر چڑھائی کی گئی لیکن آٹھ برس کے بعد بھی قلعہ فتح نہ ہوا ۔ بالآخر علاء الدین نے صلح کر لی ۔ رتن سین نے سلطان کی مسلسل کئی روز تک دعوت کی ۔ ایک دن اتفاقاً محل کے قریب آئینے میں علاء الدین نے پدماوتی کا عکس دیکھ لیا جس کے بعد سلطان کی تمنا و بے قراری کئی گنا بڑھ گئی ۔ جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو علاء الدین نے دھوکے سے رتن سین کو گرفتار کر لیا اور دہلی میں لا کر قید کر دیا ۔ راجپوت سرداروں نے راجا رتن‌سین کو رہا کرانے کے لیے چال چلی ۔ چند جانباز سپاہی پالکیوں میں چھپ کر دہلی پہنچے ۔ مشہور کیا گیا کہ پدمنی ، علاء الدین کے حرم میں داخل ہونے کے لیے آئی ہے ۔ چنانچہ اسے راجا رتن سین سے آخری بار ملنے کی اجازت دی گئی ۔ پالکیوں میں چھپے ہوئے راجپوت عین موقعے پر تلواریں سونت سونت کر باہر نکل آئے اور انھوں نے قلعے کے سپاہیوں کو مار گرایا ۔ اس طرح راجا علاء الدین کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ۔ چتوڑ پہنچتے ہی رتن سین کا مقابلہ اپنے پڑوسی راجہ دیوپال سے ہو گیا جس نے رتن سین کی غیر موجودگی میں پدماوتی کو ورغلانے کی ناکام کوشش کی تھی ۔ دونوں میں سخت معرکہ ہوا ۔ دیو پال مارا گیا اور رتن سین کے بھی مہلک زخم آئے ۔ اسی اثنا میں علاء الدین بھی ایک جمعیت کثیر لیے رتن سین کے

تعاقب میں چتوڑ پہنچا ۔ مگر پدمنی اس کے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے رتن سین کی لاش کے ساتھ ستی ہو چکی تھی[1] ۔

تاریخی اصلیت :

ملک محمد جائسی نے ۹۴۷ھ میں اس قصّے کو اودھی زبان میں لکھا ۔ جائسی کی "پدماوت" اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ لوگ اس قصے میں بیان شدہ تمام باتوں کو تاریخی واقعات سمجھنے لگے ۔ چنانچہ بعد میں آنے والے بعض مورخوں نے بھی "پدماوت" کی اصلیت تسلیم کر لی اور اس واقعے کو سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کر دیا ۔ حالانکہ اس کے حقیقی ہونے میں کئی شبہات ہیں ۔

سلطان علاء الدین خلجی سے اس واقعے کا کوئی تعلق نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ علاء الدین کی کسی معاصر تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ۔ تاریخِ محمدی[۲] اور تاریخِ مبارک شاہی[۳] میں پدمنی کا کوئی تذکرہ نہیں ۔ برنی نے بھی اپنی تصالیف میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا[۴] ۔ خواجہ نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری[۵] میں اور مولانا عصامی دہلوی[۶] نے شاہنامہ موسوم بہ "فتوح

۱- ملک محمد جائسی : پدماوت ، مشمولہ جائسی گرنتھاولی (ہندی) ، مرتبہ ماتا پرشاد گپت ، ہندوستانی اکیڈیمی ، الہ آباد ، ۱۹۵۲ع ۔

۲- بحوالہ تاریخ سلاطین خلجی (انگریزی) ایس ۔ کے ۔ لال ، ص ۱۲۹ ۔

۳- تاریخ مبارک شاہی ، یحییٰ بن احمد بن عبداللہ ایسہرندی ، مرتبہ محمد ہدایت حسین ، کلکتہ ۱۹۳۱ع ، ص ۷۷ ۔

۴- تاریخِ سلاطین خلجی ، ص ۱۲۹ ۔

۵- طبقاتِ اکبری ، خواجہ نظام الدین احمد ، مرتبہ بی ۔ ڈے ، جلد اول کلکتہ ۱۹۲۷ع ، ص ۱۵۷ ۔

۶- فتوح السلاطین ، مولانا عصامی ، مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین ، ۱۹۳۸ع آگرہ ، ص ۲۲۹ ۔

السلاطین" میں چتوڑ کی فتح کا ذکر تو کیا ہے لیکن پدمنی کے وجود کو اس کا سبب قرار نہیں دیا ۔ امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" میں چتوڑ کی فتح کو مفصل بیان کیا ہے لیکن وہ بھی اس واقعے کا ذکر جائسی کی طرح نہیں کرتے[1] ۔ امیر خسرو فتحِ چتوڑ کے عینی شاہد تھے لیکن ان کے ہاں پدمنی کا کہیں ذکر نہیں ۔ اگر جنگ کی تہہ میں واقعی پدمنی کی کشش کارفرما ہوتی تو امیر خسرو جیسا بے ریا شاعر اسے ضرور بیان کرتا ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ اس واقعے کے بیان کرنے میں سلطان کی توہین اور خفت تھی اس لیے ہم عصر مورخین نے اسے خلافِ مصلحت قرار دے کر بیان ہی نہ کیا ۔ لیکن "تاریخ فیروز شاہی" عہدِ علاء الدین خلجی کے بہت عرصہ بعد فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھی گئی ۔ اس میں علاء الدین خلجی کے جملہ نقائص اور عیوب پوست کندہ بیان کر دیے گئے ہیں ۔ اگر پدمنی والا واقعہ سچ ہوتا تو اسے صاف صاف لکھ دینے میں تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کو کیا تامل ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ اس حقیقت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پدماوت کے قصے کا کوئی تعلق علاء الدین خلجی سے نہیں ۔ اس کے ثبوت میں چند دلائل اور بھی ہیں :

(الف) جائسی کا بیان ہے کہ علاء الدین اور رتن سین میں متواتر آٹھ سال تک جنگ ہوتی رہی ۔ اس کے برعکس خزائن الفتوح اور تاریخِ فیروز شاہی متفق ہیں کہ علاء الدین خلجی نے چتوڑ کو ایک ہی حملے میں فتح کر لیا[2] ۔

۱۔ خزائن الفتوح ، امیر خسرو ، مرتبہ محمد حبیب ، ص ۴۹ ۔ (انگریزی)
۲۔ خزائن ، ص ۴۹ ۔

(ب) جائسی نے رتن سین کو چوہان بتایا ہے جب کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ میں ششودھیا خاندان کی حکومت تھی[1] ۔

(ج) اس زمانے میں لنکا کا راجہ پراکرمابھو چہارم تھا ۔ لیکن جائسی نے لنکا کے معاصر بادشاہ کا نام گووردھن بتایا ہے[۲] ۔

(د) کہان راسا کی لوک روایت میں علاء الدین خلجی کے ہم عصر چتوڑ کے راجا کا نام رتن سین نہیں ، بلکہ ''لکھم سی'' اور اس کے چچا کا نام ''بھیم سی'' آیا ہے[۳] ۔

ان تمام تاریخی شواہد کی روشنی میں پدمنی کے واقعے کو سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کرنا غلط ثابت ہوتا ہے ۔ لیکن یہ مسئلہ مزید دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کی ایک مشہور و معتبر تاریخ میں پدمنی کا واقعہ علاء الدین خلجی کے ضمن میں اسی طرح بیان کیا ہے جیسے اسے جائسی نے لکھا ہے ۔ یہ تاریخ فرشتہ ہے ۔ اس سلسلے میں فرشتہ کے الفاظ غور طلب ہیں :

''در خلالِ ایں احوال راجہ رتن‌سین راجۂ قلعۂ چتوڑ کہ تا آنوقتہ در حبس بود ، بروشِ غیر مقرر ، نجات یافت و شرح آں چنیں ست کہ پس از مدتے کہ راجہ در قید بود ،

۱۔ تاریخ سلاطین خلجی ، ص ۱۳۹ ۔
۲۔ ایضاً ۔
۳۔ افسانۂ پدمنی ، محمد احتشام الدین دہلوی ، ص ۱۲۶ ۔

بسمع پادشاہ رسانیدند ، کہ درمیان زنانِ راجہ چتوڑ زنے
ست پدمنی نام - سہی قد ، سیہ چشم ، ماہ سیما و بجمیع
صفاتِ محبوبی متصف - پادشاہ بوے پیغام داد کہ خلاصیِ
تو منحصر در احضار آں جمیلہ است - رائے قبول نمودہ
کسان بطلب اہلِ و عیال خود ، کہ بکوہستانات محکم
پناہ بردہ بودند ، فرستاد تا ازاں میان مقصود پادشاہ را
حاصل نماید - اما راجپوتانِ خویشِ راجہ ازاں پیغام دلگیر
گشتہ ، سرزنش بسیار کردند - - - - دختر رائے کہ بفہم
و عقل مشہور خویشِ و قبیلۂ خود بود ، گفت ،
تدبیرے بخاطرم رسیدہ ، کہ ہم پدر زندہ ماند و ہم
بے ناموسی نرسد - و آں اینست کہ پالکی بسیار پُر از
مردمان کار ، باجماعتے از پیادہ و سوار روانۂ دہلی کنید و
آوازہ افکنید کہ حسب الحکم پادشاہ زنانِ راجہ متوجہ
حضورند و چوں بحوالیِ شہر رسند ، وقتِ شب بہ معمورہ
درآمدہ راہ حبس خانۂ راجہ را پیش گیرند و بعد ازانکہ
نزدیک آں رسند ، جملہ راجپوتاں تیغ ہا علم کردہ
بدرونِ وثاق در آیند ، و سر سرکشائے کہ قدمِ ممانعت
پیش گذارند ، جدا کردہ پدرم بر اسپ باد رفتار سوار سازند و
برق ساں راہِ ملکِ خود پیش گیرند - اہلِ رائے آں رائے
را پسندیدہ بداں عمل نمودند ، و جماعتے از فدائیاں در
پالکی ہا نشستہ روانۂ دہلی شدند - وقتیکہ پاسے از شب
گزشتہ بود ، بہ شہر درآمدند و آوازہ انداختند ، کہ
پدمنی را باسائر متعلقان رائے آوردیم - چوں بوثاق نزدیک
شدند ، یک بار راجپوتاں شمشیر ہا کشیدہ از پالکی ہا

بیرون آمد دویدند ، و بہ قتل محافظان اقدام نمودہ ، زنجیر رائے بشکستند و آو را سوار کردہ ، ہم چو مرغے کہ از قفس بجہد ، از شہر بیرون شدند و بہ جاعتے از راجپوتان کہ موجود بودند ، پیوستہ راہِ ولایت خود پیش گرفتند ۔ در اثنائے راہ سوارانِ پادشاہ کہ تعاقب کردہ بودند ، در چند موضع بایشان رسیدہ تلاشہا کردند ، و جمعے کثیر از راجپوتان بقتل آوردند ۔ لیکن رائے بہر عنوان کہ توانست ، افتان و خیزان بمشقت بسیار خود را بکوہستانے کہ اہل و عیال او درانجا بودند ، رسانید و بیمنِ دولتِ تدبیرِ دخترِ خوب سیرت از چنگِ عقوبتِ پادشاہ نجات یافتہ''[1] ۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ پدمنی کے حصول اور راجہ کی اسرہائی کے بارے میں فرشتہ کا بیان جائسی سے بہت ملتا جلتا ہے ۔ لیکن متعدد مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے پیشِ نظر فرشتہ کے بیان کو صحیح تسلیم کر لینا تاریخی احتیاط کے خلاف ہے ۔ علاء الدین خلجی نے ۷۰۳ھ میں چتوڑ فتح کیا ۔ اس کے ۲۴۴ برس بعد یعنی ۹۴۷ھ میں جائسی نے پدماوت اور ۳۱۲ برس بعد یعنی ۱۰۱۵ھ میں فرشتہ نے اپنی تاریخ لکھی ۔ حیرت ہے کہ تین سو برس تک کسی دوسرے مورخ یا مصنف نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہ کیا ۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اس واقعے سے متعلق خود فرشتہ کا ماخذ کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جائسی کی مثنوی تصنیف ہوتے ہی بہت مقبول و معروف ہوئی اور ہر خاص و عام کی زبان پر اس کی

۱۔ تاریخ فرشتہ (جلد اول) ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴ع ، ص ۱۱۵ ۔

کہانی چڑھ گئی ۔ چونکہ اس میں شجاعت ، حسن ، دلیری اور مردانگی کے عناصر کی فراوانی تھی ، راجپوتوں نے اسے اپنی قومی تاریخ کا واقعہ سمجھا اور عام طور پر اسے سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کیا جانے لگا ۔ فرشتہ کے زمانے میں یہ کہانی امر واقعہ سمجھی جاتی تھی ۔ چنانچہ اس نے بھی اسے صحیح تسلیم کیا اور اپنی تاریخ میں اسے سلطان علاء الدین خلجی کے حالات میں درج کر دیا ۔ جیمس ٹاڈ نے بھی پدمنی کے واقعے کا ذکر ''کھمان راسو'' کو بنیاد بنا کر کیا ہے[1] ۔ ''کھمان راسو'' راجپوتوں کا قومی گاتھا ہے ۔ گمان غالب ہے کہ خود کھمان راسو میں پدمنی کا ذکر جائسی کی ''پدماوت'' کی شہرت کے بعد کیا جانے لگا ۔ جائسی کی مثنوی شیر شاہ سوری کے زمانے میں مکمل ہوئی تھی ، جبکہ ''کھمان راسو'' اکبر اعظم کے آخری زمانے میں مدون ہوا ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرشتہ ، جائسی کے روایتی قصے سے متاثر ہو کر اسے اپنی تاریخ میں لکھ گیا ہے اور ''کھمان راسو'' میں بھی پدمنی کے حوالے جائسی کی مثنوی کا نتیجہ ہیں تو کیا جائسی کی کہانی کا واقعاتی حصہ محض اس کے تخیل کی پرواز ہے یا اس کا کوئی تعلق اپنے زمانے کے محاربات سے بھی ہے ؟ جائسی کے زمانے کی سیاست کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پدمنی جیسی حسین عورت کے لیے کسی بادشاہ کا جنگ پر آمادہ ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ۔ اس بات کی قطعی تردید ہو جانے کے بعد کہ علاء الدین خلجی کے حملۂ چتور میں کسی ایسی چیز کو دخل نہیں تھا ، گمان گزرتا ہے کہ پدمنی کے لیے چتور پر حملہ کرنے والا علاء الدین خلجی نہیں بلکہ

۱- Annals and Antiquities of Rajasthan Tod. (James)
۱۹۱۴ع ، جلد اول ، ص ۲۱۳ -

کوئی دوسرا خلجی حکمران ہو اور اس کے نام میں جائسی اور جائسی سے متاثر دوسرے راویوں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ محمد احتشام الدین[1] کا یہ خیال صحیح ہے کہ پدماوت کے قصے میں کوئی صداقت ہے تو یہ واقعہ سلطان غیاث الدین خلجی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ غیاث الدین خلجی (علاء الدین کے دو سو برس بعد) ملک مالوہ میں گزرا ہے۔ اس کے حدود سلطنت چتوڑ کی ریاست سے ملے ہوئے تھے اور اکثر باہم لڑائی رہتی تھی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان کے دربار میں کوئی نا مشروع بات نہیں ہونے پاتی تھی۔ لیکن اسے خوبصورت عورتوں کا بے حد شوق تھا۔ ہزارہا حسین عورتیں اس کی خدمت میں حاضر رہتیں۔ پھر بھی سلطان کو حسرت تھی کہ جیسے حسن اور صورت کو اس کا جی چاہتا تھا وہ میسر نہیں۔ آخر اس کے ایک مصاحب نے اپنی کوششوں سے سلطان کی یہ خواہش پوری کی۔ اس میلان کے پیش نظر سلطان سے بعید نہیں کہ اس نے حسین ترین عورت (پدمنی) کی جستجو میں چتوڑ پر دھاوا بول دیا ہو۔ ساتھ ہی وہ شرع کا بھی بہت پابند تھا اور شرع کی رو سے چونکہ غیر کی زوجہ پر نظر ڈالنا حرام ہے اس لیے شرع کی گرفت سے بچنے کے لیے غیاث الدین خلجی نے چتوڑ کی حسین ترین رانی کو، جس کا نام اس کے حسن کے سبب سے پدمنی یا پدماوت رہا ہو، آئینے میں دیکھنے کی ترکیب نکالی ہو اور اس کی حسن پرستی کا یہ واقعہ عوام کی زبان پر چڑھ کر دور نزدیک مشہور ہو گیا ہو۔

غیاث الدین خلجی سلطانِ مالوہ اور خاندان چتوڑ کے مابین جنگ کی تصدیق اکانگاجی کے ایک ہندی کتبے سے بھی ہوتی ہے۔

۱- افسانۂ پدمنی، محمد احتشام الدین، دہلی ۱۹۲۹ء، ص ۱۲۱۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۴۸۸ء میں مالڈو کے سلطان غیاث الدین خلجی نے ''بادل گورا'' سے شکست کھائی ۔ یہ ''بادل گورا'' نامی راجپوت سردار وہی ہیں جن کا ذکر مثنوی پدماوت میں جائسی نے بار بار کیا ہے۔ پدمنی کے واقعے کو غیاث الدین خلجی سے منسوب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رتن سین نام کا کوئی راجہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ کا حکمران نہیں تھا ۔ لیکن رانا سانگا کا فرزند رتن سین تقریباً غیاث الدین خلجی ہی کے زمانے میں چتوڑ کا راجہ ہو گزرا ہے اور اغلب ہے کہ اسی رتن سین سے غیاث الدین خلجی کے معرکے رہے ہوں ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین خلجی ہی کی حسن پرستی کے واقعے پر جائسی نے اپنی مثنوی کی بنیاد رکھی ہو ۔ یہ واقعہ جائسی کے اپنے زمانے سے قریب تھا اور اس سے جائسی کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قصے کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے جائسی نے اپنے زمانے کے دوسرے تاریخی واقعات سے بھی اثر لیا ہو ۔ مثلاً ڈولیوں اور پالکیوں میں مسلح سپاہیوں کا جانا اور گوہر مقصود حاصل کرنا خود جائسی کی زندگی کا واقعہ ہے ۔ شیر شاہ نے بنگالہ کی مہم کو جاتے ہوئے اپنے اہل و عیال اور خزانے کو رہتاس کے راجا کے پاس چھوڑنے کی اجازت چاہی تھی ، لیکن دراصل پالکیوں میں سپاہی بھیج کر قعلہ فتح کر لیا تھا ۔ قصۂ پدماوت کی تیسری اہم کڑی یعنی ''جوہر کی رسم'' بھی غیر تاریخی بات نہیں ۔ خود جائسی کے زمانےمیں جب ۹۳۸ھ میں سلطان بہادر گجراتی نے رائے سین کے راجا سلہدی پر فوج کشی کی تو اس کی یگانۂ روزگار رانی درگاوتی اور سینکڑوں دوسری رانیوں نے آگ میں کود کر جوہر کرلیا ۔ عین ممکن ہے کہ جائسی نے اپنے زمانے کے ان واقعات کو

آب و تاب دے کر ایک مربوط مثنوی کے پیکر میں ڈھال دیا ہو ۔ جائسی کی ''پدماوت'' اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ اس کا قصہ مختلف زبانوں میں ترجمہ و تلخیص کے ذریعے لیا گیا ۔

اس کا اولین انگریزی ترجمہ جی ۔ اے ۔ گریرسن اور سدھاکر دویدی نے مل کر کیا تھا جو کلکتے سے ۱۸۹۶ع میں شائع ہوا ۔[۱] انگریزی کا ایک اور ترجمہ فیض آباد کے انگریز کمشنر اے ۔ سی ۔ شیرف نے ۱۹۴۰ع میں کیا[۲] ۔ پشتو زبان میں پدماوت کو ابراہیم نے منتقل کیا[۳] ۔ پشتو زبان کا دوسرا ترجمہ "ملا" گل احمد پجاغی کا ہے ۔ یہ قصہ ''شہزادہ رت و پدمن افغانی'' کے نام سے دہلی سے ۱۸۸۱ع میں شائع ہوا[۴] ۔ بنگالی میں اس قصے کا ترجمہ اراکان کے وزیر مگن ٹھاکر نے کسی شخص ''الواج لو'' سے ۱۶۵۹ع میں کرایا تھا[۵] ۔ فارسی اور اردو میں بھی پدماوت سے متعلق کئی نسخے ملتے ہیں ۔ چونکہ بعض اردو مثنوی نگاروں نے قصہ اصل اودھی سے نہیں ، بلکہ فارسی مثنویوں سے اخذ کیا ہے اس لیے فارسی نسخوں کے نام سامنے رکھنا بھی ضروری ہے ۔

فارسی نسخے :

۱۔ فارسی میں پدماوت کو سب سے پہلے عبدالشکور بزمی نے بہ عہدِ جہانگیر ۱۶۱۸ع (۱۰۲۸ھ) میں لکھا ۔ یہ

۱۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ، رام چندر شکل ، ص ۱۸۳ ۔

۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین : رسالہ اردو ، اگست ۱۹۵۰ع ۔

۳۔ ایتھے نمبر ۱۵۸۲ ۔

۴۔ پشتو کتب برٹش ، کالم ۲۰ ۔

۵۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ، رام چندر شکل ، ص ۹۲ ۔

مثنوی انڈیا آفس لندن میں موجود ہے[1] ۔

۲۔ عاقل خاں رازی نے ۱۶۵۸ع (۱۰۶۹ھ) میں ''شمع پروانہ'' (رت پدم) کے نام سے یہی قصہ پھر لکھا ۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن اور انڈیا آفس میں محفوظ ہے[2] ۔

۳۔ مثنوی ''حسن و عشق'' : از حسام الدین ۱۶۶۰ع (۱۰۷۱ھ) نسخہ برلن ، ص ۹۲۹ ۔[3]

۴۔ مثنوی پدماوت : از حسن غازانہ نسخہ برلن نمبر ۹۱۱ ۔[4]

۵۔ لچھمی رام متوطن ابراہیم آباد نے عاقل خاں رازی کی مثنوی ''شمع و پروانہ'' کو فارسی نثر میں ''فرح بخش'' کے نام سے منتقل کیا ۔ نسخہ برٹش میوزیم مکتوبہ ۱۲۱۷ھ[5] ۔

۶۔ ''فرح بخش'' کا فارسی خلاصہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کیا ۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے[6] ۔

۷۔ ''قصص پدماوت'' کے نام سے حسین غزنوی نے فرخ سیر کے زمانے میں لکھا[7] ۔

۱۔ ایتھے نمبر ۱۵۸۳ ۔ نیز اشپرالکر ، ص ۳۷۶ ۔ آصفیہ ج ۲ ، ص ۱۳۴۸ ۔
۲۔ ایتھے نمبر ۱۶۳۴ ۔ اور ۱۶۳۵ ۔ نیز اشپرالکر ص ۵۴۳ ۔ سالار جنگ ۶۱۷ ، فارسی نظم ۔
۳۔ یورپ میں دکنی مخطوطات ، ص ۱۱۷ ۔
۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات ، ص ۱۱۷ ۔
۵۔ ریو برٹش ، نمبر اڈیشنل ۸۹۱۸ ، ص ۷۶۸ ۔
۶۔ ایضاً ، نمبر ۱۹۳۱ ۔
۷۔ اسٹوارٹ (فارسی منظومات) ، ص ۱۲۳ ۔

۸- رائے گوبند منشی نے پدماوت کو فارسی (نثر) میں لکھ کر "تحفۃ القلوب" نام رکھا[1] - سنہ تصنیف ۱۶۵۲ع - ایک ناقص مخطوطہ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے -

۹- دکھنی شاعر سید محمد عشرتی نے جائسی کی "پدماوت" کو فارسی میں ملخص کیا - اس کا سنہ تصنیف "گلے ختمی" ۱۶۹۸ع (۱۱۱۰ھ) ہے[2] -

۱۰- مثنوی بوستانِ سخن : (قلمی) امامی - سنہ تصنیف ۱۲۲۹ھ - تعداد اشعار ۳۲۸۳- نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی (ذخیرۂ ٹونک ۳۰۸۵) -

۱۱- ہنگامۂ عشق : (قلمی) منشی آنند رام مخلص - فارسی نثر میں تصنیف ۱۱۵۲ھ- ۱۱۵۵ھ میں اس پر نظرثانی کی - مخطوطہ نذیریہ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے -

۱۲- قصۂ پدمنی قلمی : (مثنوی) مجہول المصنف - نسخۂ کتاب خانۂ ٹیپو سلطان ، بحوالہ اسٹوارٹ ، فارسی منظومات ، ص ۷۳ -

۱۳- قصۂ رتن و پدم : (قلمی) مجہول المصنف ، کتاب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن -

اردو نسخے :

۱- اردو نثر میں پدماوت کو سب سے پہلے مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی نے لکھا - اس کا نام "پدماوت بھاکا

۱- ملک محمد جائسی : کلب مصطفیٰ ، ص ۱۰۴ -
۲- شمس اللہ قادری : اردوئے قدیم ، ص ۹۸ -

مترجم“ ہے ۔ یہ ترجمہ مطبع اعظمی کان پور سے ۱۸۹۸ع (۱۳۱۶ھ) میں طبع ہوا ۔ جائسی کی مثنوی کا متن اردو رسم الخط میں درج کیا گیا ہے اور اس کے نیچے اشعار کا اردو ترجمہ ساتھ ساتھ دے دیا ہے ۔[1]

۲۔ ”پدماوت بھاکا مترجم“ : از احمد علی رسا ۔ ہندی متن اردو رسم الخط میں مع اردو ترجمہ و اردو حواشی ۔ کان پور ، ۱۸۹۹ع ، صفحات ۲۳۶ ۔[2]

۳۔ ”پدماوت“ : (یعنی ایک سچی داستان) از سالک رام ساکن کپورتھلہ ، لاہور ۱۸۹۸ع ، صفحات ۱۷۲ ۔[3]

۴۔ پدماوت بھاکا : مترجم از پنڈت بھگوتی پرشاد پاندائے انوج ، مطبع نولکشور ، لکھنو ، ص ۳۳۶ ۔[4]

۵۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے ملی جلی ”بھاکا اور اردو“ زبان میں پدماوت لکھی ۔ اس کا ذکر ضیاء الدین خاں نے پدماوت کے فارسی خلاصے میں کیا ہے ۔ (ریو ۳۶ ۔ ا ب)

۶۔ پدماوت اردو : (منظوم ڈرامہ) از نوشیرواں جی مہربان جی[5] آرام بمبئی (اردو ڈرامہ ، عشرت رحمانی ، ص ۲۰۴) ۔

۷۔ محبت کی پتلی یعنی رانی پدماوتی : (اردو نثر) از محمد اکبر علی

۱۔ پدماوت بھاکا ، مترجم عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی ، مطبع اعظمی کانپور ۱۸۹۸ع ۔

۲۔ بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ ، فولیو ۲۶۲ ۔

۳۔ بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ ، فولیو ۴۲۲ ۔

۴۔ کتب خانہ دانش گاہ دہلی ۔

۵۔ نسروان جی مہروان جی آرام ۔

خاں افسوں شاہجہان پوری ۔ قصہ ناول کے پیرائے میں ہے ۔ (ابو العلائی پریس آگرہ ، کل صفحات ۱۱۲) ۔

۸۔ مثنوی پدم ساخ اردو : (قصہ پدماوت) از بہاری لال بیدل ۔ صفحات ۱۳۰ ۔ مطبوعہ بجنور ۱۸۸۵ع (بحوالہ انڈیا مطبوعات ، ص ۱۵۸) ۔

۹۔ پدماوت : بزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) از پنڈت سروپ چند دسوڑ کھیڑی ۔ اردو رسم الخط میں یہ کتاب شمبھو دیال دیناناتھ نے دریبہ کلاں دہلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع کی ۔

۱۰۔ پیرامن طوطا پدماوت ناز : بزبانِ ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) مصنفہ سی ۔ ایچ ۔ حکم چند ۔ یہ کتاب بھی اردو رسم الخط میں دہلی سے شائع ہوئی ۔

اردو نظم میں پدماوت کی چھ روایتوں کا علم ہوا ہے ۔ ان میں سے تین دکھنی شاعروں اور تین شمالی ہند کے شاعروں سے منسوب ہیں :

۱۔ قصہ پدماوت : غلام علی دکھنی ۔ (قلمی) نسخہ انڈیا آفس۔[۱] اوراق ۲۱ ۔ سنہ تصنیف ۱۶۸۰ع (۱۰۹۱ھ) ۔ یہ نسخہ مکمل نہیں ہے ۔

۲۔ رتن پدم : سید محمد فیاض "ولی" ویلوری ۔ یہ مثنوی بہ قول اشپرانگر شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں تھی ۔ تعداد ابیات تقریباً چار ہزار ۔ صفحات چار سو[۲] ۔

۱۔ بلوم ہارٹ انڈیا ، نمبر ۳/۷۳ ۔

۲۔ اشپرالگر ، نمبر ۷۲۰ ۔

۳- دیپک پتنگ : سید محمد خان عشرتی مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد صفحات ۲۱۶ - سنہ تصنیف ۱۶۹۵ع (۱۱۰۷ھ) سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ -[1]

۴- مثنوی شمع و پروانہ : ضیاء الدین عبرت و میر غلام علی عشرت - سنہ تصنیف ۱۷۹۶ع (۱۲۱۱ھ) -[2]

۵- پدماوت : محمد قاسم علی بریلوی ، سنہ تصنیف ۱۸۶۹ع ، ص ۴۸۳ -[3]

۶- سالگیا پدماوت : از سکھ داس خلف نرائن داس چندوسی ، ۱۸۹۵ع ، صفحات ۱۵۸ -[4]

یہ مقامی روایتوں پر مشتمل ایک نظم ہے جس میں جگہ جگہ دوہے بھی آ گئے ہیں - غالباً یہ گانے کے لیے لکھی گئی ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے -

۷- مثنوی ''بت خانۂ خلیل'' : از خلیل حسن خلیل لکھنوی - یہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم اردو ترجمہ ہے - خلیل بڑے بھائی تھے جلیل کے - امیر مینائی سے شرف تلمذ تھا - راجہ بلرام پور کے ملازم ہوئے اور تا دمِ حیات انھی سے وابستہ رہے - ریاست ہی کی طرف سے ان کی تصانیف ''مرقع بلرام پور'' اور ''پنجۂ نگاریں'' زیور طبع سے آراستہ ہوئیں - ''پنجۂ نگاریں'' ان کی پانچ مثنویوں کے

۱- سالار جنگ ، ص ۶۱۹ -

۲- مخطوطہ پدماوت ، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ، نشان ۶۳۰/۷۵ -

۳- پدماوت محمد قاسم علی بریلوی ، مطبع نول کشور ۱۸۶۳ع کانپور -

۴- بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ ، فولیو ۴۴۳ -

مجموعے کا نام ہے جن میں سے ایک پدماوت کا یہی اردو ترجمہ مثنوی بت خانۂ خلیل ہے ۔

(ادبی دنیا ، ستمبر ۱۹۳۹ع و جولائی ۱۹۳۶ع)

مثنوی پدماوت ، غلام علی دکھنی :

اس مثنوی کا واحد نسخہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے[1] ۔ یہ ناقص الآخر ہے اور اس نامکمل نسخے کے سوا اس مثنوی کا کوئی اور نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ۔ غلام علی کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں ۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام علی بلند پایہ شاعر تو نہیں تھا تاہم اس نے مثنوی کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے ۔ یہ مثنوی سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں نظم کی گئی ۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۶۸۰ع (۱۰۹۱ھ) ہے ۔ مثنوی کی ابتدا حسبِ رواج حمد و نعت و منقبت سے ہوتی ہے ۔ اس کے بعد بادشاہ کی مدح ہے اور عشق کی تعریف سے قصے کا آغاز ہوتا ہے ۔ غلام علی نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ۔ نصیر الدین ہاشمی نے ''یورپ میں دکھنی مخطوطات'' میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے ۔ عبدالشکور بزمی کی فارسی مثنوی سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ غلام علی کا قصہ بزمی سے ماخوذ ہے ۔ یہ مثنوی ناقص الآخر ہے ۔ شادی کے بعد جب راجا رتن سین پدمنی کو ساتھ لیے چتوڑ کو واپس روانہ ہوتا ہے تو راہ میں ان کا جہاز طوفان میں گھر کر پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہ لوگ ایک راکشس کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں ۔ اس کے بعد مثنوی کے اوراق غائب ہیں ۔ خاتمہ ان

۱- بلوم ہارٹ انڈیا ، نمبر ۳/۷۳ ۔

اشعار یہ ہے :

میں راکش توں انسان میرا خوراک
لے آیا ہوں یہاں تج کوں کرنے ہلاک
دیوانا ہے توں منج لب آئیا
میری بات سن ساٹ توں آئیا

غلام علی کا اسلوبِ بیان سادہ اور آسان ہے ۔ گولکنڈہ کی مثنویوں میں یہ مثنوی تاریخی مقام رکھتی ہے[1] ۔

مثنوی رتن پدم ، ولی ویلوری :

پدماوت کا دوسرا منظوم ترجمہ ولی ویلوری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ۔ بظاہر یہ مثنوی نایاب ہے اور اس کا کوئی مخطوطہ اس وقت یورپ یا ہندوستان میں نہیں ۔ اس کا ذکر صرف اشپرالگر[2] اور اسٹوارٹ[3] نے اپنی اپنی فہرستوں میں کیا ہے ۔ ولی ویلوری کا پورا نام سید ولی فیاض اور ولی تخلص تھا ۔[4] ویلور علاقہ مدراس کے باشندے تھے ۔ عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں ۔ وفات قبل ۱۱۵۰ھ[5] ۔ "رتن پدم" کے علاوہ انھوں نے دو اور مثنویاں "روضتہ الشہدا" اور "دعائے فاطمہ" بھی لکھیں[6] ۔ ولی ویلوری نے مثنوی پدماوت کے شروع میں اپنے حالات بیان کیے ہیں ۔ پہلے یہ سات گڑھ

۱۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات ، ۱۹۳۲ع ، ص ۱۱۷ تا ۱۳۵ ۔
۲۔ اشپرالگر ، ص ۶۳۱ ، نمبر ۴۲۰ ۔
۳۔ فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان ، اسٹوارٹ ، ص ۱۸۰ ۔
۴۔ شمس اللہ قادری : اردوئے قدیم ، ۱۹۲۵ع ، ص ۱۰۰ ۔
۵۔ نصیرالدین ہاشمی : دکن میں اردو (بار سوم) ، ۲۲۸ ۔
۶۔ شمس اللہ قادری : اردوئے قدیم ، ص ۱۰۲ ۔

میں حراست خاں کی رفاقت میں رہے ۔ اس کے بعد کڑپہ چلے آئے اور یہاں کے صوبہ دار نواب عبدالمجید خاں کے ملازم ہو گئے جنھوں نے انھیں سدھوٹ میں تعینات کر دیا ۔ قصہ رتن و پدم بمقام سدھوٹ ہی لکھا گیا ۔ اشپرانگر نے اس مثنوی کا نام صرف "رتن" بتایا ہے[1] جو غلط ہے ۔ مثنوی کا پہلا شعر ہے :

خدایا تو ہے پاک پروردگار
نرلکار ، داتار و اچھے اپار

تخلص :

ولی تیرے کرم کی ہے مجھے آس
نہ کر اس آس سوں ہرگز تو نراس

اشپرالگر کا بیان ہے کہ یہ مثنوی ذخیرہ توپ خانہ میں تھی ۔ کل صفحات چار سو اور ہر صفحے پر گیارہ ابیات تھے[2] ۔

مثنوی دیپک پتنگ عشرق :

عشرق کی اس مثنوی کے نسخے جنوبی ہند کے کتب خانوں میں عام پائے جاتے ہیں ۔ اردوئے قدیم اور اردو شہ پارے میں اس مثنوی کا ذکر ملتا ہے ۔ اس مثنوی کا ایک مستند نسخہ عشرق کے پوتے زین العابدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانۂ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے ۔ اس کا سنہ کتابت ١١٨٩ھ ہے ۔ یہ مثنوی ١٦٩٥ع (١١٠٧ھ) میں تصنیف ہوئی[3] ۔

١- اشپرانگر ، ص ٦٣١ ۔
٢- اشپرانگر نمبر ٢٠٧ ۔
٣- سالار جنگ ، ص ٦١٩ ۔

عشرتی کا پورا نام سید محمد اور والد کا نام سید یوسف حسینی تھا۔ حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں گزرے ہیں[1]۔ مؤلفِ ''دکن میں اردو'' نے ''دیپک پتنگ'' کے علاوہ ان کی دو اور مثنویوں ''چت لگن'' اور ''نیہ درپن'' کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔ عشرتی نے جائسی کی پدماوت کو فارسی میں ملخص بھی کیا تھا جس کا ذکر فارسی نسخوں کے ذیل میں اوپر کیا جا چکا ہے۔ مثنوی دیپک پتنگ حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد عشرتی نے اپنے دوست خواجہ علی کا تذکرہ کیا ہے جس کے بعد سے قصے کا آغاز ہے۔ عشرتی نے پدماوت کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ عام قصوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں عشق کی ابتدا پدماوتی کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ رتن کی تلاش میں مصیبتیں جھیلتی ہے۔ آخر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ مثنوی کا آخری ایک ورق نہیں ہے۔

آغاز :

الٰہی توں سر جیاز میں ہور زماں
دیپایا سورج جوت سوں آسماں
فلک کوں بنایا توں گردش کے چال
سیہ تس میں لایا چندر کا ہلال

۱۔ اردوئے قدیم ، ص ۹۸ ۔
۲۔ دکن میں اردو ، ص ۲۳۳ ۔ یہ غلط ہے۔ نیہ درپن ہنر کی تصنیف ہے ۔

خاتمہ :

بھنور میں یوں دیکھا سو وہ سبب لیں
مٹیا بھیگی خشک روٹی کتئیں[1]

مثنوی شمع و پروانہ :

پدماوت کا یہ چوتھا منظوم ترجمہ دو مصنفوں کا مرہونِ منّت ہے ۔ ضیاءالدین عبرت نے رام پور کے سپہ سالار نجو خاں کی فرمائش پر اسے نظم کرنا شروع کیا تھا ۔ ضیاء الدین خاں عبرت ، محبت خاں محبت بن حافظ رحمت خان والیِ روہیلکھنڈ کے شاگرد تھے ۔ قصہ ابھی ایک تہائی کے قریب ہی نظم ہوا تھا کہ عبرت نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ۔ اسے عبرت کے انتقال کے تقریباً سات آٹھ برس بعد غلام علی عشرت بریلوی نے قدرت اللہ شوق کی فرمائش پر ۱۲۱۱ھ[2] میں پورا کیا[3] ۔ عشرت میر معظم علی کے بیٹے تھے ۔ مشورۂ سخن مرزا علی لطف سے تھا اور بریلی کے رہنے والے تھے۔[4] اس مثنوی کے قلمی نسخے عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں ۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کا نسخہ ناقص الآخر ہے ، اس کا مکمل نسخہ لٹن لائبریری کے ذخیرۂ سر شاہ سلیمان میں موجود ہے ۔[1] یہ مثنوی پہلے پہل لکھنؤ سے ۱۸۵۸ع میں شائع ہوئی ۔ اس کے بعد سے اس کے کئی ایڈیشن منظرعام

۱- سالار جنگ ، ص ۶۱۹ -
۲- ''تصنیف دو شاعر'' تاریخ ہے ۱۲۱۱ھ -
۳- مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ ، نشان ۵۷/۶۳۰-
۴- گلشنِ بے خار ، ص ۱۳۵ -
۵- مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرۂ سر شاہ سلیمان ، علی گڑھ ، نشان ۱۰۸/۵۰ -

پر آ چکے ہیں ۔ مثنوی کی ابتدا ضیاء الدین عبرت نے حسبِ دستور حمد و نعت ، مناجات اور پیرِ طریقت کی تعریف سے کی ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے چند اشعار اپنے استاد محبت خاں محبت کی مدح میں لکھے ہیں ۔ آگے کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرت جب ایک ہندو راجا رانی کا قصہ لکھنے لگے تو بعض احباب نے اعتراض کیا ۔ عبرت انھیں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں :

یہ عشق آزاد ہے کا کفر و دیں سے
نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
نہیں کچھ مانتا عشقِ ستم گار
کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار
جہاں میں عشق کا جو رسم و دیں ہے
معافِ حضرتِ شرعِ متیں ہے
کرے گا اعتراض اس میں جو بے جا
جنابِ عشق کا مردود ہوگا[1]

اس کے بعد ضیاء الدین عبرت معترضین کو لاجواب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا وطن ہندوستان ہے اور مجھے وطن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ۔ جو بات اپنے وطن میں ہے وہ دوسرے ملکوں میں کہاں ؟ پھر کیوں اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسروں کے قصے دہراؤں ؟ وطن کی روایتوں اور قصوں سے منہ موڑنا وطنیت کے تقاضے کے خلاف ہے ۔

۱- مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرۂ سر شاہ سلیمان ، علی گڑھ (سببِ تالیفِ کتاب) ۔

ولیکن قصہ کہتا ہوں وطن کا
که ہوں میں عندلیب اپنے چمن کا
سوادِ ہند کو اے مونسِ جاں!
بناؤں سرمۂ چشمِ صفاہاں
کروں ہندوستاں کا عشق مرقوم
مجھے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
ہے شعلہ عشقِ ہندی کا شرر ریز
کہ ہے کا آفتاب اس کا بہت تیز
کہ سوزِ عشقِ ہندی تیز تر ہے
عرب کے عشق سے خولریز تر ہے[1]

مثنوی کے آغاز میں عبرت نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے اپنی مثنوی کا قصہ عاقل خاں رازی کی پدماوت سے لیا ہے:

رقم جو ہے یہ مضموں شعلہ بنیاد
مری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
مگر مضمونِ عاقل خانِ رازی
کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی[2]

عبرت نے قصے کے عنوانات اشعار میں لکھے ہیں ۔ یہ اشعار باہم مربوط ہیں ۔ اگر انھیں ایک جگہ جوڑا جائے تو یہ مل کر قصیدہ بن جاتے ہیں ۔ یہ قصیدہ ایک طرح سے خلاصہ ہے جس میں قصے کا عطر پیش کر دیا گیا ہے ۔ عبرت کا اندازِ بیان سادہ اور دل نشیں ہے ۔ اشعار رواں دواں اور مترنم ہیں ۔ قصے کی دلچسپی ہر قدم قائم رہتی ہے ۔ عبرت نے قصے کو راجہ رتن سین کے جوگی بن کر سنگل دیپ جانے

۱- مثنوی شمع بروالہ مذکور ۔ ۲- ایضاً ، ورق ۶ ۔

اور توتے کی زبانی پدماوت کو پیغام بھیجوانے تک نظم کیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ اس حصے سے نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رتن سین ایک راجا میں نے پایا
تری خاطر ہوں جوگی کر کے لایا
وہ شہزادہ ہے اب تیرا بھکاری
ترے بن زندگی ہے اس کو بھاری
وہ اپنی سی نہایت کر چکا ہے
تو کر آگے جو کچھ تیری رضا ہے
وہاں بیکس کی ناحق جان جاوے
یہاں ناحق تو ہتیاری کہاوے
جو توتے سے سنی حیرت کی گفتار
ہوئی وہ نازنیں اک نقشِ دیوار
جوانی کا جو عالم تھا پدم کا
سرایت کر گیا قصہ یہ غم کا
لیا دل کا وہیں تھام اس نے مینا
کہ رازِ عشق ہو جاوے نہ افشا
کہا توتے تری خاطر ہے منظور
مرے اس راز کو رکھیو تو مستور
صنم کے پوجنے کے دن ہیں نزدیک
کروں میں جا کے روشن جان تاریک
جو یوں جاؤں سمجھ اے نیک فرجام
کہ و مہتر میں ہو جاؤں گی بدنام[1]

اس کے آگے کا قصہ غلام علی عشرت نے نظم کیا ہے اور

۱- مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ، ورق ۱۷ -

پیوند اس خوبی سے لگایا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا۔ پہلے حصے کا زورِ قلم اور لطفِ بیان دوسرے حصے میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دو مصنفوں کی وجہ سے مثنوی کی روانی، دلچسپی اور صفائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خاتمے کے اشعار یہ ہیں :

غرض یہ فتح پا کر حسبِ دل خواہ
علاء الدین نے لی چتّوڑ کی راہ
نواحِ شہر میں داخل ہوا جب
سنا یک بارگی وہ ماجرا سب
کہوں کیا میں کہ شہ یہ ماجرا سن
ز بس تصویر آسا رہ گیا سُن
غرض خاکِ عدم سر پر اڑا کے
بصد افسوس و غم آنسو بہا کے
کیے اپنے یہ بس سر در گریباں
چلا دہلی کی جانب زار و گریاں
سنی تم نے عزیزو! یہ کہانی
کہ ہے اللہ باقی کل فانی[1]

مثنوی پدماوت، قاسم :

محمد قاسم علی بریلوی کی پدماوت منظوم ۱۸۶۹ع میں تصنیف ہوئی اور ۱۸۷۳ع میں مطبع نولکشور لکھنو سے شائع ہوئی۔ محمد قاسم علی کا سلسلۂ نسب یہ ہے : محمد قاسم علی ابن مولوی محمد قائم علی

۱۔ مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرہ سر شاہ سلیمان علی گڑھ۔

بن شیر علی بن مہر علی بن مولوی علی صادق[1] ۔ یہ بدایوں کے باشندے تھے ، لیکن مثنوی کی تصنیف کے وقت بریلی کے محلہ گڑھیا میں مقیم تھے[2] ۔ محمد قاسم علی ، عبرت اور عشرت کی مثنوی پدماوت سے باخبر تھے ۔ چونکہ دونوں نے قصہ اصل اودھی زبان کی بجائے عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی سے اخذ کیا تھا ، محمد قاسم علی ان کے بارے میں صحیح کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھاکا کے مزاج دان نہیں تھے اور انھوں نے جائسی کی مثنوی کو بہ تمام و کمال اردو قالب نہیں پہنایا :

مذاق بھاکا لیکن تھا نہ پایا
یہ شاہد گود میں ان کی نہ آیا
ولے تاہم لکھا ہے کر کرامت
کہ قصہ لے لیا اکثر سلامت

عبرت و عشرت کی مثنوی ترجمہ در ترجمہ ہے ۔ اس کے برعکس قاسم نے براہِ راست جائسی سے ترجمہ کیا ہے اور اپنی مثنوی میں یہ التزام رکھا ہے کہ جائسی کی پدماوت کا ترجمہ ''بیت بہ بیت اور دوہرہ بدوہرہ دیسی اردو زبان میں کیا جائے''[3] ۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قاسم علی نے شعر کے مقابلے میں شعر اور بند کے مقابلے میں بند لکھا ہے اور معنی کے اعتبار سے یہ اردو مثنوی جائسی کی اودھی مثنوی کا لفظی ترجمہ ہے ، لیکن ترجمے کی پابندی اور قیود کے باعث مثنوی میں اصل اور نقل کا فرق پیدا ہو گیا ہے ۔ قاسم کی مثنوی

۱۔ مثنوی پدماوت ، قاسم علی بریلوی ، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۳ع ۔ (دیباچہ)
۲۔ ایضاً ۔
۳۔ ایضاً ۔

میں تسلسل تو ہے لیکن جوش ، روانی اور بے ساختگی نہیں - ہر جگہ آورد کا رنگ غالب ہے - کہیں کہیں اردو مترادفات یا صحیح قافیہ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے اودھی الفاظ برقرار رکھے ہیں جن سے نظم میں غرابت اور اشکال پیدا ہو گئے ہیں - محمد قاسم علی نے ہر منظر اور ہر واقعے میں جائسی کی پیروی کی ہے - چنانچہ مثنوی بے حد طویل ہو گئی ہے - پدماوت سے متعلق اردو کی پانچوں مثنویوں میں یہ طویل ترین ہے - جائسی کی سی قادر الکلامی، زورِ تخیل، لطف بیان اور جدتِ ادا قاسم علی کے پاس کہاں - ترجمہ بے رنگ اور پھیکا سیٹھا ہو کے رہ گیا ہے - طوالت اور غرابت ہی کی وجہ سے یہ مثنوی قبولیت کے درجے کو نہ پہنچی اور اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی - اس مثنوی کے ہر بند کے آخر میں ٹیپ کے طور پر بھاشا کا ایک دوہا ہے جو قاسم ہی کی تصنیف ہے - اس سے قصے کی مختلف کڑیوں میں باہم دگر ربط قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے - مثنوی قاسم کی خوبی یہ ہے کہ جائسی کے زور طبیعت نے مضامین و مناظر میں تفصیل و جزئیات کے جو دفتر پیش کیے ہیں ان کی جھلک یہاں دیکھی جا سکتی ہے - ناگمتی کی وفا شعاری ، پدمنی کا بے مثال حسن و جمال، راجا کا جوگی بن کے مارا مارا پھرنا، سنہل دیپ کے رسم و رواج، جنگلات کا سکوت ، بسنت کی رنگینی ، سردی کی بے مہری ، پپیہے کی پکاریں ، ہاتھیوں کی قطاریں ، موروں کا رقص ، گھوڑوں کا پوجا ، ہندی عورت کا برہ رتن ساجن سے خیالی مکالمے وغیرہ ترجمے میں بھی لطف دے جاتے ہیں - قاسم نے پدمنی کے سراپا کا بھی عین ترجمہ کیا ہے - یہ پندرہ صفحوں کو محیط ہے - بارہ ماسہ کو بھی پوری طرح نظم کیا ہے اور یہ آٹھ صفحوں میں بیان ہوا - راجہ رتن سین کے فراق میں رانی ناگمتی کی حالت ملاحظہ ہو :

کنھکتی ہوں طرح کوئل کے رو رو
بنیں آنسو ہیں کھنکچی خون ہو ہو
ہوا کالا مرا منہ ، آنکھ ہیں لال
برہ کا گرم دکھ ٹھنڈا کرو حال
مری ہر بوند میں جانو کہ ہے جی
پکارے گوشہ گوشہ کر کے پی پی
اسی دکھ برگ ڈھاکہ کا جلے ہے
سحر خورشید پر خوں ہو چلے ہے
اسی لوہو سے کندرو لال ہووے
شجر سو کھیں گھوں شق بال ہووے
جہاں دیکھوں وہ سب ہو سرخ بیہات
رتن جس جا کہے جا کوں اب بات[1]

راجا کے بخیر و عافیت گھر واپس آنے پر رانی اپنے شوہر کی آرتی اتارتے ہوئے کہتی ہے:

یہ جوبن اور تن من ہو نچھاور
تصدق جان پیارے میری تم پر
تمھاری راہ میں آنکھیں بچھاؤں
قدم رکھو میں اپنا سر جھکاؤں
مرا دل آپ ہی کا یہ مکاں ہے
تمھاری راہ آنکھوں کے میاں ہے
بدن ہوں میں اور اس کی جان تم ہو
میں کارندہ ، میاں پر شاں تم ہو[2]

• • •

۱- مثنوی پدماوت ، قاسم علی بریلوی ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، ۱۸۷۳ع ، ص ۲۷۶ -
۲- مثنوی پدماوت ، مجد قاسم علی بریلوی ، مطبوعہ نولکشو لکھنؤ ، ص ۳۷۶ -